

مُرقّعِ غالب

پروفیسر حمید احمد خاں

۸-۰۰۰-۴۲۰-۹۶۹ ۳۰۰ روپے

"غالب، پاکستان، اقبال، اُردو زبان، ان چار چیزوں کی آمیزش سے جو خمیر اٹھا، اس سے پروفیسر حمید احمد خاں بنے... ایک وقت تھا کہ دلّی کے گلی کوچوں کی خاک چھان رہے تھے اور اُن بوڑھوں اور بوڑھیوں کا کھوج لگاتے پھرتے تھے جنھوں نے غالب کی آنکھیں دیکھیں تھیں۔ ان کی تحقیق کی دنیائے لوب نے بہت داد دی... وائس چانسلری کے زمانے میں خاں صاحب نے منصوبہ بنایا کہ یونیورسٹی کے زیراہتمام غالب کا جشن صدسالہ منایا جائے... بس وہ ایک مختصر سا زمانہ تھا جب پاکستان کی تاریخ میں پنجاب یونیورسٹی کو ایک علمی وقار حاصل ہوا اور اس تاریخ سے اس کا رشتہ پیدا ہوا جس کا پاکستان حاصل ہے..."

---- انتظار حسین

"... پاکستان میں... غالب صدی کے موقع پر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے مجلس یادگار غالب قائم کی اور غالب کی تمام تصانیفِ نظم و نثر کا ایک اچھا اڈیشن پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوا۔ 'دیوانِ غالب'، 'نسخۂ حمیدیہ' حمید احمد خاں نے، 'باغِ دودر'، 'بگلِ رعنا'، 'قصائد و مثنویاتِ فارسی' تینوں کتابیں سیّد وزیر الحسن عابدی نے، 'دیوانِ غالب' حامد علی خاں نے مرتّب کر کے شائع کیں..."

---- پروفیسر مختارالدین احمد

"... مطالعۂ غالب، حمید احمد خاں کا شوق خاص تھا... ان کے 'غالب کی شاعری میں حسن و عشق' کے مطالعہ سے مجھ پر مطالعۂ غالب کی بہت سی راہیں کھلیں... اور اب جب کہ 'غالبیات' خود ایک وسیع علم اور فن ہے اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور مقالے اس موضوع پر منظرِعام پر آ چکے ہیں جن میں بہت سے خاص الخاص ہیں، یہ حقیقت ہے کہ حمید احمد خاں کا مذکورہ بالا مضمون آج بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے..."

"حمید احمد خاں ایک خاص اسلوبِ بیان کے مالک تھے۔ ان کی تحریروں میں ضبط و نظم کے ساتھ ساتھ ایک ایسا حسن اور سلیقہ بھی نظر آتا ہے جو اردو فارسی کی ادبی روایتوں سے گہرے تعلق کا نتیجہ ہے..."

---- ڈاکٹر سید عبداللہ

مصنّف کی دوسری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف

نصابِ اُردو (مرتّب) ۱۹۴۵

کریسنٹ، تاثیر نمبر (مرتّب) ۱۹۵۱

Three Hundred Years of Prose (مرتّب) ۱۹۵۲

سفینۂ ادب (مرتّب) ۱۹۶۱

اسوۂ حسنہ ۱۹۶۷

دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ (مرتّب) ۱۹۶۹

ارمغانِ حالی (مرتّب) ۱۹۷۰

اقبال کی شخصیت و شاعری ۱۹۷۴

تعلیم و تہذیب ۱۹۷۵

Quaid-e-Azam Early Life Story ۱۹۷۶

رسالت مآبؐ کے عہد میں حقوقِ انسانی

Ghalib Man and Poet

The Sensuous and the Mystical in Wordsworth
(ایم۔ لٹ۔ کا مقالہ، ۱۹۵۴)

تنقیدی مضامین

ادب، ادیب اور معاشرہ

ہر ملک ملکِ ماست

فسانہ ہیں ہم لوگ

Miscellaneous English Writings

مکاتیب

والدۂ ماجدہ کے نام

فہرست

	فہرستِ تصاویر، زائچہ و نقشہ جات	viii
	پیش لفظ : احمد ندیم قاسمی	xi
	دیباچہ : سعید احمد خاں	xiii
۱	غالب کی شخصیت	۱
	غالب کی شخصیت (مختصر مقالہ)	۱۵
۲	غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک	۱۸
۳	اُمراؤ بیگم	۳۳
۴	خضر مرزا صاحب سے میری ملاقات	۴۵
۵	غالب کی شاعری کا پہلا دور	۶۴
۶	غالب اور بیدل	۸۷
۷	غالب کی شاعری میں حُسن و عشق	۱۳۸
۸	غالب کا کلکتہ	۱۸۶
۹	اسد اللہ خاں تمام ہُوا	۲۰۵
	ضمیمہ جات	
ا	غالب کا سوانحی خاکہ	۲۲۷
ب	سفرِ غالب (۱۹۳۸) میں مصنّف کے خطوط، والدہ کے نام	۲۳۰
ج	کتاب کے لیے یادداشتیں	۳۰۷
د	فہرستِ کتب (غالب پر مصنّف کا ذخیرۂ کتب)	۳۷۹
ہ	غالب پر مصنّف کی دوسری متفرق تحریروں کی فہرست	۳۸۳
	اشاریہ	۳۸۵
	مصنّف کے بارے میں	۴۱۱

فہرستِ تصاویر، زائچہ و نقشہ جات

(الف): تصاویر

۱	مرزا اسد اللہ خاں غالب	xvi
۲	آگرے میں اُس حویلی کا نشان جہاں غالب پیدا ہُوا (تصویر: ۱۹۳۸)	۲
۳	غالب کی تحریر کا عکس	۶
۴	مزارِ غالب (تصویر: ۱۹۴۶)	۱۳
۵	مرزا غالب	۱۴
۶	گلی قاسم جان کا نظارہ، مغرب کی طرف سے (۱۹۴۶)	۱۹
۷	مرزا غالب کے دیوان خانے کی ڈیوڑھی (۱۹۳۸)	۱۹
۸	مسجد حکیم محمد شریف خاں، بلی ماراں (۱۹۴۶)	۲۲
۹	مرزا غالب کے دیوان خانے کی ڈیوڑھی (۱۹۴۶)	۲۲
۱۰	مرزا غالب کے دیوان خانے کے دو کمرے (۱۹۴۶)	۲۲
۱۱	مرزا غالب کے زنان خانے کی موجودہ صورت (۱۹۴۶)	۲۲
۱۲	مرزا غالب کے زنان خانے کے اُس کونے کی موجودہ صورت (۱۹۴۶) جس میں کبھی بیری کا درخت تھا	۳۲
۱۳	نواب خضر مرزا صاحب (تصویر: ۱۹۳۸)	۶۰
۱۴	نواب خضر مرزا صاحب کی تحریر کا عکس	۶۳
۱۵	دریائے ہگلی، کلکتہ (تصویر کارڈ: ۱۹۳۸)	۱۸۹

۱۶	پورٹ کمشنر کا عرشہ، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۸۹
۱۷	جنرل پوسٹ آفس، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۹۱
۱۸	ڈلہاؤزی سکوئیر، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۹۱
۱۹	بنگال بنک، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۹۳
۲۰	سیکریٹریٹ آفس، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۹۳
۲۱	کلائیو سٹریٹ، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۹۷
۲۲	گرینڈ سٹینڈ، ریس کورس، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)	۱۹۷
۲۳	مرزا غالب	۲۰۴
۲۴	مرزا غالب کا مزار اور ملحقہ قبریں (تصویر : ۱۹۴۶)	۲۳۹
۲۵	بیگم سمرو (عجائب گھر، دہلی)	۲۴۲
۲۶	نواب شمس الدین خاں (عجائب گھر، دہلی)	۲۴۲
۲۷	ولیم فریزر (عجائب گھر، دہلی)	۲۴۲
۲۸	دربارِ اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۵ (عجائب گھر دہلی)	۳۱۲
۲۹	سواری اکبر شاہ ثانی، دہلی	۳۱۴
۳۰	دربارِ اکبر شاہ ثانی (عجائب گھر، دہلی)	۳۱۷
۳۱	ماہی مراتب (عجائب گھر، دہلی)	۳۱۷
۳۲	دہلی کی پرانی گاڑیوں کی تصویریں	۳۲۳
۳۳	دہلی (؟) کا ایک منظر	۳۲۷
۳۴	ایک اور منظر	۳۲۷
۳۵	جواں بخت مرزا (عجائب گھر، دہلی)	۳۴۹

۳۶	فخرو مرزا (عجائب گھر، دہلی)	۳۴۹
۳۷	(شہزادہ) مرزا سلیم اور کالے صاحب (عجائب گھر، دہلی)	۳۵۱
۳۸	۱۸۵۷(؟) کی ایک تصویر	۳۵۱
۳۹	۱۸۵۷ کی عظیم جنگ کی تصویریں	۳۵۷

(ب): زائچہ و نقشہ جات

۱	زائچہ - ۱: نواب معظّم زمانی بیگم عرف بِگّا بیگم کا شجرۂ نسب	۲۷
۲	زائچہ - ۲: عارف جان اور قاسم جان کی اولاد کا مِلا جُلا شجرۂ نسب	۴۸
۳	دہلی ۱۸۵۷ میں (Delhi in 1857)	بعد صفحہ ۳۴۲

پیش لفظ

غالب کے کلام اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے مگر بیسویں صدی کے نصف اول میں انھی موضوعات پر پروفیسر حمید احمد خاں کے محققانہ اور ناقدانہ مقالات کو جو اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ حیرت انگیز تھی۔ دراصل پروفیسر صاحب نے عام اور مقبول روش سے ہٹ کر مسائل کی گہرائیوں اور وسعتوں کو سمیٹنا شروع کیا تھا اور اس ضمن میں بے پناہ محنت و کاوش کا مظاہرہ کیا تھا۔ غالب کے فکر و فن کے تجزیے اور ان کے حالات حیات کے سلسلے میں ہر ممکن حد تک کھوج لگانے کی جو روش پروفیسر حمید احمد خاں نے اختیار کی تھی' وہ سراسر منفرد تھی۔ یہ درست ہے کہ ان مضامین کے بعد غالب کے کلام اور ان کی زندگی کے بارے میں تحقیق کا سلسلہ پوری شدو مد سے جاری رہا اور اس ضمن میں پنڈت کالی داس گپتا رضا کے انکشافات بطور خاص قابل ذکر ہیں جنھوں نے غالب کی غزلوں وغیرہ کے سنہ تصنیف واضح حوالوں کے ساتھ دریافت کئے اور اس حوالے سے غالب کی غزلوں کے مفاہیم سے متعلق بعض تنقیدی مقالات کو بے معنی بنا کر رکھ دیا' مگر پروفیسر حمید احمد خاں کے اسلوب تحقیق و تنقید پر اب تک کوئی حرف نہیں آیا اور ان کے یہ مضامین' جو "مرقع غالب" میں جمع ہیں' آج بھی غالب کی شاعری اور زندگی کا مستند ترین مرقع تسلیم کئے جاتے ہیں۔

مجلس ترقی ادب کو پروفیسر حمید احمد خاں کی نظامت کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے اور یہ مجلس کا فرض ہی نہیں حق بھی تھا کہ اس قیمتی ادبی سرمائے کو غالب شناسوں کی

خدمت میں پیش کرنے کی سعادت بھی اسی کو نصیب ہو۔ مجلس ترقی ادب لاہور کا ادارہ، "مرقع غالب" کو ایک احساس تفاخر کے ساتھ شائع کر رہا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ علمی، ادبی اور تعلیمی حلقوں میں اس کا فراخ دلانہ خیرمقدم کیا جائے گا۔

احمد ندیم قاسمی

(ناظم مجلس ترقی ادب)

مارچ ۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

غالب پر تنقیدی کام کا آغاز پروفیسر حمید احمد خاں نے ۱۹۳۰ کے عشرے میں کیا تھا۔ ان کا منصوبہ غالب پر ایک ایسی کتاب لکھنا تھا جس کے پہلے حصّے میں (ایک طویل مقدمے کی صورت میں یا ایک الگ پہلی جلد میں) مسلمانانِ ہند کے ہزار سالہ تمدّن کا تجزیہ شامل ہو۔ "غالب اس تمدّن کے زوال اور تباہی کے دور میں نمودار ہوُا۔ لیکن اس کی شخصیت اور شاعری میں اس پورے عہد کا نمونہ اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ منعکس ہے۔"

کتاب کے لیے مواد جمع ہوتا رہا۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی والدۂ ماجدہ نے (جن کو ادب و شعر سے بالعموم اور غالب و اقبال سے بالخصوص شغف تھا) اس کتاب کا نام "مرقعِ غالب" تجویز کیا۔ یہ کتاب انھی کے نام منسوب ہے۔ ۱۹۳۸ میں کتاب کے لیے کام اُس وقت عروج پر پہنچا جب پروفیسر حمید احمد خاں نے اس سلسلے میں دہلی، آگرہ، لکھنؤ، کلکتہ، بھوپال اور کئی دوسرے شہروں کا سفر کیا۔ لیکن افسوس کہ کام کی یہ رفتار برقرار نہ رہی، اور کتاب کی تکمیل نہ ہو سکی۔

۱۹۷۴ میں پروفیسر صاحب کی اچانک رحلت کے وقت وہ تین دوسری کتابوں پر کام کر رہے تھے۔ ان کے تعلیمی مضامین پر مبنی کتاب "تعلیم و تہذیب" اور "اقبال کی شخصیت اور شاعری" پریس میں تھیں اور غالب پر انگریزی میں ایک چھوٹی کتاب وہ "آر۔سی۔ ڈی۔ کلچرل انسٹی ٹیوٹ" کے لیے لکھ رہے تھے۔ (ان کا خیال تھا کہ یہ چھوٹی کتاب وہ جلد مکمل کر لیں گے اور ۱۹۷۳-۱۹۷۴ کے ان ایام میں انھوں نے اس

کے انتساب کا ذکر یوں کیا: "To My Mother whom I promised a better book")

پروفیسر حمید احمد خاں کے انتقال کے بعد "مُرقعِ غالب" کے سلسلے میں ان کے کاغذات دیکھے گئے اور ان کی اشاعت کے بارے میں غور کیا گیا۔

کتاب اب ۹ مضامین (جو سب ۱۹۳۷ سے ۱۹۵۰ کے عرصے میں لکھے گئے) اور ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب "غالب کی شخصیت" کے بعد اسی عنوان سے ایک مختصر مقالہ بھی شامل ہے۔ پانچواں باب "غالب کی شاعری کا پہلا دَور" دوسرے آٹھ مضامین کے برعکس پہلے شائع نہیں ہوا اور اس کا مسودہ کچھ نامکمل ہے۔ خیال ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں اس پر تفصیلی نظرثانی کا ارادہ رکھتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کتاب کا وہ حصہ نہیں لکھ سکے، جس میں ان کو ہند اسلامی تہذیب کا تجزیہ پیش کرنا تھا اور اس سلسلے میں اب صرف ان کی یادداشتیں ان کے کاغذات میں رہ گئی ہیں جس میں کاپیوں اور اوراق پر لکھے اشارات کے علاوہ، تصاویر، نقشے اور تراشے شامل ہیں۔ ان یادداشتوں کا ایک حصّہ، نیز ۲۰ خطوط (جو ۱۹۳۸ کے "سفرِ غالب" میں لکھے گئے) اب کتاب کے ضمیمہ جات میں شامل ہیں۔ ضمیمہ ۱ میں پروفیسر حمید احمد خاں کی Chronology of Ghalib کا ترجمہ شامل ہے۔ ضمیمہ جات میں ہی غالب پر پروفیسر حمید احمد خاں کی دوسری تحریروں کی ایک فہرست ہے۔ یہ تحریریں اس کتاب کا حصہ نہیں، اس لیے یہاں شائع نہیں کی گئیں۔ کتاب کی اشاعت کی موجودہ شکل مولانا حامد علی خاں صاحب کے مشورے کے مطابق ہے۔ انھوں نے مسودہ پڑھا اور خطوط کی ایڈیٹنگ کی۔

سعید احمد خاں

(فرزندِ پروفیسر حمید احمد خاں)

۱۲ فروری ۲۰۰۲

مُرقّعِ غالب



مرزا اسد اللہ خاں غالب

غالب کی شخصیت

اُنیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان کی سرزمین ایک عجیب سیاسی طلسم کا منظر پیش کرتی تھی۔ مغلوں کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ایک نیا ستارہ اُفق پر چمک رہا تھا لیکن ہندوستان میں رہنے والوں کو اس انقلاب کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔ لوگ، آنکھیں بند کیے، ایک ڈوبے ہوئے سورج کی روشنی میں چلتے پھرتے تھے۔ دین دھرم کا غلبہ اور شخصی حکومت کا زور اب باقی نہیں تھا لیکن پھر بھی نظر آتا تھا۔ سائنس کے تمدن اور جمہوریت کے دَور کا آغاز تھا مگر لوگ اسے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ دن قریب تھے جب وقت کا ساحر اپنے ہاتھ کی ایک ہی جنبش سے بادشاہی دور کے اِس طلسم کو توڑ کر رکھ دے۔ لیکن اس سے پہلے کہ سیمیا کی یہ نمود آسمان پر اپنی آخری جھلملاہٹ دکھائے، ایک شخصیت ایسی بھی ظاہر ہوئی جس میں عہدِ مغلیہ کی پوری زندگی اپنی خودداری اور عشرت پسندی، آزاد خیالی اور خوش اعتقادی، شاہ پرستی اور وضعداری، وسیع ہمدردی اور جمہور دشمنی کے ساتھ ایک بار پھر قوسِ قزح کے تمام رنگوں کی طرح جلوہ گر ہو گئی۔ تلاشِ حقیقت، ذوقِ جمال، شگفتہ طبعی اور ذہانت کے جن عناصر نے مغلیہ ہندوستان کو آب و رنگ دیا تھا، وہ سب مل کر اس ایک شخصیت میں منعکس ہوئے۔ یہ



آگرے میں اس حویلی کا نشان جہاں غالب پیدا ہوا (تصویر: ۱۹۳۸)

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شخصیت تھی جس کے پردے میں ایک ہزار برس کی پرانی تہذیب نے ایک بار پھر اپنا راگ چھیڑا۔

مغلیہ دَور کی اِس آخری بڑی شخصیت کو اُس کے شاعرانہ قد و قامت کے مطابق ڈھالنے میں مغلوں کے دونوں بڑے شہروں' آگرے اور دلّی نے برابر کا حصہ لیا۔ آگرے نے اُس کے احساسات کو اُبھارا' اپنی حسین عمارتوں اور دلآویز مناظر سے اُس کی نوخیز رُوح کو ذوقِ نگاہ بخشا۔ دلّی نے اُس کی عقل کی تربیت کی' اپنی منجھی ہوئی تہذیب اور سُلجھی ہوئی علمی مجالس سے اُس کے دماغ کو پختگی کی منزل تک پہنچایا۔

ڈیڑھ سو برس ہوئے غالب آگرے کی ایک رفیع الشان حویلی میں پیدا ہوا۔ یہ اُس کے نانا کا مکان تھا۔ مکان کیا تھا' اچھا خاصا محل تھا جس کا بہت بڑا دروازہ' کئی کشادہ دالان اور اُن کی خوبصورت محرابیں مکینوں کی امارت کا پتا دیتی تھیں۔ یہیں غالب نے' اپنی بہن اور بھائی کی صُحبت میں' بچپن کے دن گزارے۔ آگرے میں آج تک ایک روایت موجود ہے کہ غالب لڑکپن میں خودبیں اور مغرور تھا۔ ہمجولیوں کے ساتھ زیادہ بات کرنے میں اُس کی کسرِشان تھی۔ اپنے ہم عُمروں سے اس کا برتاؤ ایک بلند تر ہستی کا سا تھا۔ اُسے اپنے نام و نسب پر ناز تھا۔ اپنی بلندیٔ فکر کے سامنے دوسروں کی دماغی حیثیت اُسے پست معلوم ہوتی تھی۔ آٹھ نو برس کی عمر میں اُس نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا لیکن ایک مبتدی کی حیثیت سے نہیں' بلکہ اپنے طفلانہ زعم میں ایک صاحبِ طرز اور مجتہد کی حیثیت سے۔ ایک عجیب و غریب فارسی نما اردو' پُرپیچ اور دقیق مضامین' یہ اس کے نزدیک شاعری کا کمال تھا۔ لوگ زبان کی صفائی کو زیادہ پسند کرتے تھے لیکن عوام کی ہستی ہی کیا تھی کہ اُن کی رائے اسد اللہ بیگ خاں جیسے جوہرِ قابل کو متاثر کرتی۔ کیا وہ خود پورے دس سال کا ہوش مند اور بالغ انسان نہ تھا ؟ اور پھر

رسم و رواج کے خلاف بغاوت تو اُس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کبھی کبھی لوگوں کے اعتراض سن کر اسے غصہ آ جاتا اور اس کی سپید و سرخ پیشانی پر بل پڑ جاتے: "میرے کلام کو نہیں سمجھ سکتے ؟ نہ سمجھیں' جاہل کہیں کے! میں کب ان کی داد کا محتاج بیٹھا ہوں۔"

ہاں' وُہ اپنی نظروں میں بہت معتزز تھا اور اب اس کی شادی اس کی عزت میں کچھ اَور اضافہ کرنے والی تھی۔ چچا کے انتقال کے بعد چچا کے بردارِ نسبتی' نواب احمد بخش' باقاعدہ طور پر اسد اللہ بیگ خاں اور اس کے متعلقین کے ولی مقرر ہو گئے تھے اور اِن کی دس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر کا انتظام نواب کے ہاتھ میں تھا۔ اسی تعلق کے سلسلے میں' غالباً" نواب احمد بخش کی تحریک پر' نواب کی بھتیجی سے رشتہ ہو گیا اور ۱۸۱۰ میں اسد اللہ خاں اور اُمراؤ بیگم' اُنسٹھ سال کی طویل مدت کے لیے' تاآنکہ موت انھیں الگ کر دے' ایک دوسرے سے وابستہ کر دیے گئے۔

تیرہ برس کا دُولھا اور گیارہ برس کی دُلھن' مگر دونوں کو اپنی اپنی جگہ اپنی اہمیت اور عظمت کا پورا احساس! ازدواجی زندگی کو شروع ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دونوں کی تیز طبیعتیں ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے ٹکرائیں۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ اسد اللہ خاں کو اپنی مطلق العنانی کے انداز میں تبدیلی کرنی ضروری معلوم ہوئی۔ کچھ پرانی شرافت کا پاس' کچھ نواب احمد بخش خاں کا لحاظ' کچھ اپنی بتدریج بیدار ہوتی ہوئی سلامتیٔ طبع کا تقاضا' سب نے مل کر اُسے ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ آخرِکار عمر بھر کی اس چپقلش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شوہر نے ظریفانہ احتجاج اور بیوی نے شکایت آمیز صبر کی راہ نکالی۔

شادی سے چھ سات برس بعد غالب نے آگرے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہی اور دلّی

کی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس سے پہلے بھی سُسرال کے تعلّق کی وجہ سے خاصے لمبے وقفوں کے لیے دلّی میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اِسی قیام کے سلسلے میں غالب کے جنونِ برتری کے بہت سے بل نکل چکے تھے۔ یہاں اُسے چار و ناچار اُن ہم چشموں سے سابقہ پڑتا تھا جو کیا بہ لحاظِ مرتبہ و حیثیّت اور کیا بہ لحاظِ عقل و دانش کسی طرح بھی اُس سے فروتر نہیں تھے۔ اب غالب کو اِس بات پر غور کرنا پڑا کہ جو لوگ اُس کے مُغلق کلام پر اعتراض کرتے ہیں، اُن سب کا تعلّق محض جہلا کے گروہ سے نہیں ہے۔

جہاں عقل و دماغ کی صلاحیتیں اِس عظیم الشان انقلاب سے دوچار ہو رہی تھیں وہاں انھی دنوں جذبات کی دنیا میں بھی ایک ایسا زبردست بھونچال آیا جس کی لرزشیں سال ہا سال گزر جانے کے بعد بھی غالب کے دل کو محسوس ہوتی رہیں۔ یہ دن حسن و موسیقی کی بہار لوٹنے کے تھے اور غالب جیسے لبریزِ حیات نوجوان کو کسی دوسرے اشارے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اُس کا دراز قد، تنومند پیکر، چنپئی رنگ، اور تاتاری خدوخال عیش و نشاط کو ایک دعوتِ مجتمم تھے۔ اُس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ کاروبارِ شوق کے اِس سلسلے میں دل و جگر کے زخم بھی خریدنے پڑیں گے۔ اِن دنوں کیا کیا ارمان تھے جو غالب نے نہ نکالے ہوں مگر قدرۃً اِن سب کی تفصیلات پر گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ البتہ ایک حسین چہرہ ایسا ہے جو اِن گہرے پردوں کے نیچے نہیں دب سکا اور نقاب اُلٹ کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ عورت کون تھی، کہاں سے آئی اور اُس کی دردناک موت کی تفصیلات کیا ہیں، اِس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا بہت دشوار ہے۔ غالب کو مستقل طور پر دلّی آئے شاید دو تین برس گزرے تھے جب اِس عورت سے اُس کا سامنا ہوا۔ آپس کی ملاقاتوں کے لیے کچھ ایسی آسانیاں میسّر نہ تھیں، شاید کسی تیسرے شخص کے ذریعے سے باہم پیغام بھیجے جاتے تھے، شاید کسی مکان کے کوٹھے

غالب کی تحریر کا عکس

پر سے کبھی کبھی تھوڑی بہت بات چیت ہو جاتی تھی۔ لیکن اِس رسمی آغاز کے باوجود اِن تعلقات کا خاتمہ کسی رسمی کیفیت پر نہ ہوا کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بہت جلد ان تعلقات نے ایک روحانی رفاقت کا رنگ اختیار کر لیا اور دائمی وفاداری کے عہد و پیمان باندھے گئے۔ گرمی کے چند مہینے دو بے قرار دلوں کے عالمِ جذب و شوق میں بجلی کی طرح کوند کر نکل گئے لیکن برسات ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ موت نے کسی نامعلوم اور خوف ناک حادثے کی شکل میں دونوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ موت کس طرح آئی لیکن اسی محبت کی راہ میں عورت کی فطرت نے اپنا سب کچھ یہاں تک کہ اپنی جان بھی قربان کر دی۔ اِس حادثے کا یہی وہ پہلو تھا جس نے غالب کے دل پر سب سے زیادہ چوٹ لگائی۔ بعد کی غزلوں میں کہیں کہیں اسی صدمے کے زیرِ اثر برسوں کی آہوں اور آنسوؤں کا سراغ ملتا ہے۔ بڑھاپے کے خطوں میں پھر اِس واقعے کا ذکر ہے لیکن اُس شانِ بے نیازی کے ساتھ جس سے اپنے غموں کو دُہرانا اب غالب کا پرانا معمول ہو چکا تھا۔ عنفوانِ شباب کے اِس تجربے نے غالب کی شخصیت پر بہت دُور رس اثر کیا۔ اس کی طبعی سرکشی محبت اور نیازمندی کے اُس مفہوم سے آشنا ہوئی جس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ابھی مدتیں درکار تھیں۔

اس حادثے کو دو ہی چار برس گزرے تھے کہ غالب کی مالی پریشانیوں' اور اُن کے سلسلے میں اُس کی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت کا آغاز ہُوا۔ اُس کا کمالِ فن اب اپنے انتہائی عروج کے قریب تھا لیکن اُس کے آلام و مصائب بھی اپنے انتہائی عروج کے اتنے ہی قریب تھے۔ پہلے آگرے کا چشمۂ عیش خشک ہُوا' پھر نواب احمد بخش نے آنکھیں پھیر لیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ غالب کا ماہوار وظیفہ کہیں پُراسرار طور پر معلق ہو کر رہ گیا۔ آدھی عمر بے کاری اور عشرت پسندی میں گنوا کر اب روزی کمانے کی کوئی

سبیل نکالنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ شب و روز ناز و تنعّم کی فضا میں رہنے والے اس خوش باش انسان کے لیے بے بسی اور کس مپرسی کے یہ دن عذابِ جہنّم کے دن تھے۔ کبھی کبھی طبیعت کا پرانا غرور درویشانہ بے نیازی کی تصویریں دکھا کر ڈھارس بندھاتا لیکن یہ آنی جانی تصویریں تھیں۔ رئیسانہ وضع داری کی کشش اُس کے لیے کہیں زیادہ شدید تھی۔ اور جب بیوی بچوں کی طرف دھیان جاتا تو اُس کے سینے میں غم و غصّہ کا ایک طوفان اُمنڈ پڑتا۔ نواب احمد بخش خاں کے پیچھے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی مگر خود غالب کے الفاظ میں "نواب صاحب مرا بہ لطفِ زبانی فریفتند۔" لڑکپن کے زمانے کا وہ غیظ و غضب جو پختگیٔ عُمر کے سانچے میں ڈھل گیا تھا' ایک بار پھر آتش فشاں کی طرح اُبل پڑا۔ اگر نواب صاحب انصاف سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں تو بخُدا میں کمپنی بہادُر سے انصاف کرا کے رہوں گا خواہ اس مطلب کے لیے مجھے کمپنی بہادُر کے صدر مقام تک پہنچنا پڑے۔

کمپنی بہادُر کا صدر مقام کلکتہ تھا' دلّی سے ایک ہزار میل دُور' کئی مہینوں کی مسافت پر۔ ۱۸۲۶ میں کمرِ ہمّت کس کر' بہت سی امیدوں کو دل میں لیے ہوئے' غالب کلکتے کے لمبے سفر پر روانہ ہُوا۔ نواب احمد بخش اپنی جگہ مطمئن تھے کیونکہ وُہ اِس سے بیس برس پہلے سرکاری کاغذات میں ضروری ردّ و بدل کرا چکے تھے۔ نتیجہ وہی ہُوا جو ہونا تھا۔ حکّام نے مدد کے وعدے کیے لیکن انجام کار ناکامی ہوئی۔ پُورے اٹھارہ سال تک غالب عدالتوں اور حاکموں کے سامنے اپیلوں درخواستوں قصیدوں کے ذریعے سے یہ مقدمہ لڑتا رہا۔ ناکامیوں پر ناکامیاں ہوئیں لیکن اُس کے دل میں امید کی چنگاری برابر سلگتی رہی۔ آخر ۱۸۴۴ میں ملکہ وکٹوریا نے اُس کے آخری میموریل کو رد کر کے اُس کی زندگی کا یہ مصیبت ناک باب قطعی طور پر ختم کر دیا۔

اِس مقدمے کے خاتمے پر دنیوی لحاظ سے غالب کی بے مائگی پہلے سے بھی کچھ زیادہ تھی لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے نے اُس کی روحانی ثروت میں قابلِ ذکر اضافہ کیا تھا۔ اب عمر ڈھل چکی تھی۔ بہت سے عزیز کنجِ لحد میں اُتر چکے تھے۔ بھائی دیوانہ ہو کر خانہ نشین ہو گیا تھا۔ سب بچے ایک ایک کر کے مر چکے تھے مگر اُس کے تجربۂ حیات کی تلخیوں نے اُس کے دل میں اپنی ذات کے متعلق ایک نیا اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ وہی ذہنی کیفیت جو کسی زمانے میں اُسے خودبیں اور متکبر بنائے ہوئے تھی' اب ایک اخلاقی قوت بن کر نمایاں ہوئی۔ اب اُسے رنج و الم برداشت کرنے کی عادت ہو چکی تھی اور اسی عادت نے اُس کی سب مشکلیں آسان کر دیں۔ آسائش و آرام اُسے اب بھی عزیز تھا' دنیوی عزت سے وہ اب بھی بے نیاز نہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دُنیا اُس کے لیے اب ایک بازیچۂ عبرت تھی' ایک درس گاہ۔ وُہ ایک بے تعلق تماشائی کی حیثیت سے دُور کھڑا ہُوا اِن سب نظاروں کو دیکھتا تھا۔ اُس کے فلسفیانہ اندازِ فکر کے ماتحت اُس کی اپنی ہستی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ وُہ خود ہی تماشائی تھا اور خود ہی تماشا۔ اب اُس کے لیے گویا ایک دوسرا غالب مصیبتوں میں گرفتار تھا اور خود وہ' اِس دوسرے غالب کو دیکھ کر' کبھی تو ایک دیوتا کے سکون سے مسکرانے لگتا اور کبھی ایک انسان کی دل سوزی سے آنسو بہا دیتا تھا۔ مدتیں ہوئیں' برسات کے موسم میں جمنا کے پُل پر کھڑے ہوئے' وُہ دریا کے جوش و خروش کا نظارہ دیکھا کرتا تھا۔ اُس وقت پُل کا سایہ طوفانی موجوں پر رقص کرتا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ اب قسمت کے دریا کی بے قرار موجیں اُمنڈ اُمنڈ کر چلی آتی تھیں لیکن وہ خود جمنا کے مضبوط پُل کی طرح اپنی جگہ پر قائم تھا۔ صرف اُس کا سایہ اِن جھپٹتی ہوئی موجوں کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔

اِس بیس برس کے عرصے میں اور اس کے بعد بھی' غالب کی پریشاں روزگاریوں کا

لامتناہی سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہندوستان بھر میں مختلف درباروں کا التفات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ کئی رئیسوں اور حاکموں کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا لیکن جس حاکم نے مدد کا وعدہ کیا معزول ہوگیا' جس رئیس نے نگاہِ کرم کی' مرگِ ناگاہ سے مرگیا' جس دربار نے ذرا التفات کیا' زمانے نے اُس کی خاک اُڑا دی۔ اس بارے میں غالب کی سیاہ بختی انگریز اور ہندوستانی میں کوئی تفریق کیے بغیر سب پر یکساں اپنا سایہ ڈالتی چلی آتی تھی۔ ایسے حالات میں یہ محال تھا کہ مغلوں کے آخری شاعر کی سیرحاصل شخصیت ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی لامحدود قوتوں کے ذخیرے میں سے کوئی نیا معجزہ پیدا نہ کرتی۔ اِس زمانے میں اُس کی ظرافت کا احساس بتدریج زیادہ وسیع اور زیادہ لطیف ہوتا گیا۔ پہلے پہل اُس نے یہ حربہ زیادہ تر خانگی اور مجلسی چپقلشوں پر غالب آنے کے لیے استعمال کیا تھا لیکن اب یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ زندگی کے عظیم الشان میدان پر تلخ حقیقتوں اور دروانگیز صدمات کے جواب میں اُس کی ظرافت تلوار کی طرح چمکتی اور کاٹ کرتی تھی۔ اُس نے سپہگری کے آبائی پیشے کو چھوڑ کر اپنی خاندانی رسم کو توڑا تھا لیکن تقدیر نے عمر بھر اُس سے ایک سپاہی کا سا سلوک کیا۔ اُس کی تلوار اُس کی ظرافت' اُس کی ڈھال اُس کی خودداری تھی۔

لیکن غالب کو ابھی شخصی ارتقا کی ایک اَور کڑی منزل سے گزرنا تھا۔ ۱۸۴۷ میں اُسے قمار بازی کے الزام میں چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ یہ رُسوائی کی حد تھی' پچاس برس کی وضع داریوں کا یہ انجام! خود غالب ہی نہیں' بادشاہ سے لے کر عوام تک' دلّی کا ہر کہہ و مہ اس فیصلے پر مبہوت تھا۔ لیکن ایک انسان کی حیثیت سے غالب کی صحیح عظمت کا اندازہ بھی آزمائش کی اسی ساعت میں ہُوا۔ اُسے رنج ضرور تھا' لیکن دل میں کوئی تلخی نہ تھی' کوئی شکایت نہ تھی' اب سب کچھ ٹھیک تھا۔ اُس کی

طبیعت کا پورا گداز اور ملاطفت ایک چشمۂ صافی کی طرح اُبل پڑا۔ اِس حادثے پر جو ترکیب بند اُس نے لکھا ہے' اس میں وُہ ایک سزایافتہ مجرم کی حیثیت سے جیل کو نہیں جاتا بلکہ یوں جیسے دکھ درد کے مندر کا پُجاری بھجن گاتا ہُوا دیوی کے حضور میں جا رہا ہو۔

باایں ہمہ اُس کی زندگی محض مصائب و آلام کا نشانہ بن کر نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے شاعرانہ کمال کا شہرہ اب ہندوستان کے ہر گوشے تک پہنچ چکا تھا۔ لوگ دُور دُور سے اُس کے دیکھنے کو' اُس سے ملنے کو آتے تھے۔ صاحبِ علم و فضل دوستوں کے ساتھ اُس کے تعلقات انتہائی محبت کو پہنچے ہوئے تھے۔ اِنھیں میں سے بعض کی تحریک پر ۱۸۵۰ میں بہادر شاہ کے دربار میں اُسے باقاعدہ باریابی ہوئی۔ یہ چند سال نسبتہً بے فکری سے گزرے لیکن اُس کی تقدیر اپنی پرانی روش کے مطابق برابر وقت کی تاک میں گھڑیاں گن رہی تھی۔ آخر ۱۸۵۷ کا ہنگامہ یک بہ یک ایک قیامت بن کر نمودار ہُوا۔ امن خوشحالی اور تہذیب کی دھجیاں فضا میں اُڑنے لگیں۔ اِس طوفان میں جو بیش قیمت چیزیں بالکل برباد ہو گئیں اُن میں سے ایک غالب کا بڑھاپے کا اطمینان تھا۔ اُس کے بعض دوست جلاوطن ہوئے' بعض گولی کا نشانہ بنے' بعض نے پھانسی پائی۔ دلّی اب ایک بھیانک ویرانہ تھی جس میں بوڑھا' مریض' ناتواں غالب اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے یہ سال اُس کی موت کا سال ہے۔

لیکن غالب جیسی' زندگی سے بھرپور شخصیت کو موت ذرا آتے آتے آتی ہے۔ ابھی غالب کو اُردو نثر کی دنیا میں اپنے قلم کا اعجاز دکھانا تھا۔ دوستوں اور شاگردوں میں سے جو لوگ ابھی تک زندہ تھے اُن سے خط و کتابت کرنا اِس وقت اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ "اُردوئے معلّٰی" اور "عُودِ ہندی" کے بیشتر خطوط اِسی سات آٹھ برس کے عرصے

میں لکھے گئے۔ صبح ناشتے کے بعد بالعموم دوستوں کو خط' دوپہر کو قصوں کی کوئی کتاب یا کبھی چوسر یا شطرنج' کبھی عبداللہ خاں داستاں گو آ جاتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک داستانِ امیر حمزہ سناتے۔ اِسی میں غالب کی آنکھ لگ جاتی؛ پھر سہ پہر کو ملاقاتیں اور مغرب کے وقت شراب' بس تمام زندگی اِسی ایک دائرے میں محدود تھی۔

کبھی بچّوں سے چھیڑ چھاڑ' کبھی گھر میں تھوڑی سی دل لگی' یہی اب بڑی سے بڑی تفریحیں تھیں۔ لیکن غالب کی باطنی زندگی دنیا کے ہنسی مذاق کو اب بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ ۱۸۶۸ کے قریب ضعفِ قوا کی یہ حالت ہوئی کہ دوستوں کو خط لکھنا بھی چھوٹ گیا۔ اب دنیا کے تمام ہنگامے بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ خود اپنی زندگی کی تمام کشمکش' شہرت اور نام و نمود کی خواہش ایک بہت پُرانے خواب کی طرح دُھندلی اور بے رنگ نظر آتی تھی۔ دراصل اب زندگی کی کوئی رمق اس کے بدن میں باقی نہ تھی۔ اُس کی رُوح اپنی آخری پرواز سے پہلے ایک گہرے سنّاٹے کے عالم میں تھی۔ اب دُنیا کے ساتھ اُس کا تعلق قائم رہنے کے لیے کوئی جواز نہ تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا اور وہ ایک بھٹکی ہوئی کرن کی طرح پیچھے رہ گیا تھا۔ آخر فروری ۱۸۶۹ کی ایک صبح کو موت کی وہ گھڑی چپ چاپ آ پہنچی جس کا اُسے برسوں سے انتظار تھا۔

(تحریر: ۱۹۴۷)



مزارِ غالب (تصویر : ۱۹۴۶)



مرزا غالب

غالب کی شخصیت (مختصر مقالہ)

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ غالب کی شخصیت کے ذکر پر کون سی کیفیت سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ میرے سامنے آتی ہے تو میں جواب دوں گا: "شگفتگی"۔ اِس علم کے باوجود کہ غالب کے قارئین کا ایک بڑا طبقہ غالب کو غم و الم کا ترجمان سمجھتا ہے، میرا ذاتی تأثر یہ ہے کہ غالب کی شخصیت کے بیان میں شگفتگیٔ طبع کا ذکر پہلے ہونا چاہیے اور کسی دوسری کیفیت کا بعد میں۔ غم کا بیان غالب کی شاعری میں بڑی کثرت سے ملتا ہے لیکن یہ دراصل ایسے واقعات کا بیان ہے جو غالب کی زندگی میں چارو ناچار رونما ہوئے۔

غالب کی اپنی فطرت کا تقاضا غم پسندی نہیں ہے۔ اِس سلسلے میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ غالب کے ابتدائی کلام میں افسردہ دلی شاذ و نادر ملتی ہے۔ لیکن جب مصیبتوں نے واقعی آن گھیرا تو پھر وہ کیفیت ہو گئی جسے مرزا غالب نے خود ان لفظوں میں بیان کیا ہے: "پہ بچیں کہاں کہ دل ہے؟" یہاں غالب کے حساس ہونے سے بحث نہیں ہے کیونکہ محض حسّاس ہونے سے انسان غم پسند قرار نہیں پا جاتا۔ غالب اُن لوگوں میں ضرور تھے جو تکلیفوں کو ذرا شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن اِس سے غالب کی اُفتادِ طبع میں کوئی تغیّر نہیں ہُوا بلکہ غم کے مضامین کو انھوں نے اِس شگفتہ

انداز میں بیان کیا کہ خود غم کی کایا پلٹی ہوئی نظر آنے لگی۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شادی و غم کی کیفیتوں کو غالب نے جس طرح باہم ملایا ہے اس کی مثال ہماری شاعری کی پوری تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ اِس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ہمارے شعرا میں سے کسی کی شخصیت میں وہ رنگارنگی اور متضاد عناصر کا وہ لطیف توازن نہ تھا جو غالب میں ملتا ہے۔ اِسی سبب سے بارہا یہ صورت پیش آتی ہے کہ غالب غم کا بیان کرتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت میں ایک انشراح پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک فارسی شعر میں اپنی پوری زندگی کی مصیبت زدگی، بے کسی و بے چارگی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن ساتھ ہی ایک ایسی بات بھی کہہ دی ہے کہ پڑھنے والے کو فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جو زندگی سے اس طرح دست و گریباں ہے، غم کی لہروں میں ڈوب نہیں سکتا۔ شعر یہ ہے:

شبم تاریک و منزل دُور و نقشِ جادہ نا پیدا
ہلاکم جلوۂ برقِ شرابِ گاہ گاہی را!

شگفتگیٔ طبع کے بعد میری رائے میں غالب کی دوسری بڑی خصوصیت اُس کی عقلیت ہے۔ یہ خصوصیت بھی شگفتگیٔ طبع کی طرح اکتسابی نہیں، فطری ہے۔ غالب کے بچپن کے شعروں پر نظر ڈالیے تو اُن میں بھی اس مخصوص باریک بینی اور "دلی" کے بجائے "دماغی" نکتہ سنجی کا عکس نظر آتا ہے جو اردو شاعری کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ غالب کا اندازِ طبیعت شروع ہی سے تحلیل و تجزیہ کی طرف مائل تھا۔ ابتدائی اشعار کو دیکھیے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ جو پیچ در پیچ لفظی صنعتیں غالب استعمال کر رہا ہے اُن میں دماغی کاوش کے ایک نئے اسلوب کا سراغ ملتا ہے۔ جس بات میں کوئی باریک نکتہ پیدا نہیں ہوتا اُس سے غالب کی تشفی نہیں ہوتی۔ اسی نکتہ آفرینی کی عادت نے غالب کی غزل کو ایک ایسی انفرادیت بخشی کہ غزل گوؤں کے ہجوم میں بھی غالب

کے قد و قامت کو پہچان لینا آسان معلوم ہوتا ہے۔ غالب کی یہی عقلیت بعد میں فلسفہ طرازی اور حکمت آرائی کی صورت میں ظاہر ہوئی لیکن اس کی بنیاد وہی نکتہ سنجی اور باریک بینی تھی جس کا سراغ اُس کے بچپن تک پہنچتا ہے۔

بعض دفعہ یہ شبہ ہوتا ہے کہ غالب کی شخصیت بنیادی طور پر ایک "دماغی" شخصیت ہے لیکن حواس کی لذّتوں سے غالب کو جو شغف ہے اُس کا خیال کیجیے تو غالب کو محض عقل کا شاعر قرار دینا کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مادی دنیا کا وجود غالب کے لیے ایک حقیقی وجود ہے:

عالم آینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری؟ بنگاہے دریاب!

"طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا" کے معاملے میں غالب کی ذکاوتِ حس اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ رنگ اور بو اور لمس اور آواز کی لذّتیں اُسے جابجا مست کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حواس کی لذّتوں سے یہی وابستگی تھی جس نے غالب کو عمر بھر بظاہر ہوسِ جاہ و منصب سے وابستہ رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ حواس کی لذّتیں غالب کے لیے اتنی ہی اہم تھیں جتنی عقلی لذّتیں۔

کبھی کبھی غالب اور بیدل کی شخصیتوں کا باہم مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بعض مماثلتوں کے باوجود اِن دونوں شخصیتوں کے درمیان ایک اہم فرق یہ ہے کہ بیدل کے لیے لذّاتِ حواس کوئی کشش نہیں رکھتیں۔ بیدل معقولات کی دنیا کا "درویشِ خدامست" ہے مگر غالب صرف نشاطِ معنی کی دنیا پر قناعت نہیں کرتا۔ اسے عالمِ رنگ و بو کی سبھی کیفیتیں مست کر دیتی ہیں، چنانچہ بالکل بجا طور پر اپنے لیے کہتا ہے ع

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

چاندنی چوک سے مُڑ کر بَلّی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جایئے تو شمسی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنورتے کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کو کُوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے، اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کیے بغیر نہیں رہتے، وہ اِن نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ اِن بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اِس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اِسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اِس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے قریب تین شریف زادے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے، قسمت آزمائی کے لیے بخارا سے روانہ ہوئے۔ منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے، مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی



گلی قاسم جان کا نظارہ، مغرب کی طرف سے (۱۹۴۶)



مرزا غالب کے دیوان خانے کی ڈیوڑھی (۱۹۳۸)

راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اِسی گلی میں آباد ہوئے جس کے نکڑ پر ہم آپ کھڑے اِس وقت باتیں کر رہے ہیں۔ شہرت اور دولت اِن تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے حصّے میں ضرور آئی۔ پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اِس کا شاہد ہے کہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے۔ لیکن اُنیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اِس مرتبہ عارف جان کا بیٹا' لوہارُو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اِس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کھڑے ہونے اور اِس عام رہ گزر پر عقیدت کی آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اِس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ ایک اور کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دُور دُور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہے گی۔ اِس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیاں کر دیتا ہے' اور وہ لفظ ہے: غالب۔

گلی قاسم جان کے چپّے چپّے کے ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے' کسی نہ کسی منزل میں' تعلق رہا ہے۔ غالب کا اصل وطن آگرہ تھا۔ لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے دلّی میں آرہے تھے۔ اس تبدیلیٔ وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلّی میں رہے۔ اِس تمام مدّت کا بیشتر حصّہ انھوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لیے باہر نکلنا بھی پڑا تو اِسی محور کے گرد چکّر کھاتے رہے۔ لیکن غالب کی ذات سے قطع نظر' اِس تعلق کا سلسلہ خود غالب کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اِسی گلی میں' شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے' غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہُوا تھا۔ دس پندرہ برس بعد جب

غالب خود بالک دُولھا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی اُمراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے۔ اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اِسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میّت کو کندھا دیتے ہوئے، جامع مسجد اور دلّی دروازے کی راہ سے، درگاہِ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے۔ اُس دن اِسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹّہ اوڑھے اپنی اُس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی پہلی برسی کے دن موت کے ہاتھوں ختم ہونا تھا۔

سامنے کے سرے پر، جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے، ایک بڑی محراب نظر آرہی ہے۔ اگر اِس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارُو کی حویلی ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی۔ اگر اِس روایت کو درست مان لیا جائے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ غالب اٹھارہ بیس برس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لیے دلّی چلے آئے، تو پہلے پہل چند سال تک اِسی مکان میں رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے جو گلی کے اُس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دواخانے کے درمیان کھڑے ہیں۔ دلّی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے۔ گلی کے پرلے سرے سے چل کر اِس سرے تک آئیے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کرلیں۔ دلّی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی سے شروع ہوئی اور اِس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لیے ہم آپ گلی کے اِس سرے پر کھڑے ہیں۔



مسجد حکیم محمد شریف خاں، بلی ماراں (۱۹۴۶)



مرزا غالب کے دیوان خانے کی ڈیوڑھی (۱۹۴۶)
دور پس منظر میں مصنف بھی



مرزا غالب کے دیوان خانے کے دو کمرے (۱۹۴۶)



مرزا غالب کے زنان خانے کی موجودہ صورت (۱۹۴۶)

گلی میں چند قدم چلیے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے۔ اندر جاکر دیکھیے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اَور مختصر ہو گیا ہے۔ صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو غالباً" پشتِ مسجد کا سہارا لیے ہوئے ہیں ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی' یہ صحن اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرودگاہ کی یادگاریں ہیں۔ وہ بالاخانہ جو' خود ان کے بقول' ان کے "بیٹھنے اُٹھنے' سونے جاگنے' جینے مرنے کا محل" تھا اب باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا۔ گلی کے دوسری طرف' غالب کے دیوان خانے کے تقریباً" سامنے ہندوستانی دواخانے سے متّصل غالب کا زنان خانہ تھا۔ یہاں اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانۂ دواسازی ہے لیکن اس کا حُلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقّت محسوس ہو۔

غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا' ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالاخانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے۔ خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلّو' بند کرکے ٹکٹ لگادیتے تھے۔ دوپہر کو قصّے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے۔ کبھی عارف جان یا قاسم جان والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہُوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بُلالیتے۔ تھوڑی دیر اِسی سے ہنسی مذاق کی باتیں کرکے کچھ اپنا مگر زیادہ اُس کا دل خوش کرتے۔ گرمیوں میں دوپہر کو بالعموم سوجاتے تھے۔ سہ پہر کو اٹھتے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر

اُس ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ اِسی ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ غالب بالاخانے سے نیچے اترتے۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے مُنڈھا ہوُا تھا' ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے۔ چپلیں آگے پڑی رہتیں۔ ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حُقہ ہوتا۔ غالب اِس عمر میں اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لیے کان اُس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابندِ وضع بزرگ پالکی میں تشریف لاتے۔ پالکی دروازے کے سامنے رکی' وہ بزرگ نیچے اترے، غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں (لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے) کہا "آیئے' آیئے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟"

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا میں زندگی کا کیا نقشہ تھا جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقۂ حیات کے دن گزرتے تھے؟ غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے۔ یہاں وقت کس طرح گزرتا' کیا باتیں ہوتیں' کیا قصّے طے ہوتے' اِن تفصیلات پر بظاہر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے پہلے اِسی گلی قاسم جان کے اندر' لوہارُو والوں کی اِس حویلی میں جس کا ذکر ابھی آچکا ہے' ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی کے آخری دَور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی' غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بِگّا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی

کی معرفت بِگّا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بِگّا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کیے جن کا جواب بِگّا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ اُن کی عمر اُس وقت نوّے برس کے لگ بھگ تھی، مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں۔ گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساسِ ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے۔ میں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شُستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے اُن سے سنا، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بِگّا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بناء پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لیے قابلِ قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہوکر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پڑپوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اُردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال[1] ہوگیا تو غالب ان کے دونوں بیٹوں، باقر علی خاں اور

۱۔ ۱۸۵۲ میں۔

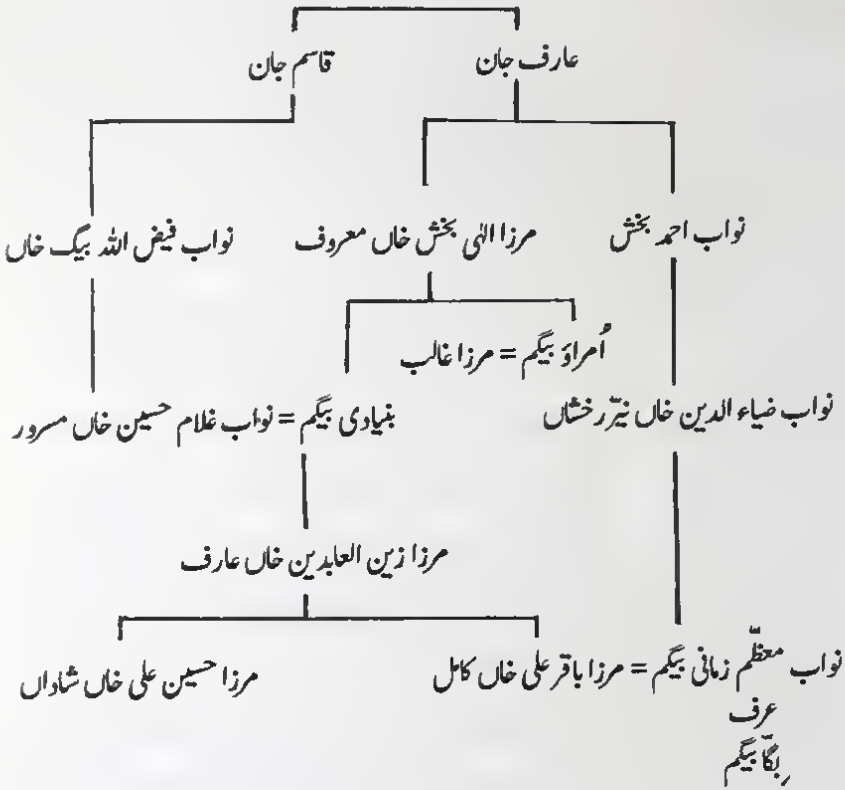
حسین علی خاں' کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اُسی لاڈ پیار سے رکھا جس سے اپنی اولاد کو رکھتے[1]۔ بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اِس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی' وہ یہی بِگّا بیگم صاحبہ تھیں۔ ان تمام

۱۔ غالب کے اردو خطوں میں اس کی طرف جابجا اشارے ملتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں: "لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو' چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک مَیں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں' یہ ہم روزہ خور ہیں' وہی حسین علی خاں جس کا روزمرّہ ہے: 'کھلونا منگادو۔ میں بھی بجار جاؤں گا'"۔

بِگّا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: "میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت نازبرداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا 'ارے حسین علی آکر پڑھ لے' انھوں نے جواب دیا 'دادا جان' آتا ہوں' اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انھیں چسکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ 'دادا جان بیس روپے دلوا دیجئے'۔ مرزا صاحب نے کلّو کو بلا کر کہا 'بھئی' انھوں نے ایک پتھر اور مارا' دے دے بیس روپے'"۔

خضر مرزا مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا: "ایک دن میں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جارہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی 'ابے لڈو! یہاں آؤ'۔ ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لیے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا 'ابے یہ کیا! منہ سے کھا' میرے مرغی کے بچے یوں ہی چُگا کرتے ہیں!'"

رشتوں کی کیفیت ذیل کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہوجائے گی :



زائچہ - ۱

نواب معظّم زمانی بیگم عرف بگّا بیگم کا شجرۂ نسب

اس میں شک نہیں کہ بِگّا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لیے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں جہاں انھوں نے قیافے سے بات کی ہے' اُن کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں' اُن کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں: "سج سج چلتے تھے' بڈھے تھے' اسّی برس کی عمر تھی۔" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً" درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بِگّا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اِتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد تھے' اُسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیز گار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اِس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی[1]۔ چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کردیا ہے!" مگر یہ جھگڑا محض رِندی و زُہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اُس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلافِ مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بِگّا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ اُمراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہوجاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تُو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر' بڈھا تو دیوانہ ہوگیا ہے!"

۱۔ اِس ضمن میں "یادگار غالب" کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

اِسی قسم کا ایک واقعہ بِگّا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ "(مرزا صاحب) پچھلے پہر ہَواخوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد وہ واپس آئے۔ مَیں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں' مرزا صاحب بھی اُسی تخت پر نکڑ پر ہو بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے 'واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کرلیا۔ کھاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے اپنا سا کرکے نکال دیتی ہے!'

ایک اَور لطیفہ بِگّا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ "برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی' گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: 'ایک بیوی' دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! بہو' مَیں اور میری بیوی بیٹھے ہیں' تم کیوں بیٹھی ہو؟' اس پر میری ساس بولیں: 'اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔' مَیں اِتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کے دن ہیں اور کیڑے پتنگے کا موسم۔ مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: 'مجھے کیا خبر تھی بہو اِس بات کو اِتنا برا مانے گی۔'

مَیں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔" نوکروں میں کَلّو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا: "کَلّو داروغہ کو مَرے ہوئے پندرہ برس ہوگئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آکر رہے۔ کلّو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں' بہویں ہیں یا بوڑھیاں۔ ایک اَور نوکر مدار خاں تھا۔ اِن دونوں کا بیاہ انھوں نے

خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سنا ہے۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلّو نے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔"

"کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے' دال مرتبہ' پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن[1]۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔" پکانے والا کون تھا؟ 'دَدا' تھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال' بیسن کڑھی پھلکیاں بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے۔ کہنے لگے: 'دَوا' یہاں تو آ'۔ دَدا گئیں تو ان سے کہا: 'پیسے نہیں تھے تیرے پاس؟ بہو کی پسند کی چیز پکا لی ہوتی۔' دوا نے جواب دیا: 'نہیں' بہو چنے نہیں کھاتی ہیں۔' بولے: 'اوہو' خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!' پھر میری ساس سے کہنے لگے: 'بیوی سنو' وہ بولیں: 'میں نہیں سنتی!' اِس پر مجھ سے کہا: 'بیٹی برا نہ مانیو۔ ایک بات سناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے' مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھُونتے ہیں' تلتے ہیں' اُبالتے ہیں' پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا: 'دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا!'"

۱۔ بیگم صاحبہ نے قدرۃً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو۔

یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں: "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے۔ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں معظّم میاں (نواب معظّم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے، وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے۔" جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا؟ جہاں بیٹھے اُسی مذہب میں ہوگئے۔" میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا: "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہُوا تو بہرے ہی تھے۔" غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا: "سرس کی گلی میں مارے گئے تھے[1]، مسجد تہوّر خاں میں دفن ہوئے۔" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا؟ تو جواب دیا: "دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے۔ اُس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ وغیرہ سب وہیں تھے۔"

اِس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا؟ بِگا بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں، بس مر ہی گئے۔ ہُوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ جندو بیگم[2] کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا: 'جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ۔' احمد بیگ ان کے خادم تھے۔ انھیں بھیجا۔ مرزا صاحب کہنے لگے: 'اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں

۱۔ فتحِ دہلی کے بعد، ۱۸۵۷ء۔

۲۔ بِگا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عُرف ہے جو اُس وقت اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھیں۔ مرزا صاحب انھیں محبت سے "جیون بیگ" کہتے تھے۔ ان کی شادی نواب شجاع الدین خاں سے ہوئی۔

گا'۔ یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہوگئے۔ اِسی حالت میں ان کا دم نکلا۔"

اُمراؤ بیگم کے متعلق بِگا بیگم نے مجھ سے کہا: "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھور کی پھانک تھیں۔ جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں: 'اے اللہ! تُو کب بلائے گا؟' ایک روز میں نے پوچھا۔ 'پھوپھی جان! آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟' کہنے لگیں: 'بیٹی تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔'"

یہ ہے اُن معلومات کا بڑا حصّہ جو مجھے بِگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔

(تحریر: ۱۹۴۷)



مرزا غالب کے زنان خانے کے اس کونے کی
موجودہ صورت جس میں کبھی بیری کا درخت تھا

اُمراؤ بیگم

بڑے آدمیوں کے سوانح نگار جب بہ اندازِ تعظیم ان کی داستانِ حیات لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی بیویوں سے بارہا بے انصافی کرجاتے ہیں۔ اس بے انصافی کے اسباب بالکل قدرتی ہیں۔ کتابوں میں جس تکرار و توضیح سے بڑے آدمیوں کے اقوال بیان ہوتے ہیں' وہ ان کی بیویوں کے نقطۂ نظر کو نصیب نہیں ہوتی۔ سقراط' سعدی اور شیکسپیئر اپنی بیویوں سے کچھ ایسے خوش نہ تھے۔ بلا شبہہ ان مشاہیر کی سوانح عمریوں میں اس معاملے کا ذکر ضروری ہے۔ لیکن اِسی کے برابر اہمیت اِس دوسرے سوال کو بھی ملنی چاہئے کہ خود ان کی بیویوں کی رائے اپنے نامور شوہروں کے متعلق کیا تھی۔ پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بڑے آدمی کی عظمت کے حق میں تاریخ کئی مرتبہ ذرا دیر سے فیصلہ کرتی ہے۔ سوانح نگار قدرۃً" تاریخ کے اس فیصلے سے متأثّر ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ بڑے آدمی کے متعلّقین کو اس فیصلے سے متأثّر ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس کے علاوہ ہم سب اِس بنیادی حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بڑے آدمی کی بیوی سب سے پہلے ایک آدمی کی بیوی ہوتی ہے۔ اگر اس کے خانگی حقوق و فرائض کا سلسلہ اس کی ذاتی زندگی کو مطمئن نہیں کرتا تو اس کے شوہر کی بڑائی کے متعلق سوانحی یا ادبی

تنقید کا لگایا ہُوا حکم اس کے لیے رائگاں اور مُہمل ہے۔ کسی عورت (یا مرد) کی زندگی کو ایک ایسے معیار سے پرکھنا جو عملی زندگی کا کوئی معیار ہی نہیں ہے' ایک قسم کی داستان گوئی تو کہلا سکتا ہے لیکن اسے واقعہ نگاری کا نام دینا ذرا زیادتی ہے۔

مرزا غالب کی بیگم صاحبہ کو مرزا صاحب کیسے نظر آتے تھے' اِس کے لیے میاں بیوی کے اندازِ طبیعت اور شخصی حالات کا تصوّر کسی حد تک ہماری رہنمائی کرسکتا ہے' لیکن اِس مسئلے کو غالب کی شاعری پر مولانا حالی یا ڈاکٹر بجنوری کی رائے سے خلط ملط کردینا تو کسی حالت میں درست نہیں ہوسکتا۔ بیگم مرزا غالب ایک علٰحدہ اور مستقل شخصیت کی مالک تھیں جسے دیوانِ غالب کے ضمیمے کے طور پر پیش کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہمیں ان کی شخصیت کو سمجھنا ہے تو سب سے پہلے ان کی زندگی کو خود اُن کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ آیئے آج اس کہانی کے آغاز و انجام پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں۔

یہ کہانی ۱۷۹۹ سے شروع ہوتی ہے جب دہلی کے ایک شریف اور بااقبال گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اُمراؤ بیگم رکھا گیا۔ اُمراؤ بیگم کے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسّر تھا۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ "شہزادۂ گلفام" کے عُرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ جب اُمراؤ بیگم گیارہ برس کی ہوئی تو اُس زمانے کے دستور کے مطابق اس کا بیاہ ہوگیا۔ اس کا دُولھا مرزا اسداللہ بیگ خاں جو عمر میں اس سے صرف دو برس بڑا تھا آگرے کا ایک امیرزادہ تھا' سفید فام' خوش شکل' خوش گفتار۔ خیال یہ تھا کہ اسداللہ بیگ جوان ہو کر باپ دادا کی طرح سپہگری کی زندگی اختیار کرے گا اور اُمراؤ بیگم کو میکے کا امیرانہ ٹھاٹھ سسرال میں

بھی حاصل رہے گا لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ اسداللہ بیگ خاں نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی اور تمام عمر بیکاری میں' یا بیکار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد اُمراؤ بیگم نے پھر کبھی بے فکری کے دن نہ دیکھے بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا تو اولاد کی خوشی ہی نصیب ہوتی۔ لیکن بچپن کے اچھے دنوں کے بعد تقدیر نے اُمراؤ بیگم سے نیک سلوک کرنے کی گویا قسم کھالی تھی۔ سات بچے پیدا ہوئے مگر کسی کی عمر برس سوا برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کر کے ماں کے دل کو دائمی جدائی کا داغ دے گئے۔ شوہر جیسا بھی تھا نباہ تو کیے جا رہا تھا لیکن یہاں بھی آخر عمر میں قسمت نے بیوفائی کی۔ شوہر کے ہاتھوں پیوندِ خاک ہونا اُمراؤ بیگم کو نصیب نہ ہؤا۔ بڑھاپے میں اسے بیوگی کا صدمہ دیکھنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی شوہر کی مالی پریشانیاں خود اسے ورثے میں مل گئیں۔ اُمراؤ بیگم کا شوہر انتقال کے وقت آٹھ سو روپے کا مقروض تھا۔ اب بوڑھی بیوہ حیران تھی کہ یہ قرضہ کس طرح اور کہاں سے ادا کرے۔ سرکاروں' درباروں میں استمداد کے لیے عرضیاں بھجوائی گئیں۔ ان عرضیوں کا مضمون' پڑھنے والوں کو آج بھی دردناک معلوم ہوتا ہے لیکن سرکاروں' درباروں میں کوئی اثر نہ ہؤا۔ آخر ۱۸۷۰ میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی نازپروردہ بیٹی پریشاں روزگار' بے اولاد' بے شوہر' دنیا سے رخصت ہوئی۔

نسوانی زندگی کی اِس مختصر سی کہانی میں کوئی ایسی عجیب بات نظر نہیں آتی جس کی خاطر لوگ اسے سننے کے لیے بے تاب ہوں۔ عورت کی گمنامی اور بے کسی اور بے حاصلی کا یہ نقشہ گزشتہ صدی کی طرح آج بھی مسلمان شرفا کے گھروں میں موجود ہے' لیکن پھر بھی اُمراؤ بیگم کی داستان میں ایک خاص بات ہے۔ اس کا شوہر

اسد اللہ خاں غالب آج اُردو کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اور اُمراؤ بیگم اور مرزا غالب کے باہمی تعلقات ادبی سوانح کا ایک دلچسپ مسئلہ بن چکے ہیں۔

خود غالب کی تحریروں میں ان ازدواجی تعلقات کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ اس ذکر کا کتنا حصّہ مزاحاً" اور کتنا حصّہ سنجیدگی سے قلمبند ہؤا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں : "چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی گھُٹّی میں پڑی تھی' ان کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کرسکتا ہے۔" لیکن اِس سلسلے میں عام خیال وہی ہے جس کا اظہار غالب کے ایک فاضل سوانح نگار نے ذیل کے الفاظ میں کیا ہے : "واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیگم صاحبہ سے بڑی محبت تھی۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کی راحت و آسایش پر اپنی جان قربان کرتی تھیں۔" صرف ایک نقّاد نے روحانی رفاقت کے اِس تصوّر سے بدیں الفاظ قطعی اختلاف کیا ہے : "مرزا کی کئی تحریروں سے . . . یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو دامِ سخت ہی سمجھتے رہے اور اُڑنے سے پہلے گرفتار ہو جانا انھیں بہت ناگوار تھا۔"

حقیقتِ حال کیا تھی؟ اس کی دریافت کے لیے غالب یا بیگم غالب کا کوئی غیر مشتبہ بیان ہمارے سامنے ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو تو معتبر گواہوں کی چشم دید کیفیت پر بھی انحصار کیا جاسکتا ہے۔

غالب کے خطوط میں وہ تلخ بیانات جن میں مزاح کا شائبہ پایا جاتا ہے ہمارے لیے اِس لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہیں کہ ان پر کسی قطعی فیصلے کی بنیاد رکھنا دشوار ہے۔ یہی حال ظرافت آمیز اشعار کا ہے۔ اس قسم کے اشعار پر ہلکے سے مزاح کا شبہہ کرنا شاید ممکن ہو :

زیں گونہ کہ تُند می خرامی دانم
در خانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

لیکن قطعۂ ذیل ظرافت کے شُبہے سے پاک ہے:

بہ آدم زن بہ شیطاں طوقِ لعنت
سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
و لیکن در اسیری طوقِ آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اس میں ع "درطلبِ نان و جامہ کشمکش از زن" کی طرف صریح اشارہ ہے۔ اس قسم کے اشارات اتّفاقی نہیں بلکہ ارادی معلوم ہوتے ہیں۔ اُردو کلام کے ابتدائی حصّے میں بھی کہیں کہیں کنایۃً ایسا مضمون پیدا ہوتا ہے کہ نوجوان شاعر اپنی شادی سے خوش معلوم نہیں ہوتا۔ ذیل کا شعر "نسخۂ حمیدیہ" کی ایک غزل میں ملتا ہے:

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

اِس شعر کا مطلب کچھ بھی لیا جائے' لفظ "خانہ آبادی" کا استعمال معنی خیز ضرور ہے۔ اِس غزل کے مقطع میں دلّی اور دلّی کے نوابوں پر پھبتی بھی اِسی لحاظ سے معنی خیز ہے:

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

اِس قسم کے طنزیہ اشارے غالب کی شاعری میں اس کی خانگی زندگی کے صرف ایک پہلو کی جھلک دکھاتے ہیں۔ ایک دوسرا پہلو وہ ہے جس کا دلآویز ترین اظہار کلّیاتِ

فارسی کی تیسری مثنوی کے آخری اشعار میں ہوا ہے۔ شاعر وطن سے دور اپنے اہل و عیال کی تکلیفوں کے احساس سے مضطرب ہے' لیکن جب اسے یہ خیال آتا ہے کہ ان لوگوں کی بے کسی کا آسرا وہ خود ہے تو اس کا دل شفقت اور ہمدردی سے بھر جاتا ہے اور اسے اپنی کوتاہیوں پر شرم آنے لگتی ہے :

بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر — دریں جنّت ازاں ویرانہ یاد آر
دریغا در وطن واماندۂ چند — بہ خون دیدہ زورق راندۂ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ — بہ امید تو چشم از خویش بستہ
بہ شہر از بے کسی صحرا نشیناں — بہ روئے آتش دل جا گزیناں
ہمہ در خاک و خوں اغلندۂ تو — بہ حکم بے کسیہا بندۂ تو
چو شمع از داغِ دل آذر فشاناں — بہ بزمِ عرض دعویٰ بے زباناں
سر و سرمایہ غارت کردۂ تو — ز تو نالاں ولے در پردۂ تو

"ز تُو نالاں و لے در پردۂ تُو"! غالب اور بیگم غالب کے تعلقات کا خلاصہ اس سے بہتر کہیں اور بیان نہیں ہُوا۔ جس خلوص و درد سے مندرجہ بالا اشعار لبریز ہیں اس کے ہوتے ہوئے یہ شک کرنا ظلم ہے کہ شاعر نے "ز تو نالاں" کے الفاظ محض بہتان طرازی کے لیے لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیگم غالب نے غالب کی مالی اور عملی کوتاہیوں پر ہمیشہ اس زور سے احتجاج کیا کہ غالب کو حرم سرا کی اِس جنگ میں شکست کھا کر دیوان خانے کی طرف مستقل طور پر پس پا ہونا پڑا۔ اِس دعوے کی بنیاد غالب کے بیانات ہی پر نہیں بلکہ ایسی معتبر روایات پر ہے جو "درونِ خانہ" پہنچتی ہیں۔ نواب سرور الملک نے جو غالب کی حقیقی بہن کے پوتے تھے اور جن کی شادی بعد میں بیگم غالب کے حقیقی بھائی کی پوتی سے ہوئی' ان دونوں کے باہمی تعلقات کا ذکر اس

طرح کیا ہے:

"دادا مرزا نوشہ کا نکاح دخترِ نواب الٰہی بخش خاں سے ہؤا۔ بچپن میں جب مَیں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا تو دادی مجھ کو ایک دونّی دیا کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی میں ہمیشہ اَن بَن رہی۔ بیسیاں اِس خاندان کی نہایت مہذّب وشائستہ مگر کمال درجہ مغرور ومتکبّر تھیں...."

اِسی مضمون کی اِتنی ہی معتبر شہادت نواب معظّم زمانی بیگم دختر نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں کی ہے جو چند ہی سال پہلے بقیدِ حیات تھیں۔ راقم الحروف کو ان کی خدمت میں حاضر ہوکر غالب اور بیگم غالب کی زندگی کے آخری زمانے کے متعلق چشم دید حالات سننے کا موقع ملا تھا۔ ان کے الفاظ بھی یہی تھے کہ "میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔" بقول ان کے، مرزا صاحب غصّے میں آتے تو ان کی زبان سے اِس قسم کے کلمات نکلتے تھے:

"میرا تو ناک میں دم کردیا!" "حضرتِ موسیٰ کی بہن!" دوسری طرف بیگم غالب "خفا ہوتی تھیں، مگر خاموش ہوجاتی تھیں۔" اپنی بھتیجی (معظّم زمانی بیگم) سے کہتی تھیں: "تُو تو بچہ ہے۔ بڈّھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر۔ بڈّھا تو دیوانہ ہوگیا ہے۔"

۸ اگست ۱۸۱۰ کو اُمراؤ بیگم کی شادی غالب سے ہوئی۔ نوعمری کی شادی اور پچھلی صدی کے ہندوستان میں، مرضی اور پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ دُولھا دُلھن دونوں خود پسند اور تیز طبیعت، قدرتاً" دونوں نے ایک دوسرے پر غالب آنے کے لیے کشمکش کی اور دونوں میں سے کسی نے آخردم تک ہار نہ مانی۔ جہاں طبیعتوں کے اِس ایکے نے مستقل پھوٹ کی بنیاد ڈالی، وہیں اختلافِ مزاج کے بعض پہلوؤں نے دونوں

کی روحانی جلجگی کو زیادہ مضبوط اور پائدار کردیا۔ مرزا الٰہی بخش خاں نے جب دنیا سے منہ موڑ کر تصوّف اور ریاضت کی زندگی اختیار کی تو اُمراؤ بیگم کی فطری پارسائی کو تائید مزید حاصل ہوئی۔ ادھر غالب کی رندی اور وارستگی کو زندگی کے اِس تصوّر سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ آغازِ شباب سے لے کر بڑھاپے کے آخری دَور تک کسی منزل پر بھی ان کی طبیعت اِدھر نہ آئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پرہیزگار بیوی نے رندمشرب شوہر کے کھانے پینے کے برتن الگ کر دیے۔ ایک اَور وجہِ اختلاف دونوں میں سے ایک کی سنجیدگی اور دوسرے کی ظرافت تھی۔ غالب کی ٹھٹھّے کی عادت اکثر موقعوں پر اُمراؤ بیگم کو ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی تھی۔ وہ کھوکھلا ہنسوڑ پن جس کے پیچھے بے اقبالی اور فاقہ مستی کا بھیانک چہرہ ہو' اُس بی بی کے لیے کوئی معنی نہ رکھ سکتا تھا جسے اپنی وسیع برادری سے عزّت و آبرو کا تعلق برقرار رکھنے کے لیے خدا جانے کس کس طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔

شادی کے چند سال بعد جب میاں بیوی جوانی کی عمر کو پہنچے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اِس سلسلے میں خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہے۔ اب اُمراؤ بیگم کو وہ بڑے سے بڑا صدمہ پہنچا جو شوہر کی طرف سے بیوی کو پہنچ سکتا ہے۔ غالب نے ایک دوسری عورت سے بے قرارانہ عشق کیا۔ بیگم غالب کو جب یہ حال معلوم ہُوا تو ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ غالباً" ان کا فطری غرور و تمکنت اس وقت آڑے آیا۔ طبیعت کا مذہبی رنگ جو باپ سے ورثے میں ملا تھا' شاید کچھ اَور گہرا ہوگیا۔ شاید دونوں کی روح کے درمیان ایک اَور پردہ حائل ہوگیا۔ ہمارے سامنے اِس معاملے میں معلومات نہیں' صرف قیاسات ہیں۔

غرض طرح طرح کے اختلافات کی بنیاد پر آئے دن آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے

تھے۔ اگر شوہر کچھ کماؤ ہوتا تو طبیعتوں کا یہ اختلاف کسی حد تک دب جاتا۔ لیکن شوہر کی کمائی کا یہ حال تھا کہ شادی کے بارہ چودہ برس بعد گھر میں جو اثاثہ تھا وہ بھی فروخت ہونے لگا۔ عورت کا شوہر اس کی قسمت ہوتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ شادی کے بعد اُمراؤ بیگم کی قسمت پھوٹ گئی۔ غالب کی شاعری کو امراؤ بیگم نے کبھی کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ غالب کو ہنسی' دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کا جو چسکا تھا وہ اُمراؤ بیگم کے لیے عذابِ جاں ہوگیا۔ بڑھاپے تک غالب کی یہ عادت نہ گئی اور اُمراؤ بیگم کی چڑ بھی بڑھاپے تک قائم رہی۔ نواب معظم زمانی بیگم نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ مرزا غالب نے ان سے مذاق کیا تو اُمراؤ بیگم خفا ہوکر بولیں: "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔"

بارہا انھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں جھپٹ ہوجاتی تھی۔ خانگی زندگی کے یہ لطیفے اکثر تذکرہ نویسوں نے بیان کیے ہیں' مگر ان لطیفوں کے ناگوار نتائج کا ذکر قدرتی طور پر نہیں کیا۔ مولانا حالی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ غالب نے مکان بدلنا چاہا۔ نئے مکان کا دیوان خانہ تو خود پسند کر آئے اور محل سرا دیکھنے کے لیے اُمراؤ بیگم گئیں۔ واپس آئیں تو غالب نے پوچھا: "کہو مکان پسند آیا؟" بیگم نے جواب دیا: "اس گھر میں تو لوگ بَلا بتاتے ہیں۔" غالب نے فوراً کہا "مگر کیا دنیا میں تم سے بھی بڑھ کر کوئی بَلا ہے؟" اس کے بعد جو کچھ گزری وہ لطیفے سے تو خارج ہے مگر غالب کی سوانح عمری سے خارج نہیں ہے۔

اِن سب باتوں کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میاں بیوی کے یہ جھگڑے کبھی کسی دائمی فساد یا بدمزگی کی بھی نوبت لائے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُمراؤ بیگم کی بہن بنیادی بیگم کے تعلقات اپنے شوہر سے اِس حد تک بگڑ گئے تھے کہ شوہر نے

انھیں ہمیشہ کے لئے الگ کردیا۔ اِس کے برعکس مرزا غالب اور اُمراؤ بیگم دونوں پرانے شرفا کی وضعداری کا نمونہ تھے اور طبیعتوں کے شدید اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی آخر عمر تک ایک دوسرے سے نباہ کرتے چلے گئے۔ غالب نے زن جملہ دوسرے اسباب کے بیوی کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر دہلی کا قیام اختیار کیا اور تمام عمر یہیں گزار دی۔ اپنے خاندان سے کہیں زیادہ ان کے تعلقات بیوی کے خاندان سے تھے اور (عملی نتائج سے قطع نظر) ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ بیوی کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن صورت پیدا کریں۔

مولانا حالی کی روایت ہے کہ "مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے۔" دوسرے ثقہ راویوں کی زبانی بھی یہی معلوم ہُوا کہ غالب اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ اس علٰحدگی کے باوجود اُمراؤ بیگم نے شریف بیبیوں کی قدیم روایات کو جس طرح قائم رکھا وہ قابلِ داد ہے۔ انھوں نے شوہر کی خدمت کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا۔ کھانا زنانے میں پکتا اور وقت پر غالب کو دیوان خانے میں پہنچ جاتا۔ جب بیمار ہوتے تو دوائیں جوشاندے وغیرہ پورے اہتمام سے تیار کرکے انھیں پہنچائے جاتے۔

غالب بھی دن میں ایک مرتبہ ضرور زنانہ مکان میں جاتے تھے۔ جب تک بدن میں طاقت رہی صبح کا کھانا وہیں کھاتے۔ بڑھاپے میں اس کی پابندی نہ رہ سکی۔ پھر بھی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے عام طور پر صبح یا دوپہر کو اور کبھی کبھی عصر کے قریب ضرور گھر میں جاتے۔ بنّادی بیگم کے پوتے نواب خضر مرزا مرحوم (جنھوں نے لڑکپن میں غالب اور اُمراؤ بیگم کو دیکھا تھا) راقم الحروف سے اُس زمانے کی ایک حکایت اِن الفاظ میں بیان کرتے تھے: "مَیں ایک دن مرزا صاحب کے دیوان خانے میں کھڑا تھا کہ وہ اوپر سے

اترے۔ میرے کھوّے پر ہاتھ رکھ کر کہا 'آ تیری دادی کے گھر چلتا ہوں' (دادی سے مراد اُمراؤ بیگم تھیں۔) اندر جاکر بستی ماما سے دادی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں۔ معلوم ہُوا کہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ کہنے لگے 'ہیں یہ کیا! جب آؤ نماز! ارے خضر تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنادیا!'"

اُمراؤ بیگم کی زندگی کے درمیانی بیس پچیس سال جس تنہائی بلکہ ویرانی کے عالم میں بسر ہوئے' اُس کی طرف مولانا حالی نے یوں اشارہ کیا ہے: "مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی... اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے"۔ ۱۸۵۲ میں زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہُوا تو آیندہ دس بارہ برس ان کے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے میں بسر ہوگئے۔ اس کے بعد پھر وہی تنہائی کا عالم شروع ہوا۔ نواب معظّم زمانی بیگم کا بیان ہے کہ بڑھاپے کے دنوں میں جا نماز پر بیٹھے ان کے منہ سے اکثر یہ الفاظ نکلتے تھے: "اے اللہ! تُو کب بلائے گا؟"

اب موت کی دعائیں قبول ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ پہلے' فروری ۱۸۶۹ میں مرزا غالب رخصت ہوئے۔ نواب خضر مرزا مرحوم نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ "مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہُوا۔ دادی اُس وقت زنان خانے میں تھیں۔ اِس عرصے میں داروغہ کلّو کو انھوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے کئی دفعہ بلایا۔ میں ایک دو دفعہ گیا' گریہ ان پر طاری تھا۔ سفید دوپٹّہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔"

ساٹھ برس کی رفاقت جو لڑکپن سے شروع ہوئی تھی اس کا یوں انجام ہُوا' مگر جب تک زندگی ہے' زندگی کے دھندے بھی جاری ہیں۔ بیوگی کے ساتھ تنگ دستی کی تکلیفوں نے نئی شدّت اختیار کی۔ رام پور کی تنخواہ اور انگریزی پنشن' جو غالب کو ملتی

تھیں، دونوں ایک دم بند ہو گئیں۔ اُمراؤ بیگم کی طرف سے کمشنر دہلی اور نواب صاحب رام پور کو امداد کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں۔ کمشنر نے جواب دیا کہ غالب کی بیوہ کے لیے دس روپے کی پنشن منظور ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ خود کچہری میں حاضر ہو۔ اُمراؤ بیگم نے اِس شرط کو قبول کرنا گوارا نہ کیا اور کہا کہ میں کچہری ہرگز نہ جاؤں گی، گو فاقوں سے مرجاؤں۔

رام پور والی درخواستوں سے بھی کوئی نتیجہ جلد نکلتا نظر نہ آیا۔ اِسی پریشانی کے عالم میں مرحوم شوہر کی پہلی برسی کا دن آپہنچا۔ اِسی دن امراؤ بیگم دُنیوی عدالتوں کی حاجت روائی سے بے نیاز ہو گئیں۔ ان کی ایک اور بڑی درخواست خدا کی بارگاہ سے اِسی دن کے لیے منظور ہو چکی تھی۔ میاں بیوی کو زندگی کے معاملات میں ہمیشہ ایک دوسرے سے اختلاف رہا، لیکن اب موت نے یوں مساعدت کی کہ غالب کی وفات کے ایک سال بعد قمری مہینے کی ٹھیک اُسی تاریخ کو اُمراؤ بیگم شوہر کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

(تحریر: ۱۹۴۲)

خضر مرزا صاحب سے میری ملاقات

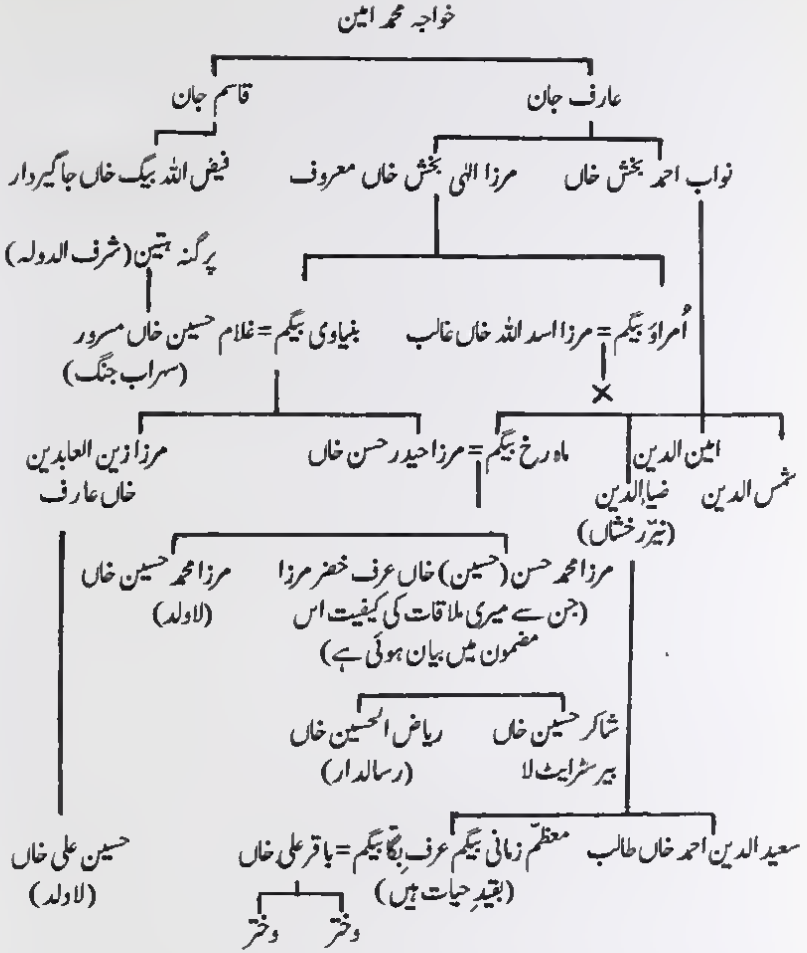
اِس مضمون کا آغاز لازماً میرے دوست شیخ محمد امین صاحب (لائبریرین اسلامیہ کالج) کے ذکر سے ہونا چاہیے۔ مغلیہ تمدّن کے آخری دور کے مطالعے میں شیخ صاحب میرے پرانے رفیق اور مددگار ہیں۔ شاید دو برس کا عرصہ ہوا انھوں نے مجھ سے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں کہا: ”دلّی میں ایک بڑے سن رسیدہ نواب صاحب ہیں، کوئی نوّے برس کی عمر ہو گی۔ میں دلّی جاتا ہوں تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا ہوں۔ ایک دن گفتگو میں ان سے سنا تھا کہ وہ غالب کے خاندان سے ہیں۔ آپ ان سے جاکر ضرور ملیں، عجب نہیں غالب کے متعلق کوئی نئی بات ہاتھ آئے۔“ شیخ صاحب کو یہ یاد نہیں تھا کہ غالب کے خاندان سے نواب صاحب کا کیا رشتہ ہے، اِدھر مجھے بھی اپنی قسمت سے اِتنا حسنِ ظن نہ تھا کہ غالب کے متعلقین میں سے کسی ایسے شخص تک اپنی رسائی ممکن سمجھتا جس نے غالب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اس لیے مجھے اعتراف ہے کہ شیخ صاحب کی اس روایت کو میں نے شبے کے اُسی موہوم احساس کے ساتھ سنا، جس سے ہم اس اخباری عہد کی ہر دلچسپ خبر کو سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔ تاہم جولائی ۱۹۳۸ میں جب میں دہلی پہنچا تو سب سے پہلے میں نے اس تعارفی رقعے سے کام

لیا جسے شیخ محمد امین صاحب نے میرے لیے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس رقعے نے پہلے مجھے شیخ سردار علی صاحب (سینٹ سٹیونز سکول) اور پھر محمد اکرم صاحب دہلوی سے متعارف کیا۔ ان دونوں صاحبوں کے خلق و مہربانی سے مجھے دہلی میں کئی لحاظ سے بڑی مدد ملی۔ میں لاہور سے سُن آیا تھا اور انھوں نے بھی مجھے یہی بتایا کہ خضر مرزا صاحب زیادہ تر دہلی سے باہر مہرولی میں مقیم رہتے ہیں' اس لیے ان سے ملنے کو ہمیں کسی دن وہیں چلنا ہو گا۔ خضر مرزا' نواب صاحب کا نام ہے اور دہلی پہنچتے ہی میں نے بھی اپنے آپ کو ان کے مقربین میں شمار کر کے ان کا ذکر اسی نام سے کرنا شروع کر دیا۔

وسط جولائی کی ایک دوپہر کو میں شیخ سردار علی صاحب اور اکرم صاحب کے ساتھ مہرولی کو روانہ ہوا۔ ایسے وقت میں روانہ ہونے سے ہماری غرض یہ تھی کہ جب تک خضر مرزا صاحب قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز کے لیے اٹھیں' ہم مہرولی پہنچ جائیں۔ مہرولی' دہلی کے مضافات میں قطب سے متصل ایک قصبہ ہے۔ آبادی کسی صورت دو چار ہزار سے زیادہ نہیں ہو گی۔ بادشاہی عہد میں یہاں برسات کے دنوں میں بڑی رونق رہتی تھی۔ خود بادشاہ لال قلعے کو چھوڑ کر دو مہینے کے لیے مہرولی چلے آتے تھے اور ان کے ساتھ دہلی کے شرفا اور عوام کی ایک خاصی تعداد برسات کا لطف اٹھانے کے لیے یہیں منتقل ہو جاتی۔ اب بھی برسات کے زمانے میں لوگ آتے ہیں لیکن اکثر پرانے مکانات کا اجڑا اجڑا نقشہ اور شمسی تالاب کی ویرانی کا عالم ماضی و حال کا فرق صاف بتا رہا ہے۔ دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر قطب اور مہرولی جانے والی لاریوں اور تانگوں کا اڈا ہے۔ ہم نے آدھے گھنٹے کا یہ سفر لاری میں طے کیا۔ ڈیڑھ بجے لاری والے نے ہمیں مہرولی کے مینا بازار میں لا اتارا۔ مینا بازار مہرولی کا ایک ہی بازار ہے۔ اس میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بڑی عمارت تک پہنچے جس کے ایک حصے میں خضر مرزا صاحب

بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ ان کے حصے کا ایک دروازہ عمارت کی بڑی ڈیوڑھی کی طرف کھلا تھا۔ ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو اس دروازے کے سامنے ایک شریف صورت پیر مرد پلنگ پر محو استراحت نظر آئے۔ گلے میں کرتا نہیں تھا' صرف ایک تہمد بندھا ہوا تھا۔ ہم مکان میں داخل ہوئے اور بڑی خاموشی سے جاکر دالان میں بیٹھ گئے تاکہ وہ ہمارے شور سے بیزار نہ ہوں۔ ان کے ملازم عبداللہ سے دو ایک باتیں کیں۔ (بعد میں مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ عبداللہ ملازم سے ان کا سلوک نوکروں کا سا نہیں بلکہ اپنے بچوں کا سا ہے۔) میں نے یہاں بیٹھے بیٹھے مکان کی عام ہیئت کا جائزہ لیا۔ وہی طرز تھی جو دہلی کے مکانات میں عام طور پر (اور لاہور میں بہت کم) ملتی ہے۔ ہمارے سامنے صاف ستھرا کشادہ صحن تھا جس کے ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ نظر آرہا تھا' پھر دالان اور اس کے بعد دالان در دالان اور دونوں کی بغل میں کوٹھڑیاں۔ انھی میں سے ایک میں خضر مرزا صاحب اس وقت سو رہے تھے۔ دالان سے متصل صحن میں ایک طرف نماز کے لیے تخت لگا تھا۔ لوٹا اور چلمچی' جانماز اور تسبیح ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ جس دالان میں ہم بیٹھے تھے' اس میں چاندنی کا اجلا فرش تھا۔ طاقوں میں حسب دستور قدیم' بڑے یا چھوٹے آئینے بطور آرائش لگے ہوئے تھے اور ان کے سامنے جابجا چینی اور بلور کے برتن قرینے سے سجے تھے۔

ہمیں یہاں بیٹھے کوئی آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا کہ ڈاکیا ڈیوڑھی کی طرف آیا اور بے تکلف "نواب صاحب ! نواب صاحب !" کہہ کر آوازیں دینے لگا۔ وہ ایک خط دینے آیا تھا جو بعد میں ہم نے خضر مرزا صاحب کے ہاتھ میں دیکھا۔ بہرحال ڈاکیے کی ہائے و ہُو سے' وہ بیدار ہو چکے تھے۔ ملازم نے ہمارے آنے کی اطلاع کی اور انھوں نے ہمیں فوراً بلا لیا۔ وہ بدستور پلنگ پر بیٹھے رہے۔ ہم تینوں سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔



زائچہ ۔۲

عارف جان اور قاسم جان کی اولاد کا مِلا جُلا شجرۂ نسب

ابتدائی مزاج پرسی کے بعد میرے دونوں دوستوں نے میرا تعارف کرایا اور میرے حاضر ہونے کا مقصد بیان کیا۔ اس سلسلے میں جوں ہی غالب کا نام لیا گیا' خضر مرزا صاحب نے فرمایا "ہاں' میرے دادا تھے"۔ ظاہر ہے صرف یہ تشریح میرے لیے کافی نہ تھی' اس لیے میں نے کچھ مزید تفصیل کے لیے ان کی خدمت میں درخواست کی۔ معلوم ہوا کہ مرزا غالب کی بیگم صاحبہ کی حقیقی بہن بنیادی بیگم' خضر مرزا کی دادی تھیں۔ مرزا زین العابدین خاں عارف جن سے غالب کو حد درجہ انس تھا' انھی بنیادی بیگم کے فرزند اور خضر مرزا کے حقیقی تایا تھے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ عارف کے علاوہ بھی بنیادی بیگم کے کوئی بیٹے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ عارف کے ایک حقیقی چھوٹے بھائی تھے جن کا نام مرزا حیدر حسن خاں تھا۔ خضر صاحب انھی حیدر حسن خاں کے بیٹے ہیں۔ عارف جان اور قاسم جان کی اولاد کا ملا جلا شجرہ نسب اگر سامنے رکھ لیا جائے تو یہ تمام کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس میں صرف ان اشخاص کے نسب کی توضیح کی گئی ہے' جن کا اس مضمون سے براہ راست تعلق ہے۔

خضر مرزا صاحب نے اپنے متعلق فرمایا کہ "میری پیدائش ۱۸۵۲ کی ہے۔" لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ "سعید الدین احمد خاں بھی اسی سال پیدا ہوئے۔ وہ مجھ سے چھ دن بعد پیدا ہوئے تھے۔" اس پر میں نے عرض کیا کہ سعید الدین احمد خاں کا سال پیدائش غالباً ۱۸۵۳ ہے۔ فرمایا "پھر میرا بھی وہی ہو گا۔" اگر ۱۸۵۳ کو خضر صاحب کی پیدائش کا صحیح سال تسلیم کرلیا جائے تو اس وقت ان کی عمر چھیاسی ستاسی برس کی ہونی چاہئے اور قیافے سے بھی اتنی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس حساب سے غالب کی وفات کے وقت ان کا سن سولہ برس کے لگ بھگ ہو گا۔ گزشتہ سال جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس بڑھاپے کے باوجود ان کے ہوش و حواس بالکل

درست اور برقرار تھے۔ حافظہ اب تک جوانوں کے حافظے کی طرح کام دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زندگی کے ساتھ ان کی دلچسپی اب بھی پورے جوش سے قائم ہے۔ تصوف کے حقائق ہوں یا دنیا داری کے لطائف' وہ ہر چیز سے حظ وافی اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے ہیں۔ ظرافت کا احساس ابھی تک ویسا ہی تیز ہے' اسی لیے بوڑھے اور جوان سبھی ان کی گفتگو سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اتوار کے اتوار ان کے مہولی کے مکان میں دوستوں اور عقیدت مندوں کا اچھا خاصا جمگھٹا لگ جاتا ہے اور یہ ہفتہ وار مجلس ان کی زندگی کے لوازم میں سے ہے۔ ان کی گفتگو بالعموم طریقت کے نکات اور اولیا و مشائخ کی کرامات کے متعلق ہوتی ہے لیکن میری درخواست پر جب غالب کا تذکرہ چلا تو غالب کے دور آخر کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہوئے ان کے منہ سے ایسی ایسی پھلجھڑیاں چھوٹیں کہ وہ خود بھی محظوظ ہوئے اور مجھے بھی لطف آگیا۔ یہ واقعات انھوں نے مجھے پرانی بے جان روایتوں کی طرح نہیں سنائے بلکہ ہر قول کو دہراتے ہوئے اپنے لب و لہجے میں موقع و محل کے لحاظ سے مناسبت پیدا کرکے گویا مردہ روایات کو زندہ کر دیا۔ کاش ان چھپے ہوئے حرفوں میں ان کی آواز کا زیر و بم بھرا جاسکتا اور میں اسے نقل کے مطابق اصل ہونے کا دعویٰ کرسکتا!

مرزا خضر صاحب کا اصل نام مرزا محمد حسن خاں ہے لیکن جیسا کبھی کبھی ہوتا ہے کہ یہ اپنے بھائی مرزا محمد حسین خاں کے نام پر مشہور ہو گئے' یہاں تک کہ ۱۸۷۶ میں جب یہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے تو سرکار میں ان کا یہی نام (مرزا محمد حسین خاں)

۱۔ خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی عمر مرزا خضر صاحب سے کچھ کم ہی ہوگی' لیکن اگست ۱۹۳۸ میں جب میں لکھنؤ میں ان سے ملا تو ان سے گفتگو کرنے اور ان کی بات سمجھنے میں مجھے بہت دقت پیش آئی۔

درج ہؤا۔ اس صدی کے آغاز میں تحصیلداری کے عہدے سے وظیفہ یاب ہو کر سبکدوش ہوئے۔ اب عرصے سے یاد خدا میں مصروف ہیں اور ذکر و فکر ہی زندگی کا مشغلہ ہے۔ بچپن سے ان کا عُرف خضر مرزا لوگوں کی زبان پر چڑھا ہؤا ہے اور عُرف اصلی نام سے کہیں زیادہ مشہور ہے۔ یہ عُرف در اصل ان کی پیدائش کے دن سے ان کے ساتھ ہے۔ ان کی والدۂ ماجدہ نے ان کو بڑی مَنّتیں مان کر پایا اور ان کی زندگی کے لیے ایک خدا رسیدہ بزرگ سے دعائیں کرائیں۔ ان بزرگ نے اس نومولود کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ "یہ بچہ بڑی لمبی عمر پائے گا۔ اس کو خضر سمجھو' خضر۔" اُس دن سے اس بزرگ کا دیا ہؤا خطاب مقبولِ خاص و عام ہؤا اور اب سرکاری کاغذات کے سوا ہر جگہ اسی سے معروف ہیں۔ مجھ سے ہنس کر فرماتے تھے کہ "لڑکپن میں مرزا غالب میرے کان پکڑ لیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ لَے سے کہتے جاتے تھے: 'خضر خاں کی گُمّی! خضر خاں کی گُمّی!' اور کان ہلا ہلا کر یہ بھی: 'خضری جوان' تیرے لمبے لمبے کان! خضری جوان' تیرے لمبے لمبے کان!'"

مرزا خضر صاحب کے تایا زاد بھائیوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو تو مرزا غالب نے اپنے بیٹے بنا لیا تھا اور خضر صاحب کی روایت ہے کہ وہ بھی غالب کو ابّا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے ساتھ مرزا کا دِلی تعلق محتاجِ تشریح نہیں' لیکن خضر صاحب کے کانوں پر مرزا کی جو عنایات تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ان کی محبت آمیز توجہ اور بزرگانہ شفقت سے محروم نہ تھے۔ چنانچہ خضر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "گلشنِ عشق' میں نے اور سعید الدین احمد خاں نے مرزا صاحب ہی سے پڑھی۔ خوب سمجھا کر پڑھاتے تھے اور ساتھ ہی مصدر وغیرہ اچھی طرح کھول کھول کر بتاتے جاتے تھے۔"

خضر صاحب نے اپنے اور حسین علی خاں کے متعلق ایک چھوٹا سا لطیفہ مجھے سنایا۔ فرمایا "ایک دن مَیں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی: 'ابے لمڈو یہاں آؤ۔' ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لیے مُٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ 'ابے یہ کیا! منہ سے کھاؤ۔ میرے مرغی کے بچے یوں ہی چُگا کرتے ہیں۔'" اِس آخری فقرے پر خضر صاحب بے اختیار ہنسے اور اسے دُہرا کر بار بار ہنستے رہے۔ لوہارو کے خاندان سے مرزا غالب کو دوستی اور دشمنی کا جو تعلق تھا' اس سے اب ایک دنیا واقف ہے۔ لوہارو کے پہلے رئیس نواب احمد بخش خاں کے متعلق خضر صاحب نے بعض واقعات سنائے: "احمد بخش خاں' نواب بننے سے پہلے مہاراجہ الور کے وکیل تھے۔ خوش عقیدہ آدمی تھے اور خاص طور پر مولانا فخرا صاحب سے انھیں بہت ارادت تھی۔ ایک رات احمد بخش خاں مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے اور (عقیدت مندی کی راہ سے) ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ رات زیادہ گزر گئی تو مولانا نے فرمایا 'نواب! جاؤ' اب آرام کرو۔' احمد بخش خاں نے یہ بات سنی مگر بدستور پاؤں دباتے رہے۔ آخر مولانا نے پھر فرمایا 'جاؤ نواب! اب آرام کرو' اس پر

ا۔ مولانا فخر الدین شاہجہاں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مشائخِ متاخرین میں سے تھے' ان کا زمانہ ۱۷۱۴ سے ۱۷۸۵ کا ہے۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ان کے بہت سے مناقب اور کرامتیں نقل کی گئیں ہیں۔ مرزا الٰہی بخش معروف کو ان سے جو عقیدت تھی اس کے متعلق "دیوان معروف" میں جو مرزا نصراللہ خاں صاحب نے طبع کرایا ہے' مختلف جگہ اشارے ملتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے:

قبلہ و کعبۂ صاحب نظراں فخر الدین
فخرِ دیں' فخرِ زمیں' فخرِ زماں فخرالدین

احمد بخش خاں نے عرض کی 'حضرت! نواب تو یہاں کوئی نہیں ہے' یہی خاکسار حاضر ہے'۔ مولانا نے فرمایا ہاں 'تمھیں سے کہتا ہوں ، تمھی نواب ہو'۔ اس کے بعد احمد بخش خاں گھر چلے آئے۔ اس وقت تک انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی نوابی ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انگریزوں کو بھرت پور کا معرکہ پڑا۔ احمد بخش خاں بھی انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ فوج کا جرنیل گورنر جنرل کا داماد تھا۔ اتفاق کی بات کہ ایک گولہ انگریز جرنیل کے آن کر لگا' اور وہ زخمی ہوکر گر پڑا۔ نواب احمد بخش خاں یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ لپک کر بڑھے اور جرنیل کو اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر دشمنوں کے نرغے میں سے بچالے گئے۔ ظاہر ہے کہ جرنیل ان کی اِس بر وقت امداد سے بہت شکر گزار ہُوا۔ اس نے احمد بخش خاں کو گورنر جنرل کے نام ایک چٹھی لکھ کر دی جس میں ان کی کارگزاری کا پورا قصہ بیان کرکے ان کی بہت تعریف کی۔ پھر یہ چٹھی احمد بخش خاں کو دے کر کہا کہ جب گورنر جنرل آکر دربار کریں تو یہ چٹھی ان کی خدمت میں پیش کرنا۔ الغرض جب گورنر جنرل کا دربار ہوا تو احمد بخش خاں انگریز جرنیل کی چٹھی لے کر پہنچے۔ گورنر جنرل نے اپنی خوشنودی کے اظہار کے لیے اُسی وقت فیروز پور جھرکا کا علاقہ انھیں عطا فرمایا۔ اس پر مہاراجہ الور اٹھے اور انھوں نے کہا 'لوہارُو کا پرگنہ میری طرف سے اس پر اضافہ سمجھو'۔ اِس طرح احمد بخش خاں' لوہارُو اور فیروز پور کے نواب بنے۔

"نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں جن کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے بعد میں مرزا غالب کی شادی ہوئی' ان کی ایک الگ داستان ہے۔ وہ بڑے عیش پسند' خوش پوش اور خوش باش تھے۔ اسی وجہ سے "شہزادہ گلفام" کہلاتے تھے۔ ایک دفعہ جب جاڑا شروع ہوا تو ان کے لیے نئی رضائی بن کر آئی۔ دُھنیے کی غفلت سے کہیں

ایک بنولا روئی میں اٹکا رہ گیا۔ الٰہی بخش خاں رات کو رضائی اوڑھ کر سوئے مگر اف رے نازک مزاجی کہ انھیں نیند نہ آئی' پر نہ آئی۔ وہ ایک بنولا رات بھر کھٹکتا رہا۔ صبح اٹھ کر داروغہ پر بگڑے' نوکر کو پیٹا اور کیا کچھ تھا جو نہ کیا' لیکن اس ایک واقعے نے ان کی زندگی پلٹ دی۔ جس طرح مولانا فخر نے ان کے بھائی کو دنیوی وجاہت کی نوید سنائی تھی اسی طرح ان کو بھی ملکِ فقر کی ریاست بخش دی۔ ابتدا میں الٰہی بخش خاں پیروں فقیروں سے کوئی میل جول نہیں رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے دونوں بھائیوں کی طبیعت میں بڑا فرق تھا۔ احمد بخش خاں جس قدر خوش اعتقاد تھے' اُسی قدر الٰہی بخش خاں کو مشائخ کی صحبت سے گریز تھا۔ احمد بخش خاں انھیں بارہا مولانا فخر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی ترغیب دیتے' لیکن الٰہی بخش خاں ہر بار انکار کرتے یا ہنسی میں ٹال دیتے۔ مولانا فخر کے مرید اکثر بطور نذر و نیاز لڈو ساتھ لاتے اور مولانا کی خدمت میں پیش کرتے۔ مولانا ان لڈوؤں کو حاضرینِ مجلس میں تقسیم کر دیتے۔ کبھی کبھی احمد بخش خاں یہ لڈو لے کر گھر پہنچتے تو الٰہی بخش خاں ہنستے اور کہتے 'ناں صاحب! یہ لڈو پیڑے آپ ہی کو مبارک رہیں۔' یا تو یہ حالت تھی اور یا خدا جانے کیا دھیان آیا کہ ایک جمعہ کو اپنے بھائی کے ساتھ مولانا فخر صاحب کے حضور میں جا پہنچے۔ مولانا ان کو دیکھ کر احمد بخش خاں سے مخاطب ہوئے کہ : 'اس درویش کو یہاں کیوں لے آئے ؟ یہ درویش ہے درویش!' خدا جانے ان لفظوں میں کیا تاثیر تھی کہ الٰہی بخش خاں پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ زارو قطار رونے لگے۔ حضرت سے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اُسی وقت حلقے میں شامل ہوئے۔ اب مولانا نے مسکرا کر اپنے ایک مرید کو اشارہ کیا اور فرمایا 'ہاں تو بھئی وہ لڈو پیڑے ان کے لیے بھی لاؤ ناں!' یہاں سے رخصت ہو کر گھر آئے مگر واپس آتے ہی سچ مچ کے درویش بن گئے۔ عیش و عشرت کا

سب سامان فقیروں مسکینوں میں لٹا دیا۔ ماں نے بہتیری منتیں سماجتیں کیں مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ کمبل کندھے پر ڈالا اور حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں ایک حجرہ سنبھال کر بیٹھ گئے۔ اِسی درویشی کے عالم میں انھوں نے باقی زندگی گزار دی"۔

جن لوگوں نے غالب کی پنشن کے جھگڑے کا مطالعہ کیا ہے' ان کو معلوم ہے کہ نواب احمد بخش خاں اور ان کے بڑے بیٹے شمس الدین خاں کے ساتھ اپنے چچا کے ترکے کے متعلق مرزا غالب کے اختلافات کس طرح شروع ہوئے اور اس نزاع کی تلخی کو مرزا غالب نے کس درجہ محسوس کیا۔ ۱۸۳۵ میں جب شمس الدین خاں نے فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی پائی تو دہلی میں بعض لوگوں کو شبہ ہُوا کہ جائیداد کے قضیے کا انتقام لینے کے لیے مرزا غالب نے شمس الدین خاں کے خلاف مخبری کی ہے۔ مجھے خیال گزرا کہ اگر اس الزام میں صداقت کا کوئی شائبہ ہے تو لوہارو والوں اور ان کے متعلقین میں اس کے متعلق اچھا خاصا چرچا رہا ہو گا۔ میں نے خضر مرزا صاحب سے اس بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے فوراً کہا: "مخبری؟ ہم نے تو کوئی ایسا ذکر کبھی سنا نہیں۔ ہاں' فتح اللہ بیگ خاں کا نام اِس سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ فتح اللہ بیگ خاں پھوپھی کے بیٹے تھے' امین الدین خاں کے۔ ان سے شمس الدین خاں نے ایک دفعہ ہنسی ٹھٹھے میں کچھ ایسی چھیڑ چھاڑ کی کہ وہ بگڑ گئے۔ ہُوا یوں کہ فتح اللہ بیگ خاں نے ایک کابلی گھوڑا خریدا' بڑے ٹھاٹھ کا گھوڑا تھا مگر ایک بات اس میں عجیب تھی۔ اتے بڑے بڑے فوطے تھے۔ شمس الدین خاں نے گھوڑا دیکھ کر قیمت پوچھی۔ فتح اللہ بیگ خاں نے کہا ایک ہزار کو خریدا ہے۔ اب بھلا شمس الدین خاں کی زبان کو کون روکے۔ فوراً بولے 'ہاں بھئی کیوں نہ ہو ایک ہزار کے تو اس کے خصیے ہی ہیں'۔ بس یہ بات تھی جس پر دونوں میں بگاڑ ہو گیا اور فتح اللہ بیگ خاں کا دل پھر کبھی ان سے صاف نہ ہُوا۔

یہی وجہ ہے کہ جب فریزر کے قتل کے معاملے میں شمس الدین خاں پر آفت آئی تو اس وقت فتح اللہ بیگ خاں نے ان سے دشمنی کی۔

"شمس الدین خاں مدی رنڈی کے بیٹے تھے۔ نواب احمد بخش خاں کو مدی بہت عزیز تھی۔ اس لیے شمس الدین خاں کو اپنے دوسرے بیٹوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ شمس الدین خاں رنگین مزاج نوجوان تھے' ان کے حسن و جمال کا دہلی بھر میں شُہرہ تھا۔ جب یہ بازار میں سے گزرتے تھے تو طوائفیں ان کو دیکھنے کے شوق میں اپنی کھڑکیوں کے پردے اُلٹ دیتیں اور اِس انتظار میں بیٹھی رہتیں کہ کب نواب کی سواری ادھر سے نکلے۔ جب انھیں پھانسی ہوئی ہے تو دہلی میں ان کا بڑا ماتم کیا گیا۔ مرزا غالب نے ان کے مرنے پر ایک رباعی لکھی تھی مگر مجھے یاد نہیں ہے"۔

میں نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے متعلق کچھ سوالات کیے۔ فرمایا : "یہ دونوں مجھ سے بڑے تھے۔ زین العابدین خاں مرنے سے پہلے انھیں مرزا صاحب (غالب) کے سپرد کر گئے۔ دراصل زین العابدین خاں کو اپنی بیوی کی موت کا بڑا صدمہ ہُوا تھا۔ شاید نوشابہ بیگم نام تھا' مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ زین العابدین خاں کو ان سے بہت محبت تھی ۔ بُت کی طرح سامنے بٹھائے رکھتے تھے ۔ انھیں درد گُردہ ہُوا اور مر گئیں۔ جہاں ان کی چارپائی تھی زین العابدین خاں چھ مہینے وہاں بیٹھے رہے مگر آنکھ سے آنسو نہیں چلا۔ اِس حالت میں بھلا کب تک جیتے ؟ آخر اِسی غم میں خود بھی گُھلنے لگے۔ مرنے سے ایک دن پہلے مرزا غالب خیریت پوچھنے آئے تو ان سے کہا دیکھو خالو میں تو جاتا ہوں۔ ان دونوں بچوں کو چھوڑے جارہا ہوں۔ میرے بھائی ہیں' سو ان کے اپنے بھی بچے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی بھی اچھی طرح خبر نہیں لے سکتے۔ ان سے کیا کہوں۔ یہ دونوں لڑکے ہیں بِن ماں اور بِن باپ کے' ان کا کیا ہو گا؟' مرزا صاحب نے اتنا سنا تھا

کہ اٹھ کر لڑکوں کا ہاتھ پکڑ لیا اور زین العابدین خاں سے کہا 'تم اس طرف سے خاطر جمع رکھو۔ یہ دونوں بچے میری جان کے ساتھ رہیں گے۔' اور ہوا بھی ایسا ہی۔ مرزا صاحب نے ان کو بڑے لاڈ سے پالا۔ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں ان سے شوخیاں کرتے اور کبھی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت نازبرداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا: 'ارے حسین علی، آکر پڑھ لے۔' انھوں نے جواب دیا: 'دادا جان (؟) آتا ہوں' اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انھیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیے اور پھر منہ بسورتے ہوئے مرزا صاحب کے پاس آئے کہ 'دادا جان! بیس روپے دلوا دیجے'۔ مرزا صاحب نے آواز دی: 'کلّو۔۔۔۔!' کلّو آیا تو اس سے کہا 'بھئی' انھوں نے ایک پتھر اور مارا۔ 'دے دے اور بیس روپے۔' جب ذرا سیانے ہوئے تو مرزا صاحب کے ساتھ مشاعروں میں بھی آتے جاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں انھوں نے غزل پڑھی جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے:

دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے بہتر ان سے
رنگ کھُل جائے گا اس کا بھی سحر ہوتے تک

"مرزا صاحب بھی موجود تھے۔ فرمایا' 'خوب چمک رہا ہے۔ پرانا ہو جائے گا تو بہت اچھا چنڈول نکلے گا۔' ان دونوں بھائیوں کے مزاج میں عجب فرق تھا۔ باقر علی خاں خاموش آدمی تھے۔ مزاج میں تمکنت اور غرور بہت تھا۔ مرزا صاحب کے ساتھ کبھی مشاعرے میں بھی نہ جاتے تھے۔"

اِس موقع پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ خضر مرزا صاحب لفظوں کا طلسم باندھ کر بھولے بسرے واقعات تصویر در تصویر مجھے دکھاتے چلے جاتے تھے۔ اب مشاعروں کا ذکر جو ہُوا

تو میرا جی چاہا کہ مشاعرے میں مرزا غالب کی تصویر دیکھوں۔ پوچھا کہ کبھی مشاعرے میں مرزا صاحب کو غزل پڑھتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا ہے؟ فرمایا "ہاں' کیوں نہیں' کئی مرتبہ میں نے ان کی غزل مشاعرے میں سنی ہے۔ ان کا غزل پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ اول مصرع پڑھ کر ذرا ٹھیر جاتے۔ اب لوگ دیکھتے تھے۔ اس پر وہی پہلا مصرع مکرّر پڑھتے اور اس کے بعد دوسرا مصرع سناتے تھے۔ عام طور پر بڑے اطمینان اور تمکنت سے پڑھتے تھے۔ جب کوئی تعریف کرتا تو دایاں ہاتھ ذرا اوپر کو دو تین بار اٹھاتے۔ میں کئی بار ان کے ساتھ مشاعرے میں گیا۔ قالین پر بیٹھتے تھے۔ مُصلّے کی طرح کا قالین ہوتا تھا۔ پیچھے تکیہ رکھ دیا جاتا۔ شمع سامنے آتی تو اپنی غزل سناتے تھے۔

"میں نے مرزا صاحب کو غزل لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ عام طور پر مے نوشی کے ساتھ ساتھ غزل کہتے تھے۔ شراب پینے میں ان کا دستور یہ تھا کہ داروغہ کلّو گلاس کو دھوکر آدھ پاؤ شراب اس میں ڈال دیتا اور گلاس ڈھانک کر ان کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ موسمِ گرما میں شراب کا گلاس لال قند کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ کپڑے کو برف سے تر کر دیتے تھے۔ اتنا تر ہو جاتا کہ پانی ٹپکنے لگتا۔ مغرب کی اذان ہونے پر شراب پیتے تھے۔ ایک قاب میں بادام' نمک میں پڑے ہوئے' گھی میں تلے ہوئے بادام' پاس ہی پڑے رہتے تھے۔ چار بادام منہ میں ڈال لیتے اور شراب کا ایک گھونٹ پیتے۔ شراب پیتے اور ساتھ ساتھ غزل لکھتے جاتے تھے۔ شعر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے' پھر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے۔ یہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

"شراب نوشی کے سلسلے میں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے تو اب بھی ہنسی آتی ہے۔ موسمِ سرما میں ایک دن مرزا صاحب کے سامنے شراب رکھی تھی کہ نواب مصطفٰےٰ خاں شیفتہ ملنے کو آ گئے۔ نواب صاحب مے نوشی سے تائب ہو چکے تھے مگر مرزا صاحب نے پھر

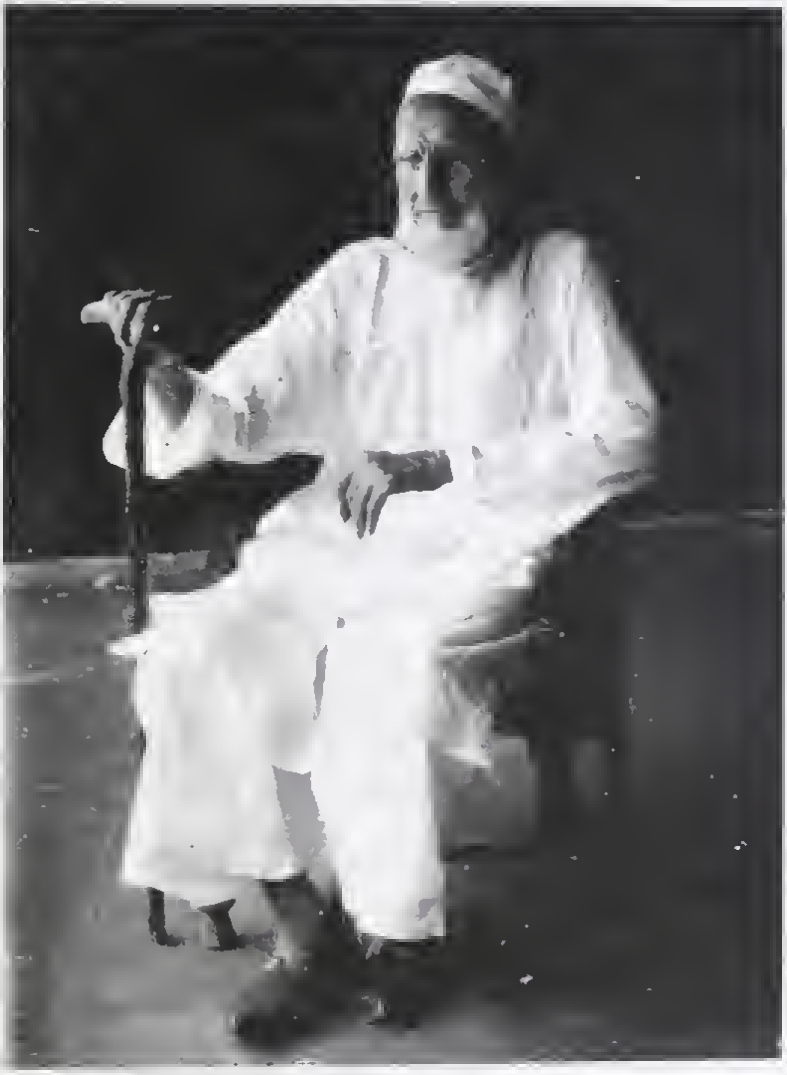
بھی ان کی صلا کی۔ نواب صاحب نے معذرت کی اور کہا تم جانتے ہو' میں توبہ کر چکا ہوں۔ یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے سینے میں دو ہتڑ مارا اور کہا: 'ہئے ہئے! بھئی جاڑوں میں بھی توبہ؟' مجھے جو ہنسی آئی تو پردہ اٹھا کر بھاگ گیا۔

''مرزا صاحب کے ملنے والوں میں مرزا تفتہ کو میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے۔ کمر بندھی رہتی تھی۔ چغہ گھٹنے تک آتا تھا۔ سر پر پرانے فیشن کی پگڑی۔ ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی رکھتے تھے جس کے سرے پر ایک موٹا سا لٹو ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن مرزا تفتہ اصلاح لے رہے تھے۔ شاید کچھ نثر لکھ کر لائے تھے۔ ''شام کا وقت تھا۔ اتفاق سے شمع گل ہوگئی۔ مرزا صاحب نے آوازوں پر آوازیں دیں: 'کلو! جلد آؤ' ارے میاں دیکھنا شمع گل ہو گئی!'

''ایک مرتبہ داروغہ کلو نے آکر پوچھا کہ: تیتر ذبح کرتے ہوئے' اس کی گردن اڑ گئی۔ کیا حلال ہے یا نہیں؟ مرزا صاحب نے فورا کہا اس کے حلال ہونے میں کیا شک ہے۔ ارے میاں' وہ تو اسی وقت حلال ہو گیا' جب اس کی گردن اڑ گئی!

''ہنسنا ہنسانا تو گویا ان کا کام ہی تھا۔ ایک دن میں کھڑا تھا کہ اوپر سے اترے۔ ہاتھ میں لکڑی تھی۔ اتی بڑی لکڑی رکھتے تھے ہاتھ میں۔ دوسرا ہاتھ میرے کھوے پر رکھ کر کہا آ' تیری دادی کے گھر چلتا ہوں' (یہ امراؤ بیگم کا ذکر ہے۔ میں بڑا ہو کر انھی کے گھر جایا کرتا تھا' میری دادی تو مر گئی تھیں) اندر جاکر بستی ماما سے دادی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا نماز پڑھ رہی ہیں۔ مرزا صاحب بولے: جب آؤ نماز میں! ارے خضر' تیری دادی نے تو گھر کو فتحپوری کر دیا!''

جتنی دیر میں یہ لطائف بیان ہوئے مغرب کا وقت قریب آپہنچا۔ دراصل یہ تمام گفتگو یوں مسلسل نہیں ہوئی جیسے میں نے بیان کی ہے۔ بیچ میں وقفے بھی آتے رہے۔

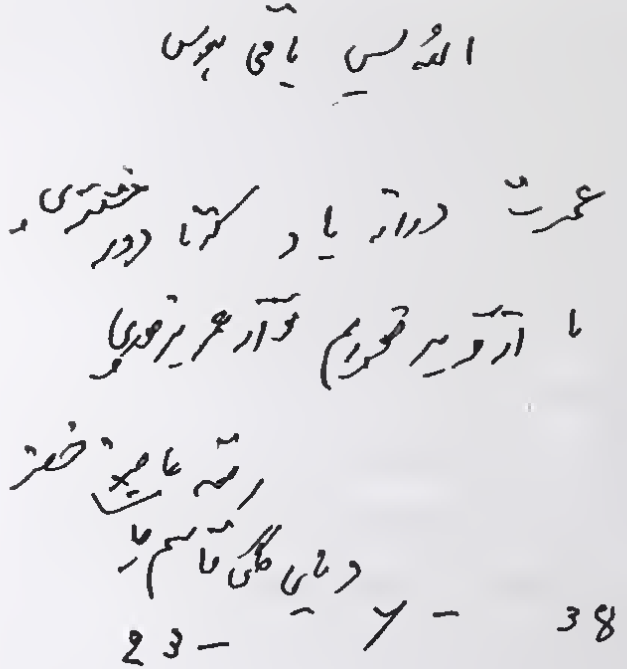


نواب خضر مرزا صاحب (تصویر : ۱۹۳۸)

اگر مرزا غالب کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو خود خضر مرزا صاحب کا گھر ایک چھوٹے پیمانے پر مسجدِ فتحپوری کا کام دیتا رہا۔ اِس اثناء میں ہمیں دو نمازوں سے سابقہ پڑ چکا تھا اور اب تیسری کے بعد ہمیں اپنے معزز میزبان سے رخصت ہونا تھا۔ اس موقع پر خضر مرزا صاحب نے ایسے حسنِ اخلاق سے کام لیا کہ مَیں ان کی مہربانیوں سے آشنا ہونے کے باوجود حیران رہ گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رخصت ہونے سے پہلے قطب صاحب کی درگاہ جاؤں اور لوہارو والوں کے مزارات دیکھ سکوں۔ اس غرض سے کسی واقف کار کا ساتھ ضروری تھا۔ خضر صاحب سے اس قسم کی درخواست کرنا سراسر گستاخی تھی۔ لیکن انھوں نے شاید میرا عندیہ بھانپ لیا اور خود بخود میرے ساتھ چلنے کا خیال ظاہر کیا۔ اِس پیرانہ سالی میں میری خاطر ان کا یہ تکلیف گوارا کرنا ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ انھوں نے ایک بڑی سی لکڑی ہاتھ میں لی اور اسے ٹیکتے ہوئے قطب صاحب کی درگاہ کو روانہ ہوئے۔ ہم تینوں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ خوش قسمتی سے ہماری منزل مقصود بہت دور نہ تھی۔ درگاہ کے احاطے میں داخل ہونے سے قبل میں نے بہادر شاہ کی شکستہ حویلی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ برسات کے دنوں میں بہادر شاہ جب مہرولی آتے تو اسی حویلی میں ٹھیرتے تھے۔ یہ عمارت اب جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی ہے لیکن ڈیوڑھی کا رفیع الشان محراب دار دروازہ اب بھی برقرار ہے اور پہلی نظر میں بتا دیتا ہے کہ مغلوں کا فنِ تعمیر اپنے دورِ زوال میں بھی شکوہ و عظمت سے یکسر عاری نہ تھا۔ درگاہ کے صدر دروازے سے داخل ہو کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم لوہارو والوں کے احاطے تک پہنچے۔ سب سے پہلے ہم نے اینٹ کی بنی ہوئیں دو سادہ سی قبریں دیکھیں۔ دونوں قبریں بالکل ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک قبر نواب احمد بخش خاں کے والد عارف جان کی ہے اور دوسری عارف جان کے

بھائی قاسم جان کی، جو خضر مرزا صاحب کے جدِّ امجد نواب غلام حسین خاں مسرور کے دادا تھے۔ ان قبروں سے ذرا ہٹ کر نواب احمد بخش خاں کی زیادہ شاندار قبر ہے۔ اس پر سنگِ مرمر بھی سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا فخرالدین کا مزار جو قریب ہی ہے، اب بھی زیارت گاہِ عام ہے۔ لوہارو والوں کی چار پانچ نسلوں کی قبریں یہاں موجود ہیں اور خضر مرزا صاحب ہاتھ کے اشارے سے ان ہمیشہ کی نیند سونے والوں کا تعارف مجھ سے کراتے جاتے تھے۔ شام کے پھیلے ہوئے دھندلکے میں ان کے ہاتھ کی ہر جنبش گویا ایک مٹی ہوئی دنیا کو میری آنکھوں کے سامنے لا رہی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد جب ہم یہاں سے لوٹے تو ہم سب خاموش اور اپنے اپنے خیالات میں محو تھے۔

(تحریر: ۱۹۳۹)



نواب خضر مرزا صاحب کی تحریر کا عکس

غالب کی شاعری کا پہلا دَور

۱

مرزا غالب نے ۱۸۰۷ میں، جب ان کی عمر دس سال کے قریب تھی، شعر کہنا شروع کیا۔ شعر گوئی کی ابتدا اردو میں ہوئی۔ لیکن چند ہی سال بعد (غالباً ۱۸۱۱ میں) انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی مشقِ سخن شروع کی۔ حسنِ اتفاق سے اس زمانے کے قریب پایۂ تخت کی فضا شعر و شاعری کے لیے از سرِ نو سازگار معلوم ہونے لگی۔ اٹھارویں صدی میں دلّی کا معاشرتی ماحول طرح طرح کے زمزموں سے تہہ و بالا ہوتا رہا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے انحطاط نے دلّی کو ایک خانۂ بے زنجیر بنا دیا تھا جس کی طرف ہر رہزن کی نظر اٹھتی تھی۔ اس سخت جان شہر کے شکار کے لیے قسم قسم کے صیّاد چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ مغرب سے نادر شاہ، شمال سے غلام قادر روہیلا، جنوب سے مرہٹے اور آخر میں مشرق سے انگریز اپنے اپنے وقت پر پہنچتے رہے۔ ان ہنگاموں میں علم و ادب کا پھولنا پھلنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد

نصف صدی سے کچھ اوپر تک کم از کم ظاہری طور پر کامل امن و سکون رہا اور مغلوں کی دلّی نے بجھتی ہوئی شمع...

ستمبر ۱۸۰۳ میں لارڈ لیک کا لشکر سندھیا کو شکست دے کر دلّی میں داخل ہوُا اور شاہ عالم ثانی کے نام پر انگریزی عملداری کا نفاذ ہوُا۔ اس واقعے کے دس بارہ سال بعد دلّی میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ظہور ہوُا۔ مرزا غالب جو اُس وقت مرزا نوشہ کہلاتے تھے' افتادِ طبع کے لحاظ سے لڑکپن میں بھی ایک نرالا انداز رکھتے تھے۔ ایک طرف اپنے نانا کی حویلی کی چھتوں پر چڑھ کر پتنگ اُڑانا ان کا محبوب مشغلہ تھا' تو دوسری طرف ہندوستان کے ادق ترین فارسی شاعر بیدل کے کلام سے انھیں انتہائی شغف تھا۔ انھوں نے ابھی لڑکپن سے باہر قدم نہیں رکھا تھا کہ لوگوں کی نظریں ان کے کلام پر پڑنے لگیں۔ چنانچہ اُس زمانے کے لکھے ہوئے بعض تذکروں میں ان کے کلام کے نمونے اور ان کا ذکر موجود ہے۔ ان کا کلام عجیب و غریب ضرور تھا مگر اس میں حسن و خوبی بسااوقات مفقود ہوتی تھی۔ ان کے اشعار کی امتیازی خصوصیات میں ان کی نَو ایجاد مگر مُغلق اور غیرمتناسب تشبیہات و استعارات' انوکھی مگر بالعموم وہمی و خیالی ترکیبیں اور ثقیل اور عسیر الفہم زبان نمایاں تھی۔ دہلی کے سخن فہم اور سخن سرا اس نوجوان کی اَن دیکھی اور اَن سنی زبان کو کسی طرح اردو کا نام دینے کو تیار نہ تھے اور اس کے بے راہرو تخیّل کی جولانیاں انھیں کبھی حیران اور کبھی متبسّم کر دیتی تھیں۔ وہ اس عجیب و غریب صنفِ شاعری کو قطعاً" نظرانداز بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ نوجوان شاعر کے مضامین اپنی پیچیدگی کے باوجود اجتہاد کا پہلو لیے ہوئے ضرور تھے۔ اس کے عام اندازِ بیان کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی کوئی شعاع' خیال کی نئی نئی شاہراہوں پر چمک جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر

تھا کہ جو کچھ لکھتا ہے' بڑی کاوش سے لکھتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اکثر لوگوں کو اس کے سمجھنے کا یارا نہ تھا۔

چنانچہ صورتِ حال یہ ہوئی کہ نوجوان شاعر اپنے منظومات کو اگرچہ پوری سنجیدگی سے دنیا کے سامنے پیش کر رہا تھا لیکن دنیا نے ان چیزوں کو "مہملات" کا مشکل کشا نام دے کر سارا قضیہ ہی ختم کر ڈالنے کی کوشش کی۔ لوگ اس کے اندازِ بیان کے بے تکے پن کا ٹھٹھا اڑانے لگے اور زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مشاعروں میں اس کے کلام کا خاکہ' اس کے سامنے اڑایا جانے لگا۔ خاکہ اڑانے والے اپنے نتائجِ طبع کو ایسی متانت کے ساتھ مشاعرے میں پڑھتے کہ نوجوان شاعر کے پُرجوش اور اثرانگیز انداز کا چربہ اتارنے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔ لیکن انھیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان باتوں سے شاعر کا حوصلہ پست کرنا ممکن نہیں۔ اسے اپنے کلام کی عظمت و اہمیت پر ایک نہ مٹ سکنے والا ایمان تھا۔ ہنسی مذاق سے اسے خاص دل بستگی تھی اور چاروں طرف سے اس کا جو ٹھٹھا اڑایا جا رہا تھا' اس کا جواب دینے سے اس کی بذلہ سنجی قاصر نہیں رہتی تھی۔ وہ طبیعتاً لڑاکا نہ تھا بلکہ لڑائی جھگڑے سے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا دامن بچاتا تھا' لیکن چونکہ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس لیے اپنے طرزِ کلام کی غرابت پر اپنے دوستوں کی دل لگی کے جواب میں ظریفانہ نوک جھونک کرنے میں اسے تامّل نہیں ہوتا تھا۔ غرض کہ اس تمام ہنگامے کے درمیان جو اس کے خلاف برپا تھا' وہ ایک غیر معمولی اعتمادِ نفس سے کام لے کر' اپنے نوایجاد ساز کے عجیب و غریب نغمے لوگوں کو سناتا رہا۔

۲

یہ ہے مرزا نوشہ کے ایامِ شباب کی تصویر۔ حقائق کے فراہم نہ ہونے کی وجہ

سے ہم شاعر کی وفات سے نصف صدی بعد تک اس کی شاعری کے دورِ اول کی تنقید و تشریح میں اِسی افسانے پر قناعت کر لیتے رہے اور کسی کو یہ موقع نہ ملا کہ جن عناصر سے اس افسانے کی ترکیب ہوئی ہے اُن پر غور و فکر کرے۔ غالب کے انتقال کے ٹھیک پچاس سال بعد بھوپال کے کتب خانۂ حمیدیہ سے غالب کا ابتدائی کلام ایک قلمی نسخے کی شکل میں برآمد ہُوا جو نواب محمد حمید اللہ خاں بہادر کی سرپرستی اور مفتی انوارالحق صاحب کے اہتمام سے شائع ہو کر "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے معروف ہُوا۔ اس نسخے کی اشاعت سے فکرو تحقیق کا ایک نیا باب کھل گیا' جس کا احساس گذشتہ تیس سال میں مختلف ادیبوں کو رہا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس تحقیق کے لیے کچھ اصول وضع کیے لیکن ان سے انھوں نے خود نتائج کا استنباط نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ مولوی عبدالباری آسی نے اپنی شرحِ کلامِ غالب کے مبسوط مقدّمے میں دورِ اول کے اشعار کو زیادہ توجہ سے دیکھنے پر زور دیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ میں لاہور سے غالب کے متعلق دو کتابیں شائع ہوئیں جن کی تحریر میں بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر کی تصنیف میں غالب کی زندگی کے واقعات اور تاریخوں کا تعیّن بڑی چھان بین سے کیا گیا ہے اور اگرچہ مولانا نے شاعر کے ابتدائی دورِ حیات سے زیادہ بحث نہیں کی' پھر بھی اس دور کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈال کر انھوں نے اربابِ تنقید کے لیے یقیناً آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ دوسری تصنیف شیخ محمد اکرام کا "غالب نامہ" ہے۔ اس کتاب کا بڑا کارنامہ کلامِ غالب کی تاریخی تدوین ہے جسے مصنّف نے بڑے سلیقے اور محنت سے انجام دیا ہے۔ جس طرح نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے بعض ایسی غلطیوں کی اصلاح ہو گئی جو دیوانِ غالب کے نسخۂ نظامی کا مقدمہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر سید محمود

سے سرزد ہوئی تھیں، اسی طرح مولانا غلام رسول مہر جیسے محتاط مؤرخ سے بھی غالب کی ایک مشہور غزل کے متعلق لغزش ہوئی جو "غالب نامہ" کی تاریخی تدوین سے روشنی میں آ سکی۔ ڈاکٹر سید محمود نے غالب کے عنفوانِ شباب کے کلام کے بعض حصوں کو ہنگامۂ ۱۸۵۷ کے تأثرات قرار دیا تھا۔ اِسی طرح مولانا مہر نے اس قطعہ کو جو:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

سے شروع ہوتا ہے، ۱۸۵۷ سے منسوب کیا ہے، حالانکہ یہ بھی ۱۸۳۸ بلکہ غالباً ۱۸۳۲ سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔

مولانا غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام کے محققانہ کام نے بلاشبہ ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے لیکن اب بھی غالب کے دورِ اول کے متعلق ہمارا سرمایۂ معلومات اُس واقفیت کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے جو ہمیں غالب کے بعد کے حالات اور نتائجِ فکر کے متعلق حاصل ہے، اور اندیشہ یہ ہے کہ جب تک اس پہلے دور کے متعلق نئے حالات روشنی میں نہ آئیں گے، ہماری یہ ناواقفیت برقرار رہے گی۔ بااین ہمہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے دورِ اوّل کو سمجھنے کے جو مواقع ہمیں بہم پہنچے ہیں، ان سے پورا فائدہ اٹھایا نہیں گیا۔ یہ درست ہے کہ غالب کے عہدِ شباب کا کلام ناپختگی اور ژولیدہ بیانی کا مرقع ہے اور اس لحاظ سے بداہتہً شاعر کے بہترین کلام کے پہلو بہ پہلو نہیں رکھا جا سکتا، لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اپنی پیچیدگی و ثقالت کے باوجود یہی کلام اس کے تخیّل کی بلند ترین پرواز کا نقطۂ آغاز اور اس کی شاعرانہ عظمت کی بنیاد ہے۔ اس اعتبار سے ایک خاص تاریخی اور تنقیدی اہمیت، اس حصۂ کلام سے متعلق ہو

جاتی ہے، جس کا صحیح اندازہ کئے بغیر غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔

مفتی انوارالحق اور مولوی عبدالباری آسی دونوں کو اُن لوگوں کے خلاف شکایت ہے جنھوں نے مرزا غالب کو ان کا ابتدائی کلام حذف کرنے پر مجبور کیا۔ مگر سچ پوچھیے تو اس انتخاب کے بغیر دیوانِ غالب کی مقبولیت میں بڑی دقتیں پیش آتیں۔ ہم لوگ غالب کے بہترین اشعار سے متاثر ہو کر غالب کی عظمت کا ایک خاص تصوّر قائم کر چکے ہیں، اس لیے ہماری کیفیت اُن لوگوں سے بہت مختلف ہے جن کے دل میں غالب کو ابھی جگہ بنانی تھی۔ ان کی راہ میں یہ مُغلق کلام ایک سنگِ گراں ثابت ہوتا، جس کے ہٹانے میں خدا جانے کتنا عرصہ لگ جاتا۔ البتہ ہمارے عہد میں جب زمانہ مرزا غالب کو ایک بہت بڑے شاعر کی حیثیت سے پہچان چکا ہے، اس ابتدائی کلام کا شائع ہو جانا ایک نعمتِ غیرمترقبّہ ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ابتدا میں غالب کا اندازِ بیان اور طرزِ تخیّل کیا تھا؟ اس سے اس کی شخصیت کو سمجھنے میں کتنی مدد ملتی ہے؟ نوجوان غالب نے پختہ کار غالب کے لیے کس طرح زمین تیار کی؟ ان ابتدائی خامیوں کو غالب کی انتہائے کمال کے ساتھ کیا علاقہ ہے اور اس بنیاد پر اس نے اپنے تخیّل کا عظیم الشان محل کس طرح تعمیر کیا؟

۳

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ غالب کی شاعری کے دورِ اول سے ہمیں کیا مراد لینی چاہئے؟ اِس سوال کو غالب کے نقادوں میں سے صرف ڈاکٹر عبداللطیف اور شیخ محمد اکرام نے قابلِ اعتنا خیال کیا ہے اور ان کا جواب یہ ہے کہ پہلا دور بھوپال کے

قلمی نسخے کی تاریخ کتابت پر ختم ہوتا ہے۔ اس قلمی نسخے کے خاتمے پر کاتب کی یہ تحریر موجود ہے:

> دیوان مِن تصنیف مرزا صاحب و قبلہ (کذا) المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم، علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم ماہ صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ یکم نومبر ۱۸۲۱ کو اس قلمی نسخے کی کتابت تکمیل کو پہنچی اور جو اشعار اس دیوان کے متن میں درج ہیں وہ بداہتہً ۱۸۲۱ تک لکھے جا چکے تھے۔ اگر اس تاریخ کو پہلے دور کے خاتمے کی تاریخ مان لینا ممکن ہوتا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن یہ بدیہی طور پر ناموزوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک شاعر کی زندگی کے دور اس بنا پر قائم کئے جائیں کہ کسی شخص نے، اور وہ بھی شاید دُور افتادہ شخص نے، ایک خاص تاریخ تک اس کا کلام جمع کیا تھا۔ اس قسم کے دور تحریر و کتابت کے دور تو کہلا سکتے ہیں لیکن خود شاعر کی زندگی سے انہیں ربط ہونا لازم نہیں۔ شاعر کے منازلِ فنی کی تقسیم اِس اعتبار سے ہونی چاہئے کہ ہر دور میں شاعر کے کلام کی نوعیت کیا تھی۔ ادبی تنقید میں جب ہم کسی شاعر کی زندگی کے دور قائم کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باطنی کیفیات کے لحاظ سے اس کی زندگی جن چند تدریجی منازل میں تقسیم ہو جاتی ہے ان کو بقیدِ سن و سال متعین کر دیا جائے۔ اِس طرح اس کے کلام کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ ذہنی ارتقا بالعموم کچھ خارجی واقعات کے متوازی ہوتا ہے جن کا شاعر کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن بصورتِ موجودہ یہ تسلیم کر لینا بہت ہی دشوار ہے کہ بھوپال کے نسخے کی کتابت سے غالب کی زندگی اس درجہ متاثر ہوئی کہ اس کا رخ پلٹ گیا۔

اِسی خیال کے پیش نظر میں اس سے متفق نہیں ہو سکتا کہ حافظ معین الدین صاحب

چونکہ یکم نومبر ۱۸۲۱ تک غالب کی متعدد غزلیات لکھ چکے تھے اس لیے اس تاریخ کو (یا اس سال کے اندر) غالب کی شاعری کا پہلا دور ختم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۲۱ تک غالب کی شاعری اپنی ابتدائی منزل سے روانہ ہو کر زبان و خیال کے ایک نئے میدان میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ انقلاب تدریجی تھا' ناگہانی نہیں تھا' اس لیے اس کے متعلق کسی ایک قطعی تاریخ کا متعین کرنا آئندہ معلومات کی روشنی میں بھی ممکن نہیں ہوگا۔ پھر بھی مزید تحقیقات سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ کسی ایسے سال کو مشخص کر لیں جس کے بعد مرزا غالب اپنا ابتدائی انداز تقریباً" ترک کر چکے تھے یا یوں کہیے کہ ان کے انداز میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔

"غالب نامہ" میں اگرچہ ۱۸۲۱ تک کا زمانہ دور اول قرار دیا گیا ہے لیکن مصنف نے غالباً" اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر جس کی شرح اوپر کی گئی ہے اس دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کا نام انھوں نے "رنگِ بیدل" اور دوسرے کا "بادۂ نیم رس" تجویز کیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تقسیم کس معیار کے مطابق کی گئی ہے۔ "بادۂ نیم رس" کی ترکیب سے خیال ہوتا ہے کہ دونوں حصوں کے درمیان معنوی ارتقا کا کوئی امتیاز شیخ محمد اکرام صاحب کے پیش نظر تھا لیکن اس معیار کے استعمال میں انفرادی ذوق کی بنا پر شاید اکثر لوگ ان سے اختلاف رائے کریں گے۔

بیدل کا رنگ ان کے دونوں منتخبہ حصوں میں نہایت شدت کے ساتھ موجود ہے بلکہ "بادۂ نیم رس" میں انھوں نے متعدد ایسی غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے جن میں غالب نے لفظاً" و معناً" بیدل سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے[1]۔ اس سے "رنگِ بیدل"

۱۔ مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

اور "بادۂ نیم رس" کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور پہلا دور درحقیقت ۱۸۲۱ پر ختم ہوتا ہے جس میں بقول ان کے :

وہ اشعار ہیں جو ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے اور جو نسخۂ حمیدیہ کے متن میں موجود ہیں۔ ۱

۱۔ غالب نامہ، صفحہ ۱۶۹۔

مرزا غالب ۲۶ اور ۲۷ دسمبر کی درمیانی شب ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے، اس لیے نومبر ۱۸۲۱ء میں انھوں نے ابھی اپنی عمر کا چوبیسواں سال ختم نہیں کیا تھا۔ "غالب نامہ" میں ۲۵ برس کا حساب شاید سالِ ہجری کے مطابق ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب اور مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتابوں میں جابجا سنین قمریہ کے حساب سے مدتوں کا تعین کیا ہے۔ لیکن چونکہ دونوں صاحبوں نے مختلف واقعات کے لیے جگہ جگہ عیسوی سال دیے ہیں، اس لیے شاید یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ اقتضائے زمانی کا حساب بھی سنہ عیسوی کے مطابق کیا جاتا۔ اگرچہ خود مرزا غالب سنہ ہجری کے مطابق حساب رکھتے تھے لیکن موجودہ زمانے میں سنہ عیسوی کا استعمال عالمگیر ہو چکا ہے اور ہم پچیس سال سے پچیس عیسوی سال مراد لیتے ہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ بلا استثنیٰ عیسوی سال کے مطابق حساب کیا جائے اور بصورتِ دیگر تصریح کر دی جائے۔ اس قاعدے کی پابندی کے بغیر غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

اسی حاشیے میں مرزا غالب کی تاریخِ پیدائش کا مسئلہ بھی صاف کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ مرزا نے خود متعدد موقعوں پر یہ بیان کیا ہے کہ وہ ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری کی شب کو پیدا ہوئے۔ مولانا مہر نے اس کے لیے اواخر اکتوبر ۱۷۹۷ء تاریخ مقرر کی ہے لیکن انھیں اعداد و شمار

... مسلسل ...

مجھے اس جملے کے آخری حصّے سے قطعی اختلاف ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ ۱۸۲۱ تک غالب نے جو شعر کہے وہ "نسخۂ حمیدیہ" کے متن میں موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ۱۸۲۱ میں حافظ معین الدین کو اپنے قلمی نسخے کی کتابت کے لیے کلامِ غالب کی کوئی ایسی نقل یا مجموعہ ملا ہو جس کی ترتیب ۱۸۲۱ سے چند برس پہلے ہو چکی تھی؟ مجھے ذاتی طور پر کوئی شبہ نہیں کہ "نسخۂ حمیدیہ" کے متن کے اشعار مرزا غالب ۱۸۲۱ سے قطعاً" کچھ سال پہلے لکھ چکے تھے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں' اپنے دلائل آگے چل کر پیش کروں گا۔

سچ پوچھیے تو ان اسقام کے باوجود جن کا تجزیہ مولانا مہر نے کیا ہے' حالی مرحوم کی "یادگارِ غالب" جس طرح غالب کے عہدِ پختگی پر اب تک بحیثیتِ مجموعی بہترین تصنیف ہے' اسی طرح دورِ اوّل کے متعلق بھی جو معلومات اس نے ہمیں دی ہیں' ان پر کسی نقّاد نے بہت کم اضافہ کیا ہے۔ سوانحی حیثیت سے مستقبلِ قریب میں اس قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں التباس ہوا ہے جس کی وجہ سے اس تاریخ میں دو مہینے کا فرق ہے۔ "غالب نامہ" میں یہ تاریخ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء دی گئی ہے جو ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری کے مطابق ہے لیکن یہاں بھی اسلامی اور مسیحی جنتری کے مختلف طریقوں کے لحاظ سے ایک پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اسلامی جنتری کا دن غروبِ آفتاب سے شروع ہو جاتا ہے مگر رواجی جنتری کے دن کا آغاز اس کے برعکس طلوعِ سحر سے ہوتا ہے۔ مثلاً" جس وقت کو ہم رواج کے مطابق اتوار کی شام یا منگل کی شب کہتے ہیں' وہ اسلامی قاعدے کے مطابق پیر کی شام یا بدھ کی شب کہلائے گا۔ جب مرزا غالب شبِ ہشتم ماہِ رجب کو اپنا پیدا ہونا بتاتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ ۷ اور ۸ رجب کی درمیانی شب' یعنی ۲۶ اور ۲۷ دسمبر کی درمیانی شب کو پیدا ہوئے۔ رواجی طریقِ تعبیر کے مطابق مرزا ۲۶ دسمبر ۱۷۹۷ء کی رات کو پیدا ہوئے۔ ۲۶ دسمبر ۱۷۹۷ء منگل کا دن تھا۔

اضافے کی کوئی صورت نظر بھی نہیں آتی۔ لیکن اِس دور کے کلام کی تنقید میں اگر ہمارا اپنا عہد ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو بے جا نہیں۔ اس لیے کہ حالی مرحوم کو اس حصے کی تنقید کے وہ مواقع میسّر نہیں تھے جو "نسخۂ حمیدیہ" کی اشاعت کے بعد ہمیں حاصل ہو گئے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں غالب کے دورِ اول کی شاعرانہ خصوصیات کے متعلق اظہارِ خیال کروں، غالب کی ابتدائی زندگی کے متعلق چند اہم تاریخوں کا جائزہ لے لینا ناگزیر ہے، اس لیے کہ ۱۸۲۱ سے پہلے غالب کی زندگی میں بعض ایسے منازل بھی ہیں، جن کا اس کے شاعرانہ ارتقا کے ساتھ کم از کم امکانی طور پر کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ آغازِ شعر گوئی، تبدیلِ تخلّص، مُلّا عبدالصمد (ہرمزد) کا ورودِ آگرہ، مرزا غالب کا آگرے سے ترکِ وطن اور دہلی کی مستقل سکونت، بیدل کی تقلید سے احتراز اور میر تقی کے کلام پر توجہ اور آخر میں وہ مشہور و معروف معاشقہ جس کی یاد غالب کے دل سے بڑھاپے میں بھی نہ جا سکی، ایسے واقعات ہیں جن کی صحیح تاریخوں کی تحقیق غالب کی ابتدائی زندگی کے سمجھنے میں بے انتہا اہمیت رکھتی ہے۔

میرے نزدیک ان سب تاریخوں کا قطعی تعیّن حیطۂ امکان میں ہے، اگرچہ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان تاریخوں کے تعیّن میں خارجی شہادتوں کے علاوہ ہمیں لازماً کلامِ غالب کی داخلی شہادت سے بھی مدد لینی پڑے گی اور داخلی شہادت کا استنباط کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس میں کسی فردِ واحد کا ذوق متفقہ طور پر معیارِ تحقیق قرار دیا جا سکے۔ تاہم میں نے یہاں ذاتی استدلال کی بنا پر ان تاریخوں کو معیّن کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے کہ اول تو غالب کے تمام فاضل تنقید نگاروں نے غالب کی ابتدائی زندگی کے ان متذکرۂ صدر واقعات میں سے بعض کو قابلِ التفات

ہی خیال نہیں کیا اور دوم کہیں کہیں ان کے نتائجِ تحقیق ' میری رائے میں درست نہیں ہیں۔ اِس اختلاف رائے کی تصریح میں آگے چل کر کروں گا۔ مگر مباحثِ مذکورہ بالا کو چھیڑنے سے پہلے' اس امر کا فیصلہ کر لینا مناسب ہے کہ غالب نے کس زمانے میں شعر کہنا شروع کیا۔

مرزا غالب کے تمام تذکرہ نگار متفق ہیں (اور اس کی سند مرزا کی اپنی تحریروں میں موجود ہے) کہ انھوں نے ابتدا ریختہ کہنے سے کی ہے اور فارسی سخن آرائی کی طرف توجہ بعد میں ہوئی۔ لیکن جس باب میں اختلافِ رائے کی گنجائش موجود ہے' وہ اردو شعر گوئی کا سالِ آغاز ہے۔ اِس اختلاف کی بنیاد خود غالب کے تین بیانات کا اختلاف ہے:

۱۔ عبدالرزاق شاکر کے نام مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دُور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے۔"

۲۔ دیوانِ فارسی کے خاتمے پر خود غالب کی جو تقریظ درج ہے' اس میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے:

> "از روزیکہ شمارۂ سنینِ عمر از اعاد فراترک رفت و رشتۂ حساب زحمت یازدھمین گرہ بخود برگرفت' اندیشہ در رواروِ گام فراخ برداشت و گریوہ و مغاک بادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد۔"

۳۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں غالب کے ایک قصیدے کے دو شعر یہ ہیں:

باخذِ فیض ز مبداء فزونم از اسلاف
کہ بودہ ام قدرے دیرتر بداں درگاہ
ظہورِ من بہماں در ہزار و بست و دویست[1]
ظہورِ خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

اِن تین بیانات سے ہمیں تین تاریخیں حاصل ہوتی ہیں۔ ۱۸۰۸-۱۸۱۲ اور ۱۸۰۶-۱۸۱۲ اس لحاظ سے ناقابلِ قبول ہے کہ مرزا کے اس کلام کا جس پر بحث کرنے کے لیے ہم آج شام جمع ہوئے ہیں' کم از کم کچھ حصہ مرزا کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں کے والد نے میر تقی میر کو دکھایا تھا۔ یہ روایت حالی نے خود غالب کی زبان سے سنی' اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ میر کا انتقال ۱۸۱۰ میں ہوا' جس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۱۰ تک یا اس سے پہلے مرزا نے ریختے میں مشقِ سخن شروع کر رکھی تھی جو اس قابل سمجھی گئی کہ اس کے متعلق میر تقی کی رائے لی جائے۔

شیخ محمد اکرام کی رائے ہے کہ: "مرزا نے آٹھ نو سال کی عمر میں اردو... شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔" انھوں نے اپنے اِس خیال کے لیے اگرچہ کوئی سند پیش نہیں کی' لیکن ان کا استناد غالباً "ظہورِ من بہماں در ہزار وبست و دویست" پر مبنی ہے۔ اس کی

۱۔ کلیاتِ غالب' مطبوعہ نو لکشور (۱۹۲۵) میں یہ دوسرا شعر یوں دیا ہے:

نزول من بہماں بعدِ یک ہزار و دویست ظہورِ سعدی و خسرو بہ شش صد و پنجاہ

میں نے صورت مافوق میں یہ شعر "یادگارِ غالب" کے حوالے سے دیا ہے۔

تصدیق مرزا غالب کے ایک اور بچپن کے دوست لالہ کنھیّا لال، ساکن آگرہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر حالی نے بحوالۂ منشی بہاری لال مشتاق کیا ہے۔ لالہ کنھیّا لال کا بیان ہے کہ مرزا نے پتنگ بازی کے زمانے میں[۲] ایک اردو مثنوی لکھی تھی۔ اس مثنوی کی تحریر کے وقت ان کی عمر آٹھ نو برس کی تھی۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے مرزا غالب کے اپنے فارسی شعر اور لالہ کنھیّا لال کے بیان کے مطابق غالب کی اردو شعرگوئی کا آغاز ۱۸۰۶ سے قرار دینا بعید از صحت نہ ہو گا۔

۱۸۰۸ کا بیان ممکن ہے کہ فارسی شعرگوئی کے آغاز کے متعلق ہو لیکن اس کی ایک اور تشریح بھی ممکن ہے جو میں ابھی بیان کروں گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸۰۶ میں مشقِ سخن شروع کرنے کے باوجود مرزا نے ۱۸۰۸ اور ۱۸۱۲، دو اور تاریخیں کیوں دی ہیں؟ میرا اپنا قیاس ہے کہ یہ اختلاف غالب کے کسی سہو کی وجہ سے نہیں ہؤا (اور سات برس کے فرق کا سہو یوں بھی ذرا بعید از فہم ہے، جب کہ چالیس چالیس پچاس پچاس برس کے عرصے کے متعلق مرزا کا حساب خاصا درست ہوتا ہے)، بلکہ یہ تاریخیں مقرر فرمانے میں ہر مرتبہ اپنے کلام کا کوئی خاص پہلو یا کیفیت ان کے پیش نظر تھی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ آٹھ سے دس سال کی عمر تک کے اشعار کی خامی اور پستی کا احساس مرزا کو قدرۃً سنِ بلوغ سے بہت پہلے ہو گیا ہو گا، اس لیے انھوں نے لڑکپن ہی میں (بھوپال کے نسخے کی کتابت سے بہت پہلے) ان اشعار کو پتنگ بازی

۱۔ یادگارِ غالب، صفحہ ۹۷، حاشیہ۔

۲۔ یہ اشارہ لڑکپن کی پتنگ بازی کی طرف ہے، ورنہ منشی شیونرائن آرام کے نام غالب کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیس بیس برس کی عمر تک پتنگ بازی کا شغل جاری تھا۔

والی مثنوی کی طرح اپنے محفوظ کلام سے خارج کر دیا ہو گا۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو نسخۂ حمیدیہ کے لیے صرف وہی اشعار محفوظ رہ سکے جن کی تصنیف ۱۸۰۸ سے ۱۸۲۱ تک ہوئی۔ چنانچہ آٹھ برس کی عمر تو مرزا کے ذہن میں محفوظ رہ گئی، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ان کے پیش نظر رہی کہ انھوں نے عمر کے صرف گیارھویں سال سے اپنا کلام فراہم کیا۔

عمر کے پندرھویں سال (۱۸۱۲) کے متعلق غالب کا بیان اپنے لفظی مفہوم کے اعتبار سے قطعاً" ناقابلِ قبول ہے اور اس کی وجہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، لیکن ۱۸۱۲ کو غالب کی زندگی میں ایک اَور لحاظ سے خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس سال کے آغاز سے چند مہینے پیشتر مُلّا عبدالصمد (ہرمزد) ایران سے بسبیلِ سیاحت آگرہ پہنچا اور اس کے فیضِ صحبت کے صدقے میں مرزا کی نظروں کے سامنے فارسی زبان دانی اور فارسی کے ذوق کی ایک نئی دنیا کھل گئی۔ اِسی سال مرزا نے آگرے سے ہجرت کر کے دلّی کی سکونت اختیار کر لی۔ اس خیال کے لیے متعدد شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن سب سے واضح ثبوت وہ ہے جس میں غالب نے اپنے آگرے سے دلّی آنے کی تاریخ کے متعلق خود کہا ہے ۱۸۱۶ نہیں ۱۸۱۲ ہے۔ "کلیاتِ نثرِ فارسی" میں میر اعظم علی مدرّسِ مدرسۂ آگرہ کے نام ۱۸۳۲ کا لکھا ہوا ایک خط ہے جس میں یہ الفاظ ملتے ہیں:

"درازیِ زمانِ فراق کہ بگمانِ مخدوم شانزدہ سال است بدانستِ نامہ نگار کم از بست سال نیست"۔

اس کے بعد بھی وہ وقتاً" فوقتاً" آگرے جاتے رہے لیکن غالباً" ۱۸۱۶ کے بعد ان کا مستقل قیام دلّی ہی میں رہا۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

"مَیں پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی

لکھا کیا"

تو عجب نہیں کہ اس پندرھویں برس سے ان کا اشارہ مُلّا عبدالصمد کے فیضانِ تربیت یا دلّی کی سکونت اختیار کر لینے کے متعلق ہو۔ پچیس برس کی عمر کے ذکر سے یہ گمان زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ ۱۸۲۲ میں غالب نے عمر کا پچیسواں سال پورا کیا لیکن اس سے چار پانچ سال پہلے ان کی زبان صاف ہو چکی تھی اور خیالات خوب نکھر چکے تھے۔ "پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی" لکھنے کا مطلب اگر کچھ ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو اس سال یعنی ۱۸۲۲ کے قریب مرزا نے اپنے دوست مولانا فضل حق کے مشورے سے اپنے مُغلق اشعار کو نظری قرار دے کر اپنا دیوانِ ریختہ پہلی مرتبہ مرتّب کیا اور یا یہ کہ اِس سال کے قریب ریختہ گوئی ترک کرکے فارسی زبان کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگے۔ اِس صورت میں مرزا کے اِس فقرے کا مطلب یہ ہوگا کہ دلّی کی سکونت اختیار کرنے سے دس سال بعد تک جب فارسی میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ الخ' اِن دونوں صورتوں کے علاوہ "پچیس برس کی عمر" کی کوئی اور تاویل ذہن میں نہیں آ سکتی کیونکہ اگر پچیس برس کی عمر تک کا کلام ان کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے: "دس پندرہ اشعار واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے" نسخۂ حمیدیہ میں صرف غزلوں کے اشعار ۱۸۸۳ ہیں اور ان میں سے نصف کے قریب اشعار مروجہ دیوان میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے کہ "مضامینِ خیالی" کا وہ "بڑا دیوان" جس میں سے صرف دس پندرہ شعر باقی رہنے دیئے گئے، کوئی ابتدائی مجموعہ ہوگا جس کے اوراق "یک قلم چاک" کیے گئے۔

آخر میں تبدیلِ تخلّص کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ اس پر خود مرزا غالب نے ایک خط میں روشنی ڈالی ہے۔ شیونرائن آرام کو لکھتے ہیں:

"میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے' ورنہ
غالب ہی لکھتا رہا ہوں"۔

خوب چند ذکا نے "عیار الشعرا" میں جہاں مرزا غالب کو "ساکنِ اکبر آباد" بتایا ہے' وہاں ان کا تخلص غالب بتایا ہے۔ اس سے قطع نظر غالب کے کلام میں بھی یہ شہادت مل جاتی ہے کہ دلّی چلے آنے سے پہلے نیا تخلص اختیار کر چکے تھے۔ مثلاً" یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوّابی کرے

اِس شعر سے یہ صاف ظاہر ہے کہ غالب ابھی مستقل طور پر دلی نہیں آئے ورنہ بادشاہِ دہلی کا ذکر اس بے نیازی سے نہ کرتے۔ غالباً" یہ مان لینے میں کوئی غلطی نہ ہو گی کہ مرزا صاحب ۱۲-۱۸۱۱ میں غالب تخلّص اختیار کر چکے تھے۔

۴

مباحثِ ماسبق سے ہم اِس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ مرزا غالب نے ۱۸۰۶ میں جب ان کی عمر آٹھ نو برس کے قریب تھی' اردو میں مشقِ سخن شروع کی لیکن عجب نہیں کہ ابتدا میں دو برس کا کلام غالب نے محفوظ نہ کیا ہو یا شروع شروع ہی میں تلف کر دیا ہو۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سنجیدہ اور (لڑکپن کے زمانے کے لیے) نسبتہً" پختہ غزل گوئی' جس کے ساتھ اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس شامل ہو گیا تھا' غالب نے عمر کے دسویں سال میں' ۱۸۰۷ - ۱۸۰۸ کے قریب شروع کی۔ ۱۸۰۷ - ۱۸۰۸ کے بعد کا کلام یا اس کا بیشتر حصّہ "نسخۂ حمیدیہ" میں محفوظ ہے۔ مگر "نسخۂ حمیدیہ" میں بہت سی

غزلوں کے اندازِ بیان اور اسلوبِ فکر میں اس قدر تفاوت ہے کہ ان کے متعلق حتمی طور پر یہ کہہ دینا آسان کام نہیں ہے کہ فلاں غزل بالکل ابتدائی زمانے کی اور فلاں کسی قدر بعد میں یا ۱۸۲۱ کے قریب کی لکھی ہوئی ہے۔ اِس موقع پر خود مرزا غالب نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی کلام کے نمونے کے طور پر جو دس پندرہ اشعار چھوڑے ہیں' ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ شروع میں ان کا اندازِ سخن کیا تھا۔ مثلاً" ان میں سے یہ دو شعر دیکھیے:

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اِن اشعار کو متداول دیوان میں دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ غالب کو اپنی معنوی اولاد کے اس حصّے سے بھی کچھ نہ کچھ الفت ضرور تھی۔ بصورتِ دیگر ان کے نمونے کو اپنے دیوان میں ہمیشہ کے لیے زندہ چھوڑ جانا شاید گوارا نہ ہوتا۔ قیاس چاہتا ہے کہ جن دس پندرہ اشعار کو غالب نے زندہ رکھنا گوارا کیا ہے' وہ ان کے اس عہد کے کلام کا ذرا بہتر نمونہ ہوں گے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ "نسخۂ حمیدیہ" میں ان شعروں سے کہیں زیادہ ادق کلام موجود ہے۔ اِس اِغلاق کی نوعیت کو ہم سمجھ جائیں تو یہ کہنا کسی حد تک ممکن ہو جاتا ہے کہ جن غزلوں میں اس کیفیت کا ظہور خصوصیت سے زیادہ یا نمایاں طور پر کم ہے' وہ ابتدا کی یا بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔

اس دور کے اشعار کی سب سے نمایاں خصوصیت شاعر کا اندازِ مشاہدہ ہے۔ اسے خارجی موجودات سے بحیثیت خارجی موجودات کے دلچسپی ہے۔ اس اندازِ مشاہدہ کی

نسبتہ" قابلِ فہم مثالیں اِس قسم کے اشعار ہیں :

شفق بہ دعویٔ عاشق گواہِ رنگیں ہے
کہ مادہ دُزد حنائے کفِ نگاریں ہے
عیاں ہے پائے حنائی سے پرتوِ خورشید
رکاب روزن دیوار خانۂ زیں ہے
بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبل زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اس آخری شعر کا صرف دوسرا مصرع ابتدائی دور کے مشاہدے کی خارجیت کا نمونہ ہے۔ مصرعِ اولیٰ میں ایک خیال کا بیان ہے اور اِس خیال کو دوسرے مصرعے کے واقعے سے ربط دیا گیا ہے۔ خیال اور واقعے کا یہی ربط پہلے دور میں کم یاب ہے۔ اس دور میں بالعموم واقعہ موجود اور خیال غائب ہوتا ہے یا اگر خیال موجود ہو تو اتنا ہلکا اور بے وزن کہ اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اس انداز میں صاف مضمون کے شعر بھی ہیں جہاں مشاہدے کی خارجیت برقرار رہتی ہے' جیسے اِس شعر میں :

عکسِ گل ہائے سمن سے چشمہ ہائے باغ میں
فلسِ ماہی آئنہ پردازِ داغِ ماہ ہے

ایک دوسرا شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں واقعے کے بیان پر خیال کا پردہ اتنا باریک ہے کہ نظر نہیں آتا:

بہرِ پروردن ' سراسر لطف گستر سایہ ہے
پنجۂ مژگاں بہ طفلِ اشک دستِ دایہ ہے

بالعموم ان مشاہدات میں اس قسم کی باریک بینی اور موشگافی ہوتی ہے کہ اس کا استعمال

شعر کے بجائے کسی سائنس کی کتاب میں زیادہ موزوں معلوم ہوتا۔ اس عہد میں غالب کے کلام کا مجموعہ مشاہدات اور اِدھر اُدھر کے متفرق اشارات کی نوٹ بک معلوم ہوتا ہے:

بسکہ زیرِ خاک با آبِ طراوت راہ ہے
ریشے سے ہر تخم کا دَلو اندرونِ چاہ ہے
بہ فکرِ حیرتِ رم آئنہ پرواز زانو ہے
کہ مشکِ نافہ تمثالِ سوادِ چشمِ آہو ہے

ہَوا چرخِ خمیدہ ناتواں بارِ علائق سے
کہ ظاہر پنجۂ خورشید دستِ زیرِ پہلو ہے
ربطِ تمیز اعیاں دُردِ مئے صدا ہے
اعمیٰ کو سرمۂ چشم آواز آشنا ہے

یہ غالباً ۱۸۱۵ سے پہلے کے شعر ہیں۔ اس کے بعد بھی ذوقِ مشاہدہ کا یہ انداز قائم رہا مگر خیال اور تشبیہ کا تناسب اب صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔ ایک غزل کا جو غالباً ۱۸۱۵ اور ۱۸۲۱ کے درمیان لکھی گئی ہے، ایک شعر ہے:

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہُوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہَوا ہو جانا

اِسی قسم کا ایک اس سے بہتر شعر اِسی غزل میں موجود ہے:

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کُھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

دورِ اول میں ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں جن کا باوجود اس خارجی موجودیت کے، واضح میلان معنویت کی طرف نظر آتا ہے:

عذارِ یار نظر بندِ چشمِ گریاں ہے
عجب کہ پرتوِ خور شمعِ شبستاں ہے

بیمِ طبعِ نازکِ خوباں سے وقت سیرِ باغ
ریشۂ زیرِ زمیں کو بھی دویدن منع ہے

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

دراصل، اس عہد میں غالب کا تخیل اپنی امتحانی سرگردانیوں میں مصروف ہے۔ اس کا تخیل انسانی مشاہدے کے میدان میں ہر سمت پرواز کر رہا ہے، اور جو چیزیں ظاہری طور پر منتشر اور متفرق ہیں، ان کے درمیان کسی ربط اور یگانگت کا پتا چلا رہا ہے۔ وہ بُعد المشرقین سے چیزوں کو اٹھا کر آپس میں اس بے تکلفی سے بانٹ دیتا ہے کہ حیرت سے ہمارا سر چکرا جاتا ہے۔ اِس نومشقی کے عالم میں بھی کبھی کبھی وہ بے تعلق حقائق کو اِس چابک دستی سے مربوط کر دیتا ہے کہ اس کی تحریر شاعرانہ حسن سے عاری نہیں رہتی؛ مثلاً" یہ شعر دیکھیے:

وحشت بہارِ نشہ و گل ساغرِ شراب
چشمِ پری شفق کدۂ راز ہے مجھے

یا یہ شعر:

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سرو سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

دورِ اول کا یہی موجودی اور خارجی نقطۂ نظر پختگی کے دور میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا باعث ہوا۔ بیسویں صدی میں غالب کی مقبولیت کی ایک وجہ یہی ہوئی کہ اس کا پختہ کلام ایک خاص قسم کی موجودیت سے لبریز اور خارجی دنیا کے ساتھ گہرے تعلق پر مبنی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ غالب کے طرز مشاہدہ میں اب بھی ایک خاص بات ایسی ہے جس نے بعد میں اس کے کلام کو ایک امتیازی رنگ دیا۔

سائنٹیفک مشاہدے کی خصوصیت یہ ہے کہ مشاہدہ کرنے والا زیرِ مشاہدہ چیز میں اپنے ذاتی میلانات یا خیالات کو دخیل نہ ہونے دے بلکہ اپنی ذات کو زیرِ مشاہدہ شے سے الگ کر کے مشاہدہ کرے، خواہ وہ اپنے نفس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ ہو۔ غالب کے مشاہدے میں یہی خاص بات ہے کہ وہ اپنی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے نفس کو الگ رکھ دیتا ہے۔[1]

اس انداز مشاہدہ کے بعد جو دوسری خصوصیت سب سے زیادہ قابلِ توجہ معلوم ہوتی ہے، وہ غالب کی تشبیہات و استعارات کی ندرت ہے اور یہ بالکل قدرتی ہے۔ جو شاعر اپنے مشاہدے کا انوکھا پن برقرار رکھنے پر مُصر ہے، اس کی تشبیہات جو اسی مشاہدے سے ماخوذ ہیں، خودبخود انوکھی ہوں گی۔ مثلاً" غنچے کو کسی حسین پیکر سے تشبیہ دی ہے:

۱۔ میری رائے ہے کہ غالب کی موجودہ ہر دل عزیزی کی ایک بڑی وجہ، اس کے مشاہدے کی یہی سائنٹیفک خصوصیت ہے۔

بہار در گرد غنچہ شہر جولاں ہے
طلسم ناز بجز تنگی قبا معلوم

جہاں کوئی پیش پا افتادہ تشبیہ دی ہے، وہاں اس کے استعمال میں جدّت پیدا کی ہے:

محیط دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

ایک خیالی تشبیہ ملاحظہ فرمایئے جو لطف سے خالی نہیں:

پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرواز سے
ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

اسی انداز میں یہ تشبیہات ہیں:

کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں

پھر شیشے سے عطر شرر سنگ نکالوں

پسینہ توسن ہمت کا سنبل خانۂ زیں ہے

اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی[1]

(تحریر: ۱۹۳۷)

۱۔ اچھی اور نادر تشبیہ نکل آتی ہے۔

غالب اور بیدل

اورنگ زیب عالمگیر کا سالِ وفات جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا، اُسی طرح فارسی زبان بھی مسلمانوں کی مسلّمہ ادبی زبان کی حیثیت سے دراصل عالمگیر کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی۔ دلّی اور ملحقہ علاقوں میں عوام نے تو غالباً شاہ جہاں کے عہد ہی سے روزمرّہ کی بات چیت میں اُردو (یا اس زمانے کی اصطلاح کے مطابق "ہندی") کا استعمال شروع کردیا تھا لیکن کم از کم ۱۷۰۷ تک بادشاہ اور عمائد و شرفاء یقیناً فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات سے کچھ عرصہ بعد بادشاہ و امراء نے بلاتکلف اردو میں گفتگو کرنے کی طرح ڈال دی۔ سب سے پہلے شاید محمد شاہ "رنگیلے" نے اس "غیر سرکاری" طریقے پر اردو کی سرپرستی شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے پایۂ تخت اور اس کے نواح میں اردو شاعری کا آغاز محمد شاہ کے عہد سے ہوا۔ چنانچہ ولی نے دکن سے آکر چند ہی سال میں اپنے "ریختے" یعنی "ہندی" غزل گوئی سے دلّی کو مسخّر کرلیا:

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہے کوئی محمّد شاہ سوں

جب دربار میں اِس نئی شاعری کی قدر افزائی ہوئی تو دلّی کے گلی کوچوں نے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس کا خیرمقدم کیا۔ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کے پچاس سال بادشاہ کے زہد و تقشّف کی وجہ سے غزل گوئی اور سخن سنجی کے لیے خاص طور پر سازگار نہ تھے۔ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخت نشین ہونے سے قبل عالمگیر اچھے شعر سے لطف اندوز ہونا اپنے لیے باعثِ عار نہ سمجھتا تھا تاہم اُس وقت بھی شعر و شاعری سے اس کے ذوقِ عمل اور جوشِ تقویٰ کی بیزاری اس حد تک معروف ہو چکی تھی کہ اس کے مقربینِ بارگاہ اس کے سامنے اپنے شاعرانہ کمال کا اظہار اپنے لیے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے ایامِ شہزادگی کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ اثنائے شکار میں جب نواب عاقل خاں نے اپنا یہ شعر اس کے سامنے پڑھا:

عشق چہ آساں نمود، آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود، یار چہ آساں گرفت!

اور عالمگیر نے اس شعر پر دیر تک وجد کرنے کے بعد پوچھا کہ کس کا شعر ہے؟ تو عاقل نے جواب دیا: "ایک ایسے شخص کا جو بندگانِ حضور کے سامنے شاعر کے نام سے موسوم نہیں ہونا چاہتا۔" تقریباً نصف صدی بعد جب صاحب "مرأۃ الخیال" نے عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں اپنا تذکرہ شعراء مرتّب کرنا شروع کیا تو دورِ عالمگیری کے آغاز کی تصویر اِن دلچسپ الفاظ میں کھینچی:

"اُس کے دَورۂ عدل کی ہیبت سے حسینوں کا خالِ کافرکیش محرابِ ابرو میں مصروفِ نماز ہوگیا اور اُس کے محکمۂ قضا کے دبدبے سے خوش جمالوں کے غمزۂ خوں ریز کو حجرۂ چشم میں چلّہ نشیں ہونا پڑا۔"

یہ چلّہ کشی پوری نصف صدی تک جاری رہی۔ آخر ۱۷۱۹ میں اس پنجاہ سالہ

سکوت و جمود کا ردِّعمل شروع ہوا۔ "رنگیلے پیا" اورنگ زیب کی وفات کے بارہ سال بعد سریر آرائے سلطنت ہوئے اور انھوں نے گزشتہ نصف صدی کی قاعدہ شناسیوں اور اصول نوازیوں کا طلسم خوب دل کھول کر توڑا۔ عوام نے قدرۃ" بے حد جوش و خروش سے دلّی کی شاعری کا خیر مقدم کیا۔ ساٹھ ستّر سال کی پابندیِ نظم و ضبط کی وجہ سے ان کے جذبات اپنے اظہار کے لیے گھبرائے ہوئے تھے۔ ولی ایک موزوں نفسیاتی موقع پر ولی میں وارد ہُوا اور اس نے ان کے بے تاب جذبات کے لیے ایک نہایت دل پذیر ذریعۂ اخراج مہیا کیا۔ نئی زبان کی شاعری جس سرعت سے مقبول ہوئی اس کی تہہ میں یہی راز تھا اگرچہ اس عہد کی فارسی شاعری کی روش بھی شاید ایک حد تک اس انقلاب کی ذمہ دار تھی۔ بہرحال ریختہ گوئی کی مقبولیت کی رفتار نہایت حیرت انگیز ثابت ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارھویں صدی کے وسط تک اردو کی حیثیت بہ لحاظ ایک ادبی زبان کے قطعی طور پر مسلّم ہوگئی۔

ولی اور اس کے مقلّدین (ادبی حیثیت سے) گویا اردو زبان کی تخلیق کر رہے تھے۔ اس لیے قدرۃ" ان کی توجہ زبان کے مانجھنے اور اردو میں فارسی کے مقابلے کے لیے اسالیبِ اظہار فراہم کرنے پر بہت زیادہ مبذول تھی۔ زبان و بیان کو زیادہ اہمیت دینے کی یہ روایت میر و سودا کے توسّط سے اُنیسویں صدی تک قائم رہی اور اس کا منطقی نتیجہ ذوق کی شاعری کی صورت میں رونما ہوا جس کی غزل میں حسن و صفائے بیان اور قصیدے میں شکوہِ الفاظ و قدرتِ کلام بجائے خود ایک قیمت رکھتے ہیں، خواہ ان کی تہہ میں کتنا ہی کمزور خیال یا بے رنگ جذبہ کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے شاعر میرؔ کمالِ فن یہ ہے کہ اس کے کلام میں جذبے اور اظہار کا نہایت لطیف توازن قائم ہے اور اس کے بہتر اشعار میں یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ

اس نے اِن دونوں میں سے کسی ایک کو غیر متناسب اہمیت دی ہے۔ جب اُنیسویں صدی کا آغاز ہُوا تو فنِ ریختہ کے کُہنہ سال استاد میر کے شاعرانہ کمال کے صدقے میں سادگی اور سلاست کے متعلق ولی کی قائم کی ہوئی روایت اردو ادب کی دنیا میں کامل طور پر تسلیم کی جاچکی تھی۔

اردو شاعری کی اس نوخیز روایت کے ساتھ ساتھ ایک اور ادبی مسلک بھی موجود تھا جس کا انداز اردو کی سلامت روی اور سلاست پسندی سے بُعد قطبین رکھتا تھا۔ یہ فارسی کے متاخّرین شعرا کا مسلک تھا جس کے مطابق سخن آرائی میں تکلف آمیز نازک خیالی اور جدّت طرازی معیارِ کمال سمجھی جاتی تھی۔ فارسی شاعری اب اپنے دورِ سادگی کو عرصہ ہُوا پیچھے چھوڑ چکی تھی اور گزشتہ نصف صدی سے دراصل اپنے ضعف و زوال کی اُس منزل میں داخل ہوچکی تھی جسے مغربی فن کی اصطلاح میں "Rococo" کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس کیفیت کو "ضنائع و بدائع" سے تعبیر کیا جائے تو شاید وہی مطلب ادا ہوسکے۔ ولی کے فارسی گو معاصرین میں مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی سرہندی اِس طرزِ شاعری کے سب سے بڑے استاد تھے۔

غالب کے متعلق سب سے پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ اس کا سلسلۂ نسب براہِ راست فارسی گو شعرا سے ملتا ہے۔ ولی اور میر کی نسل سے، کم از کم اپنے پہلے دور میں، اسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے گویا یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میر کے نام کا بھی کوئی شخص ہو گزرا ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں فارسی اور ہندوستانی ادب کے درمیان جو خلیج قائم کی گئی تھی اور جسے اسّی نوّے سال کی شاعرانہ کاوشوں نے ناقابلِ عبور حد تک وسیع کردیا تھا، غالب اپنے ظہور کے ساتھ ہی بلاتکلف اسے پاٹنے کی فکر میں مصروف نظر آتا ہے۔ اورنگ زیب کی

وفات کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۸۰۷ میں، وہ ایک صدی کی اُلٹی زقند لگا کر وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں عہدِ اورنگ زیب کے حصہ آخر کے شعرا کھڑے تھے۔ ریختہ گو شعرا نے فارسی سے کٹ کر جو الگ راہ نکالی تھی اس پر چلنے کا خیال تک اسے نہیں آتا۔ وہ اردو میں شعر لکھتا ہے مگر اردو اور فارسی میں کوئی خاص امتیاز نہیں کرتا۔ دراصل محمد شاہی دور کے بعد پہلی مرتبہ اردو کے ایک شاعر نے یہ کوشش کی کہ ریختے کی ایک صدی کو فراموش کرکے براہِ راست فارسی سے رشتہ جوڑنے کا ڈھنگ نکالے اور ریختہ گو شعرا کی روایات سے قطع نظر کرکے فارسی شعراء کے دوش بدوش کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا بارور ہونا ممکن نہ تھا اور اس کا اقدام کوئی ناتجربہ کار اور بے حد پُرجوش نوجوان ہی کرسکتا تھا۔ وہ شاعرانہ روایت جو ایک سو سال کی سخن پردازیوں کا ماحصل تھی ایک طفلِ ناآموزوہ کار کی مُدّعیانہ للکار کو خاموشی سے نہیں سن سکتی تھی، چنانچہ غالباً ۱۸۱۵[1] میں غالب کو بھی نپولین کی طرح واٹرلو کا معرکہ پیش آیا۔ اس نے فیصلہ کن شکست کھائی اور اپنی شاعرانہ روش بڑی حد تک بدل ڈالی، لیکن اس شکست کے باوجود نوجوان شاعر کا سرِ غرور اردو کے سامنے بالکل جھک نہیں گیا۔ فارسی سے جو گہری روحانی مناسبت اس کو تھی وہ اپنے اظہار کے لیے مضطرب رہی جس کے باعث وہ اور پانچ چھ برس تک مختلف اطراف و جوانب میں اپنے نقادوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اِس مدّت کے خاتمے پر (یعنی ۱۸۲۱ کے قریب) روز روز کی

۱۔ غالب کی شاعری کے پہلے اور دوسرے دور کی تاریخوں کے تعین کے متعلق مجھے ڈاکٹر سید عبداللطیف اور شیخ محمد اکرام سے شدید اختلاف ہے۔ مگر اس کی شرح جو بہت زیادہ تفصیل کی محتاج ہے میں کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

اس چپقلش سے تنگ آکر، اس نے اپنی عنانِ تخیل ریختہ گوئی کے میدان سے ایک حقارت آمیز انداز کے ساتھ بظاہر ہمیشہ کے لیے پھیرلی۔ یہ عزم آخر تک قائم نہ رہ سکا۔ تقریباً تیس سال بعد، یعنی ۱۸۵۰ میں دربار بہادر شاہ کے ساتھ تعلق قائم ہوجانے پر، غالب نے دوبارہ اردو میں شعر کہنا شروع کیا اور اس میں وہی تبدیل شدہ انداز جاری رکھا جو ابتداء ۱۸۱۵ کے قریب اختیار کیا تھا۔ تاہم یہ تغیر اتنا انقلاب انگیز نہیں تھا، نہ ہی ہوسکتا تھا کہ دورِ اول کی باتیں ایک فراموش شدہ کہانی بن جاتیں۔ اردو زبان کی روایات اب غالب کے نزدیک قابلِ احترام ضرور تھیں مگر فارسی کے ساتھ اس کے گہرے لگاؤ کا احساس ہمیشہ ان کے ساتھ شامل رہا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی فارسی کی طرف غالب کی بازگشت رائیگاں نہیں گئی۔ اٹھارویں صدی میں جس سرعت کے ساتھ فارسی ہمارے احساس و تخیل کی سرزمین سے نابود ہورہی تھی، اس کو روک دینا غالب ہی کے زبردست ہاتھ کا کام تھا۔ اگر ولی، میر، ذوق اور داغ کا سلسلہ غالب کے ظہور سے برہم نہ ہوتا تو ہمارے عہد کا اردو ادب اپنے موجودہ انداز سے یقیناً مختلف ہوتا۔

الغرض غالب کی پہلے دور کی اردو شاعری کے مطالعے میں شروع ہی سے یہ قرار دے لینا چاہئے کہ ہم دراصل فارسی شاعری کی ایک خاص شکل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس دور کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں ہندی کا ایک بھی لفظ شامل نہیں ہوتا۔ مثلاً:

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کنِ یک خلق! تغافل تاچند؟

لیکن جن اشعار میں ہندی کا کوئی لفظ اتفاق سے آبھی جاتا ہے ان میں بہت سے ایسے

ہیں جن میں فارسیت کی روح دراصل پہلی قسم کے اشعار سے بہت زیادہ حلول کیے ہوئے ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا شعر کو تو اردو شاید قبول کرنے پر تیار ہو بھی جائے مگر ذیل کے مشہور شعر کو اردو زبان کا نام دینا بہت بڑا تجاوز معلوم ہوتا ہے:

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل، پسند آیا

یا یہ شعر دیکھیے:

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل
یاں پرِ پرواز رنگِ رفتہ بال تیر ہے

صرف یہی نہیں کہ ان اشعار کے صوری عناصر کی تعمیر فارسی زبان نے کی ہے بلکہ جس طرزِ تخیل پر ان کی بنیاد قائم ہے وہ انھیں میر اور اس کے مقلدین کے بجائے دورِ عالمگیری کے فارسی شعرا کی روایت سے براہ راست وابستہ کردیتا ہے۔ ان شعرا میں بیدل عظیم آبادی سب سے زیادہ ممتاز تھا چنانچہ مرزا غالب نے لڑکپن میں اسیر و شوکت کے علاوہ بیدل کے مطالعے اور تقلید پر خصوصیت سے زور دیا۔

مگر اس کی سند کے طور پر خود غالب کا بیان مکاتیب میں موجود ہے اور تقریباً تمام نقادوں کو جن میں حالی اور شبلی جیسے مشاہیر بھی شامل ہیں، اس سے اتفاق ہے کہ ابتدائی دور میں غالب کے نزدیک بیدل کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی شاعری کی معراجِ کمال تھی:

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بہ کف اسد
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

جہاں تک مجھے علم ہے، صرف مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں

اس حقیقت سے ایک حد تک اختلاف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"وہ (یعنی مرزا غالب) بیدل کی تقلید میں نازک اور بلند مضامین پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن نہ دماغی قویٰ نے بلوغ حاصل کیا تھا' نہ اندازِ بیان پر پوری قدرت و دستگاہ حاصل ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ بیدل کے خاص الفاظ و تراکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے اپنے ذہن میں بیدل کی پیروی سمجھتے تھے' جس طرح آج کل کے بعض فرومایہ اور کورذوق اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافتوں کے مُسرفانہ استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے...."

لڑکپن میں مرزا غالب کے تخیّل اور قوتِ بیان کی ناپختگی بہ ہر نوع مسلّم ہے لیکن دورِ اول میں بیدل کے ساتھ ان کی مماثلت اِتنی سطحی اور اتفاقی بھی نہیں ہے جتنی اس عبارت کے حصۂ آخر سے مترشّح ہوتی ہے۔ میری رائے میں تخیّل کے ایک بنیادی عنصر کا اشتراک اس امر کا باعث ہُوا کہ شروع ہی میں (میر کے بجائے) بیدل کے کلام نے غالب کو اپنی طرف کھینچا۔

تحلیل و تجزیہ غالب کے تخیّل کا ایک ایسا مستقل لازمہ ہے کہ بیدل کے خاص اسلوبِ بیان کی تقلید ترک کردینے کے بعد بھی اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جس حد تک شعر کی محض فنی کیفیتوں (مثلاً انتخاب و نشستِ الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ساخت) کا تعلق ہے غالب کے ابتدائی اشعار اور بیدل کے کلام کے ایک بہت بڑے حصے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس مشابہت کی شرح مَیں یہاں کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔

دنیا میں شاید کسی قوم کا ادب ایسا نہیں جس کا آغاز نظم سے نہ ہُوا ہو اور یہ نظم

ابتداءً سادگیٔ خیال سے ممتاز نہ رہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں شاعر کو کسی جذبے یا خیال کے تجزیے سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے واضح اور نمایاں پہلو کو بحیثیت ایک غیر منقسم کُل کے دیکھتا ہے اور الفاظ میں اسی کی تعبیر کردیتا ہے۔ ادب کے ارتقاء کے ساتھ تخیّل کی یہ ترکیبی[1] کیفیت گھٹنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ نثر پیدا ہوجاتی ہے جو تحلیل و تجزیہ کا مخصوص ذریعۂ اظہار ہے اور خود شعرا کی نگاہ بھی اشیا و واردات اور جذبات و خیالات کے تحلیلی پہلوؤں پر زیادہ اٹھتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اِس دور میں بدیہی حقائق کے بجائے نکات کے بیان پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ سعدی و حافظ اور عرفی و غالب کی غزلیات میں ترکیبی اسلوبِ بیان کا عروج و زوال بڑی خوبی سے نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ مولانا حالی نے مقدمۂ دیوان میں سعدی، حافظ اور غالب کا ایک ایک شعر دیا ہے۔ تینوں شاعروں نے مصیبت و ابتلا کی تصویر ایک بحری تشبیہ کے ذریعے سے کھینچی ہے لیکن تینوں تحلیل و تجزیہ کے عنصر میں بتدریج اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں:

۱۔ "ترکیبی" کے بجائے شاید لفظ "بدیہی" کا استعمال بھی ممکن تھا مگر بدیہی میں جو شائبۂ استخفاف پایا جاتا ہے اس کو ترکیبی شاعری سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جس طرزِ بیان کو ہم سادہ، یا بدیہی کہتے ہیں اس میں حقیقۃً ذہنی طور پر ترکیب کا عمل واقع ہوتا ہے لیکن یہ عمل غالباً وجدانی ہے، ارادی نہیں۔

سعدی

از ورطۂ ما خبر ندارد
آسودہ کہ بر کنارِ دریاست

حافظ

شب تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

غالب

ہَوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خُفتہ است

فارسی شاعری کے ابتدائی دور میں تخیّل کی ترکیبی ہیئت نہایت وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً رودکی کا جو مشہور قصیدہ امیر نصرالدین سامانی کی مدح میں ہے' اس کو وہ یوں شروع کرتا ہے:

بوئے جوئے مُولیاں آید ہمی — یادِ یارِ مہرباں آید ہمی
اے بخارا' شادباش و شاد زی — میر روزے شادماں آید ہمی

میر ماہ است و بخارا آسماں — ماہ سوئے آسماں آید ہمی
میر سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید ہمی

شروع کے دو شعروں میں تزئین و تشریح کے بغیر اصل واقعے کو بیان کردیا ہے اور

حسنِ کلام کا مدار اظہار کی صداقت اور برجستگی پر رکھا ہے۔ باقی دو شعروں میں آسمان اور باغ دونوں ایسی ظاہر و باہر چیزیں ہیں اور چاند اور سرو کے ساتھ ان کا تعلق اس قدر کھلا ہوا ہے کہ شاعر کے مضمون سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمارا ذہن تحلیل و تجزیہ کی کسی منزل سے نہیں گزرتا۔ رُودکی کے بعد سعدی و حافظ تک شاعرانہ تخیل کی یہ ترکیبی کیفیت قائم رہی۔ یہ دونوں کسی واقعے یا جذبے کے محض واضح اور روشن پہلو کا پُر اثر بیان کردیتے ہیں اور اگر اس سے بڑھتے ہیں تو اپنے موضوع کے ساتھ کسی مانوس حقیقت کو مشابہ قرار دے کر سیدھی سادھی تشبیہ کے ذریعے سے اپنے بیان میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ سعدی کے دو مشہور شعر ہیں :

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در بازار
وقت آن نیست کہ درخانہ نشینی بے کار
بلبلاں وقت گل آمد کہ بنالند از شوق
نہ کم از بلبل مستی تو بنال اے ہشیار!

یہاں ہمارے لیے ایک خاص صورتِ حال نہایت دل نشیں پیرائے میں مگر بغیر کسی قسم کی حاشیہ آرائی اور موشگافی کے بیان کردی گئی ہے۔ اسی طرح سعدی کی غزل میں تشبیہات کا لطف دیکھیے :

برود دلم در چمنے سروِ روانے
زرّیں کمرے ' سیم برے ' موئے میانے
خورشید وشے ' ماہ رخے ' زہرہ جبینے
یاقوت لبے ' سنگ دلے ' تنگ دہانے

ذرا سا غور کرنے پر معلوم ہوجائے گا کہ ان اشعار میں شاعر کے مشاہدے نے

خورشید و ماہ اور یاقوت و سنگ کو بحیثیتِ مجموعی لے لیا ہے۔ ہر چیز اس کے لیے ایک سالم اور مستقل وجود ہے۔ اس نے ان چیزوں کو ان کے اجزاء و عناصرِ ترکیبی میں تقسیم نہیں کیا۔ نہ ان کے بے شمار امکانی علائق کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ مثلاً یہ نہیں کہا کہ طلوعِ خورشید سے کسی مایوس شب زندہ دار کے دل کو جو کیفیتِ تسکین و اطمینان میسر ہوتی ہے وہی دیدارِ محبوب سے مجھے حاصل ہوجاتی ہے۔

حافظ میں دورِ تحلیل کے آغاز کی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے' تاہم اس کا بھی یہ خاص فن ہے کہ واقعات کو بالعموم مِن حیث واقعات ہمارے سامنے پیش کردیتا ہے اور شعری تاثیر کے لیے واقعے کے باریک تر پہلوؤں کی تصویر کشی پر انحصار نہیں کرتا:

حافظِ خلوت نشیں دوش بہ مے خانہ شد
از سرِ پیماں گزشت بر سرِ پیمانہ شد

ہزار جہد بکردم کہ یارِ من باشی
قرار بخشِ دلِ بے قرارِ من باشی

اس کے برعکس تحلیلی انداز میں جسے عام طور پر "نازک خیالی" کا نام دیا جاتا ہے' شاعر کو واردات و جذبات کی مرکّب ہیئت سے بحث نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہ گل کے بجائے مختلف اجزاء اور لطیف و نازک پہلوؤں پر پڑتی ہے اور انھی کے بیان کو وہ اپنا کمال سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس منزل میں شاعر خود اپنی شخصیت کا بھی تجزیہ کردیتا ہے اور وہاں عقل و جذبات کی کشمکش دیکھ کر اپنی مرکب و سالم شخصیت کو گویا مختلف اور متعدد شخصیتوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ مثلاً نظیری اپنے ایک بظاہر سیدھے سادھے شعر میں بھی اپنی روح کو دو قوتوں میں منقسم دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ بعض مسائل کو

جب میں عقل کے ذریعے سے حل کرنے لگتا ہوں تو ناکام رہتا ہوں لیکن وجدانِ عشق سے کام لیتا ہوں تو بہ آسانی منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ہوں:

چہ داند فہمِ کوتہ بال جولاں گاہِ شوقم را
کہ او راہِ دگر رفت است ومن جائے دگر دارم

اس شعر کے مصرعِ ثانی سے ایک لطیف نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل ابھی کہیں راہ ہی میں بھٹک رہی ہے مگر عشق ایک مقامِ خاص پر فائز ہوچکا ہے۔

عرفی کا شعر ہے:

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یکدم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

یہاں شاعر نے یہ نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر انسان اپنے معائبِ ذاتی سے آگاہ ہونا چاہے تو یہ لازم ہے کہ اپنی فطرت کا جائزہ ایک بدگمان محتسب کی حیثیت سے لے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ شاعر کو انسان کی طبعی خود پرستی کا احساس ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر علانیہ طور پر اس قسم کے احتساب کی کوشش کی گئی تو انسان کی ہمدردیٔ نفس تاریک پہلوؤں کو عارضی طور پر پسِ پردہ رکھنے کے لیے فی الفور مستعد ہوجائے گی۔ اس لیے وہ لفظ "کمین" کے استعمال سے ایک مزید نکتہ پیدا کرتا ہے کہ یہ احتساب ناگہاں اور بلا اطلاع ہونا چاہیے۔

غنی کشمیری کا کلام بھی اسی تحلیلی اندازِ بیان کا نمونہ ہے۔ مثلاً وہ حصولِ شہرت کے اسباب کا تجزیہ کرکے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ شہرت طلبوں کے لیے ہنگامہ خیزی و غلغلہ اندازی ہی تنہا وسیلۂ کامرانی نہیں ہے بلکہ انتہائی عُزلت پسندی بھی باعثِ اشتہار ہوسکتی ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیرِ دامِ عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نامِ عنقا را

یہاں تک ہم نے زیادہ تر فکر و خیال کی تحلیلی کیفیت سے بحث کی ہے لیکن اس کا اثر قدرۃً طرزِ بیان کی نوعیت اور تشبیہات و استعارات کے انداز پر بھی پڑتا ہے۔ سعدی کی تشبیہات کے بعد نظیری و عرفی اور غالب و بیدل کی تشبیہات دیکھیں تو ترکیبی اور تحلیلی تشبیہ کا فرق خوب واضح ہوجاتا ہے۔ مثلاً نظیری نے ایک شعر میں امید و بیم کی کشمکش اور تذبذب کی شرح ایک اعجاز نما تشبیہ کے ذریعے سے کی ہے۔ درحقیقت یہ تشبیہ نہیں، ایک متحرک تصویر ہے:

بباد و برقم از احوال خویش در گفتار
کہ ابر در گزر و تخم در زمیں دارم

اسی طرح غالب نے حصولِ مراد کے طویل انتظار اور آخر کار قطعی مایوسی کی تصویر کو اپنے ایک پُرلطف مبالغے میں اِس طرح ظاہر کیا ہے:

دمید دانہ و بالید و آشیاں کہ شد
ور انتظارِ ہُما وام چیدنم بنگر!

بیدل کی تشبیہات و خیالات میں یہ تحلیلی انداز بے حد نمایاں ہے۔ مثلاً حیرت میں استفہام کا جو پہلو پایا جاتا ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اپنے مخصوص طرزِ بیان میں آنکھ کو کان سے مشابہ قرار دیتا ہے:

حسرت کمین مژدۂ اصلیست حیرتم
چشمِ بہم نیامدہ گوشِ فسانہ ایست

ایک نسبۃً صاف تشبیہ ہے:

کمش سر ز پستی کہ آوازِ آب
ترقّی بہ قدرِ تنزّل کند

اِس تمام بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ "ترکیبی" اور "تحلیلی" شاعری میں کس نوعیت کا فرق قائم ہے۔ تخیّل کی یہ "تحلیلی" کیفیت اگرچہ تمدن کی ترقی، لوازمِ معاشرت کی تدریجی نفاست و ارتقا اور سرمایۂ علم و حکمت کے اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے لیکن اس کے برعکس تہذیب و تمدن اور طرزِ بود و ماند کی "تحلیلی" نفاستوں کے ساتھ ہی لازماً "تحلیلی" شاعری کا فروغ نہیں ہوتا۔ اس طرزِ بیان کا ظہور، تمدن کے ارتقا کے علاوہ، ایک خاص شاعرانہ روایت کے ارتقا کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عہدِ مغلیہ کا تمدن ایک طرف تو سترھویں صدی کے شعراء سے اس قسم کے اشعار لکھوا چکا تھا:

تاک را سیراب کن اے ابرِ نیساں در بہار
قطرہ تا مے می تواند شد چرا گوہر شود؟ (دانش)

آنہا کہ بہ عقل از تو نشاں می طلبیدند
پیراہنِ مہتاب نمودند کتانہا (فوجی)

از زباں صورت نہ بندد رازِ احوالِ دروں
حلِ عقدِ موئے معنی شانہ کے داند کہ چیست (سوزی)

دلِ غم دیدۂ دارم مپرس از گردِ کلفتہا
صدا در کوہ چوں رگ ماندہ از سنگینیِ آہش (ناصر علی)

شبِ عید از خیالِ ابرویت گر بر فلک بینم
بداغم ناخنِ گردوں خلد چوں نیشِ عقربہا (شائق)

نہ شد آئینۂ کیفیتِ ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چوں معنی پچندیں لفظ پیدائی
بہ غفلت ساخت دل، تا وارہد از غیرتِ امکاں
چہا می سوخت ایں آئینہ گر می داشت بینائی (بیدل)

اور دوسری طرف اسی تمدن نے ریختہ گوئی کے آغاز میں ولی کی زبان سے کیفیتِ ذیل کے اشعار کہلوائے[1]:

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہے تیرے نین غزالاں سے کہوں گا
زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے
یہ زخم ترا خنجر و بھالاں سے کہوں گا

ریختے کا یہ "ترکیبی" اندازِ بیان اُنیسویں صدی کے آغاز تک قائم رہا جب ناگہاں غالب نے اپنے بازوئے ناآزمودہ کی پوری قوت سے اس کی بیخ و بنیاد پر وار کیا اور فارسی کے دورِ آخر کی "تحلیلی" روایت کو ریختے کے دورِ اول کے ساتھ بہ جبر ملادینا

۱۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ بیدل کے دو اردو شعر جو بذریعۂ میر ہم تک پہنچے ہیں اپنی گھلاوٹ اور انداز بیان کی صفائی کے لحاظ سے خود بیدل کے بجائے میر کے بہترین انداز کی یاد دلاتے ہیں۔ مضمون فلسفیانہ ہے اور نکاتِ بیدل کے مخصوص فلسفۂ بے خودی سے اسے بہت قریبی مشابہت ہے۔ پھر بھی بیدل کے فارسی انداز کی "بہار ایجادیاں" یہاں بالکل نظر نہیں آتیں۔ "نکات الشعرا" میں یہ دونوں شعر یوں مندرج ہیں:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کی آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

چاہا۔ حافظ کی طرح میر کے "ترکیبی" تخیّل کے ساتھ بھی دور تحلیل کی سرحد آملی ہے لیکن بڑی حد تک وہ دلی کی قائم کردہ روایت کا پابند ہے۔ میر کی واقعہ نگاری کا نہایت مصفا نمونہ یہ ہے:

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا مے خانے پر!
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشے اور پیمانے پر

تشبیہ کا پاکیزہ ترین انداز یہ ہے:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات؟
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا!

اس کے خلاف غالب شروع سے آخر تک اپنے اردو اشعار میں جا بجا اپنی "تحلیلی" مناسبتِ طبع کا ثبوت دیتا ہے:

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئنہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے
تکلّف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

ان چاروں شعروں میں غالب کی عمر کے چار مختلف منازل کے مطابق اس کے تحلیلی تخیّل کی تمام تدریجات نمایاں ہیں۔ لڑکپن کی ناپختہ کارانہ بیتابیٔ اظہار، عنفوانِ شباب کی رنگینیٔ جذبات، انتہائے بلوغ کے زمانے کی پختگیٔ خیال اور آخر میں بڑھاپے سے کچھ پہلے کی مشاقانہ قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ تجزیہ و تحلیل کا انداز ہر جگہ قائم ہے لیکن جہاں بیدل کے تحلیلی طرزِ خیال کا موضوع فلسفہ و اخلاق کے مسائل ہیں وہاں غالب فلسفہ و اخلاق کے علاوہ نفسیاتی نکات کو بھی اپنی جستجو کے میدان میں لے آتا ہے بلکہ نفسیاتی تجزیے سے آگے بڑھ کر کہیں کہیں تحلیلِ نفسی کی سرحد تک جاپہنچتا ہے چنانچہ مندرجہ بالا چار شعروں میں سے تیسرا شعر اس طرزِ خیال کی ایک مثال ہے۔

لیکن نفسیاتی تجزیہ یا نفسی تحلیل بہت بعد کی باتیں ہیں۔ دورِ اول کے کلام میں جو بیدل کی تقلیدِ غالب کے لیے سرمایۂ نازش تھی، نفسیاتی تجزیے کا صرف ایک دھندلا سا آغاز نظر آتا ہے۔ لڑکپن کے ان اشعار میں غالب کو زیادہ تر محض عینی (Concrete) واقعات کے تجزیے سے سروکار ہے۔ تحلیلِ جذبہ و خیال کی منزل تک پہنچنے کے لیے اسے ابھی اور چند برس لینے ہیں۔ ابتدائی دور کی تحلیلِ واقعات کا انداز یہ ہے:

اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پرسیدنی جانے

یہاں شاعر ہم آغوشی، محبوب کو محبوب کی وہ بڑی سے بڑی نوازش قرار دیتا ہے جس کے ذریعے سے محبوب کے بدن کا رواں رواں بہ زبانِ حال اس کے دل کی کیفیت

اس سے پوچھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے:

اے خوشا وقتے کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل پنبۂ مینا کرے

مطلب یہ ہے کہ دورِ ساغر کی ایسی فراوانی ہو کہ ایک صراحیٔ مے کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کھلتی چلی جائے۔ نوبت یہاں تک آئے کہ بادہ کشوں کے نیچے پنبۂ مینا کا فرش ہوجائے۔ ایک اَور جگہ زمین میں دبے ہوئے بیج کا تعلق تحت الارض خزانۂ آب کے ساتھ بڑی موشگافیوں کے بعد ثابت کیا ہے۔ پاتال کا یہ پانی رِس رِس کر اوپر کی مٹی تک پہنچا ہوا ہے اور دوسری طرف بیج نے اپنے ننھے ننھے ریشے اس طرح نیچے کو پھیلا رکھے ہیں جس طرح کسی نے کنویں میں ڈول ڈال رکھا ہو:

بسکہ زیرِ خاک با آبِ طراوت راہ ہے
ریشے سے ہر تخم کا دَلو اندرونِ چاہ ہے

غالب کے تخیّل کی یہی تحلیلی کیفیت ہے جس کی وجہ سے اسے بیدل کے ساتھ ایک نسبتِ خداداد حاصل ہے۔ اس کی شاعرانہ فطرت کے اسی عنصر نے میر اور اس کے مسلک کے شعرا سے قطع نظر کرکے ابتداءً بیدل اور پھر ظہوری، نظیری اور عرفی وغیرہ کی طرف رجوع کیا۔ دورِ اول کی جن غزلیات میں غالب نے بیدل کے ساتھ ایضاحاً" اظہارِ عقیدت کیا ہے ان میں سے ایک میں بہ صراحت یہ بتایا ہے کہ مجھے بیدل کی جدّت طرازیاں (یعنی تحلیلی نکتہ آفرینیاں) خصوصیت کے ساتھ مرغوب ہیں:

اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

لیکن اس قسم کی "بہار ایجادیوں" کے لیے بھی ذوقِ سلیم نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے

جس سے باہر قدم رکھنا ناقابل معافی نہیں تو خطرناک ضرور ہے۔ اس حد کو عبور کرکے ہم "خیال بندی" کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر واقعات اور جذبات کی تشریح کے علاوہ خیالی اور وہمی[1] چیزوں کے تجزیے سے بھی اپنے ذوقِ تحلیل کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ تجرید جو مابعد الطبیعیات کے بازار کا خاص سکّہ ہے، یہاں نہایت کثرت سے رائج ہے۔ بیدل کے یہ چند اشعار دیکھیے:

تماشِ رنگ زبس بے حجاب می بافند
بروئے گل ز دریدن نقاب می بافند

چشم وا کردم بخویش امّا بہ آغوشِ شرار
غوطہ خوردم در دلِ خوابِ فراموشِ شرار

نہ غبار است کزیں دشت پر افشاں برخاست
نگہے بال تماشا ز دو مژگاں برخاست

۱۔ "خیالی" اور "وہمی" سے متخیلہ کی دو مختلف کیفیتیں متصوّر ہیں۔ "خیالی" چیزیں وہ ہیں جن کے مثنّٰی اگرچہ خارجی دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن محسوسات کے جمع و تفریق سے ہم ان کے تصوّر تک پہنچ سکتے ہیں۔ جیسے خون کی بارش، ساکن آبشار وغیرہ۔ وہمی چیزیں بھی خارج میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ کم و بیش انسان کے قوائے فکریہ کی تخلیق ہیں جیسے مہر گیا، عنقا وغیرہ۔ خیالی چیزیں مدرک بہ حواس اور وہمی چیزیں مدرک بہ عقل ہیں۔

رنگِ طاقت سوخت اما وحشت آغازم ہنوز
چشم بر خاکسترِ بال است پروازم ہنوز
شبنم رم لیستم بیدل، گر افسردم چہ باک
می زند بر یک جہاں بے طاقتی نازم ہنوز

خیال بندی کے یہ تمام خصائص غالب کے دورِ اول میں موجود ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ محبوب کی رنگین یاد سے میری حسرت فراق کی زینت ہے اور اس مضمون کو ادا کرنے میں واقعی اور خیالی چیزوں کو بلا تکلف ملا دیتا ہے:

کرتا ہے بہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس
رنگِ زنظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

اس کے ساتھ بیدل کا یہ شعر یاد آتا ہے:

در یادِ عمرِ رفتہ ولے شاد میکنم
رنگِ پریدۂ بہ خیال آشیانہ ایست

دراصل اس زمانے میں غالب کا کلام مضامینِ خیالی سے بھرا پڑا ہے اور تقریباً ہر شعر اسی طرزِ بیان کی ایک پیچیدہ گتھی ہے۔ صرف چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

تماشا کروئی ہے انتظار آبادِ حیرانی
نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں فرشِ محفلہا

ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع
پائے خوابیدہ بہ دل جوئے شبگیر آوے

پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرواز سے
ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز

بہارِ حیرتِ نظارہ سخت جانی سے
حنائے پائے اجل خونِ کشتگاں تجھ سے

خیال بندی کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک ہی خیال کے بیان میں متعدد تشبیہات اِس طرح مربوط کردی جائیں کہ بغیر کاوش کے مطلب حل نہ ہو۔ یہ شعر دیکھیے:

بیدل ز جوشِ آبلہ ام در رہِ طلب
گوہر فروش شد صدفِ گوش نقشِ پا

اسی طرح غالب کہتا ہے:

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ برمحمل پسند آیا

اِس شعر کے مصرعِ ثانی میں پہلے لالے سے تشبیہ لی ہے اور پھر خود لالے کو ایک مسافر سے مشابہ قرار دے کر تشبیہ در تشبیہ پیدا کی ہے جو خیال بندی کا طغرائے امتیاز ہے۔

خیال بند شعرا صرف یہی نہیں کرتے کہ اپنے تخلیلی اندازِ بیان کی بنیاد وہمی و خیالی چیزوں کے تجزیے پر رکھیں۔ بارہا یہ تجزیہ محض کسی لفظی مناسبت پر مبنی ہوتا ہے۔ عہدِ اورنگ زیب میں خیال بندی منتہائے عروج پر تھی۔ شیر علی خاں لودھی نے اس زمانے میں خیال بند شعراء کا جو تذکرہ مرتب کیا اس میں خیال بندی کی تعریف یہ کی ہے "دو ایسے کلمات بالاشتراک لانا جن میں سے ایک حقیقی ہو اور ایک مجازی۔ دونوں

سے (بہ لحاظ حقیقت و مجاز) دو مفہوم مترشّح ہوں اگرچہ دراصل مراد مجازی سے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مجازی کلمے میں کوئی اصطلاح یا لطیفہ یا ضرب المثل ہو۔" خیال بندی کی اس تعریف کے بعد بہ طور تشریح بیدل کا یہ شعر دیکھیے:

صافِ معنی کرد مستغنی ز دُردِ صورتم
چوں بطِ مے باطنِ من عالم آبِ من است

یہاں شعر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے لفظ "آب" کے دو معنی لینے ضروری ہیں؛ "صفائی" اور "پانی"۔ غالب کا دورِ اول کا ایک شعر ہے:

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

یہاں شاعر قید خانے کی وحشتِ تنہائی سے مضطرب ہوا۔ مضطرب ہونے کے لیے دوسرا لفظ آتش زیرپا ہونا ہے۔ چنانچہ "آتش زیرپا" کی آتش کی مناسبت سے مصرعِ ثانی پیدا ہوا۔

بیدل کا ایک اَور شعر ہے:

بود سرمشقِ درسِ بیخودی باریک بینی ہا
زمو انگشتِ حیرانی بہ لب دارند چینی ہا

چینی کے برتن میں جو بال آگیا ہے اس سے باریک بینی مراد لی ہے لیکن چونکہ بال آنا دوسرے لفظوں میں برتن کے ٹوٹنے کو کہتے ہیں اس لیے ٹوٹنے سے درسِ بیخودی کی تعبیر کی ہے۔ اس بیخودی کا مزید ثبوت یہ ہے کہ برتن میں جو بال آگیا ہے وہ اس کے لبوں پر انگشتِ حیرت کی مثال بن گیا ہے۔

اسی انداز میں غالب کا ایک شعر ہے:

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہَوا نکلتی ہے

یہاں سینے کو بالکنایہ مکان سے اور دل کو (یا سوراخِ دہن کو) روزنِ در سے تشبیہ دی ہے جس میں سے ہَوا (یعنی سانس) گزرتی ہے۔ پھر اِسی روزنِ در کو زخم سے مماثل قرار دے کر زخم کو خطرناک ثابت کیا ہے۔ اس لیے کہ اصولِ طب کے مطابق جو زخم ہَوا دینے لگے وہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیغِ نگاہ بے حد تیز ہے۔ ان خصوصیتوں کے علاوہ دونوں مصرعوں میں آب اور ہَوا کا تقابل بھی ملحوظ رکھا ہے۔

جب ایک ایک شعر میں خیالات کی اِس قدر بھرمار ہو تو مہمل گوئی کی منزل بہت قریب آجاتی ہے۔ تخیلی شاعری اور خیال بندی کا انتہائی کمال بلاغت ہے جس طرح ترکیبی شاعری کا انتہائی کمال فصاحت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ بلاغتِ کلام کے وہی نمونے پسند طبع ہوتے ہیں جن میں فصاحت بیان کا پہلو بالکل چھوڑ نہ دیا گیا ہو۔ تخیلی شاعری جب اپنے کمال بلاغت سے گرتی ہے تو مہمل گوئی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح ترکیبی شاعری انتہائی معراجِ فصاحت تک پہنچنے کے بعد اپنے دورِ زوال میں پھیکے اور بے مغز شعروں پر انحصار کرلیتی ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کی تخیلی شاعری خیال بندی کی شکل اختیار کرلینے کے بعد بلاغتِ کلام کی اُس منطقی تدریج تک پہنچ گئی تھی جسے اصطلاحِ عام میں مہمل گوئی کہتے ہیں۔ چنانچہ صاحبِ "مرآۃ الخیال" لکھتا ہے:

"زمانۂ حال کے شعرا نے صنعتِ خیال بندی کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے جسے ہر شخص جانتا ہے۔ یہ مشہور نکتہ کہ اچھے شعر کے معنی نہیں ہوتے، خیال بند شعراء کے کلام میں صاف اور واضح طور پر دیکھا جاسکتا

ہے۔" (ص ۱۱۲)

جس ادبی دور کا تنقیدی طغرا یہ ہو کہ "شعرِ خوب معنی ندارد" اس میں بلاغت کی اس تنزّل کردہ شکل (مہمل گوئی) کا فروغ پانا باعثِ تعجب نہیں۔ شاعری میں پُرجوش منطقیانہ استدلال خیال بند شعرا کا بڑا کارنامہ ہے۔ بیدل اس فن کا بہت بڑا استاد ہے:

گر تأمّل قفسِ بیضۂ طاؤس شود
در شبستانِ عدم نیز چراغانے ہست

نبضِ جہدم شررِ کاغذِ آتش زدہ است
یک مژہ راہ بصد چشمِ پریدن رفتم

نام را نقشِ نگیں ہا بالِ پروازِ رساست
ماز خود رفتیم اگر پائے طلب درسنگ ماند

لیکن جب ناکافی توضیحِ بیان کے باعث ہمارا ذہن شاعر کی پُرپیچ دلیل آرائی کے تمام مدارج کا ساتھ نہیں دے سکتا تو شعر مہمل معلوم ہونے لگتا ہے۔ بیدل کے حسب ذیل دو شعروں کو بے معنی تو یقیناً نہیں کہنا چاہئے لیکن عام انسانی فہم کے لیے ان کے مطلب تک پہنچنا بہت دشوار ضرور ہے:

دانہ ما را کے پسندیں خط ساغر ریشہ کرد
در گزار شبنم ما عالمے زنّار داشت

حیرت دمیدہ ام گِل داغم بہانہ ایست
طاؤسِ جلوہ زارِ تو آئینہ خانہ ایست

یہی شانِ اہمال غالب کے ابتدائی کلام میں بہت زیادہ کثرت کے ساتھ موجود ہے :

خطِ نوخیز، نیلِ چشم زخمِ صافیِ عارض
لیا آئینے نے حرزِ پرِ طوطی پنگ آخر

آغوشِ گل ہے آئنۂ ذرّہ ذرّہ خاک
عرضِ بہار جوہرِ پرداز ہے مجھے

بہ ذوقِ شوخیِ اعضا تکلّف بارِ بستر ہے
معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

لیکن اس قسم کی مہمل گوئی کے ساتھ بلاغت کی سرحدیں اس طرح مل جاتی ہیں کہ بعض دفعہ دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بیدل ہمیں تخیلی تخیّل کی پیچیدگیوں کے شعبدے ہی نہیں دکھاتا، وہ بلاغتِ کلام کا بھی بہت بڑا استاد ہے اور وسیع مضامین کو صنّاعانہ چابک دستی سے دو مصرعوں میں ادا کرسکتا ہے :

دیدۂ انتظار را دامِ امید کردہ ام
اے قدمت بچشمِ من خانہ سفید کردہ ام

تنم ز بندِ لباسِ تکلف آزاد است
برہنگی ببرم خلعتِ خداداد است

مست عرفاں را شراب دیگرے درکار نیست
جز طوافِ خویش دورِ ساغرے درکار نیست

غالب کے ابتدائی دور میں اس قسم کی ماہرانہ بلاغت کی جستجو کرنا فضول ہے لیکن اگر غالب کے ایامِ پختگی کے محض اردو کلام کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ غالب نے فن بلاغت کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور اس لحاظ سے وہ اردو کے تمام قدیم و جدید شعرا کا سرتاج ہے۔ مثلاً غالب کا یہ بظاہر سیدھا سادھا شعر ملاحظہ ہو:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا!

ان چند الفاظ میں حسب ذیل نکات مرکوز ہیں:

(۱) خدا کی عبادت کرنے سے بندوں کا بھلا ہوتا ہے۔
(۲) نمرود کی پرستش باعث عذاب ہے۔
(۳) میں نے تمام عمر خدا کی عبادت میں بسر کردی۔
(۴) اور ہمیشہ یہ امید رکھی کہ اس میں میرے لیے فلاح کی کوئی صورت پیدا ہوگی۔
(۵) انجام کار مجھے مایوسی ہوئی۔
(۶) اور میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ میں نے عمر بھر جس کی پرستش کی شاید وہ خدا نہیں، نمرود کی ذات تھی کیونکہ نمرود کی پرستش ہی اس قدر لاحاصل ہو سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی نکتہ طرازی کی توقع بارہ پندرہ برس کے کسی لڑکے سے نہیں کی جاسکتی۔ پھر بھی نسخہ حمیدیہ کے بعض اشعار جو غالباً دور اول کے لکھے ہوئے ہیں یقیناً اس پائے کے ہیں کہ انھیں مہمل گوئی کا نام دینا ظلم معلوم ہوتا ہے:

خاک بازیٔ امید کارخانہ طفلی
یاس کو دو عالم سے لب بہ خندہ وا پایا

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالہ ناقوس میں در پردہ یا رب ہا

غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم
باوجود دل جمعی خواب گل پریشاں ہے

اب خصوصیات بیان میں صرف ایک چیز باقی ہے اور وہ خیال بندی کی مخصوص تشبیہ ہے۔ اسے انگریزی میں conceit کہتے ہیں۔ اردو میں اس قسم کی تشبیہات کے لیے کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں ہوئی لیکن اگر انھیں بدائع (واحد = بدیعہ) کا نام دے دیا جائے تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ انگریزی ادب میں بھی خیال بندی کی شاعری (جسے وہاں metaphysical poetry کہتے ہیں) سترھویں ہی صدی کے قریب نمودار ہوئی۔ تقریباً نصف صدی کے فصل زمانی سے فارسی اور انگریزی ادب دونوں میں جلیل القدر خیال بند شعرا کا ظہور ہوا۔ انگریزی شاعری میں جان ڈن (John Donne) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہندوستان کی فارسی شاعری میں بیدل کو۔ مگر اس اتفاق سے بھی زیادہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں خیال بندی کا ظہور اس وقت ہوا جب تمام ملک میں ایک شدید مذہبی احساس کا دَور دَورہ تھا۔ شاید مذہب کے پیدا کیے ہوئے تحلیلی شعور کو اس کیفیت سے کچھ تعلق ہو۔ بہرحال دونوں ملکوں میں خیال بند شعرا کا یہ قاعدہ تھا کہ اپنے استعارات و تشبیہات کی تمام جزئیات کو

سرمشقِ تحلیل بناتے تھے۔ اِسی طرز کی تشبیہ کو ہم نے یہاں بدیعہ کا نام دیا ہے۔ جب شاعر پیشِ نظر چیز کو کسی بظاہر غیر متعلق چیز سے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ دیتا ہے اور پھر اس اصل چیز (یعنی مُشبّہ) کو نظرانداز کرکے مبالغہ آمیز یا بعید از قیاس تشبیہ ہی کو اصل موضوعِ کلام قرار دے لیتا ہے یا اس تشبیہ کا تجزیہ اِس طریقے پر کرتا ہے کہ اس کا خطاب تخیّل کے بجائے انسانی فہم سے ہوجاتا ہے، اُس وقت وہ بدیعہ نگاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ بیدل کے یہ دو شعر مثال کے طور پر دیکھیے:

اشک شمعے بود یک عمر آبیار دانہ ام
سوختن خرمن کند از حاصل پروانہ ام

خجلت سجدۂ خاک در او کرد مرا
آں قدر آب کہ سامانِ وضو گردیدم

دورِ اول میں غالب کی تشبیہ کا انداز بیدل کی بدیعہ نگاری کا انداز ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

رکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

ایک اور نسبتہً صاف شعر ہے:

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید
مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

غالب کے اِن فارسی اشعار میں بھی بیدل کی بدیعہ نگاری کا اثر نمایاں ہے:

در ہجر طرب بیش کند تاب و تبم را
مہتاب کف مار سیاہست شبم را

محتشم زادۂ اطراف بساطِ عدمیم
گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما

بدیعہ نگاری کے ساتھ عُلوِّ خیال کا بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ عُلوِّ خیال سے عام طور پر یا تو یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر کے فکر کا موضوع زندگی کے بہت بڑے بڑے مسائل ہیں اور یا یہ کہ وہ اپنی تشبیہات سے دو ایسی چیزوں کو ہم ربط بنا دیتا ہے جن میں بظاہر عظیم الشان فاصلہ حائل ہے۔ مثلاً ناخنِ بریدہ کو اشارۂ ابرو سے تشبیہ دینا دو قطعاً" بے تعلق چیزوں کو باہم منطبق کر دیتا ہے۔ دراصل شعر کا آدھا لطف تشبیہ میں ہے جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دو بظاہر بے تعلق چیزوں میں کسی گہرے اندرونی ربط کا انکشاف۔ شاعر اس انکشاف کے ساتھ خوشگوار استعجاب کا احساس جس حد تک شامل کرسکے گا اُسی حد تک تشبیہ عالی یا مضمون بلند ہوگا۔ لیکن ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس قسم کے تحسین آمیز انکشاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ طبیعت یا تو بدمزہ ہوجاتی ہے یا شاعر کے تخیّل کی آوارگی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے عُلوِّ خیال اور بدیعہ نگاری میں بہت ہلکا سا پردہ حائل رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بدائع طرازی کی انتہائی غیر متناسب صورتوں کے ساتھ انتہائی بلندیِ خیال کے نمونے بارہا شریک ہو جاتے ہیں۔ بیدل اور غالب کے بدائع میں مضحکہ خیزی کے بجائے طبیعت کی بدمزگی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ میر کے کلام میں بھی بدیعہ نگاری نے سر نکالا ہے لیکن اس کی یہ بلند پروازیاں دردِ سر کے بجائے ہمارے ہلکے سے تبسّم کا باعث ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس بیدل کے بدائع بہت پیچ در پیچ اور عسیر الفہم ہوتے ہیں۔ مشکل معموں کی طرح ان کو حل کرتے ہوئے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا غالب کے دور اول کے اشعار کو سمجھنے میں کیونکہ ان میں بیدل کے بدائع کے ساتھ بچوں اور نو عمر لڑکوں کا وہ روایتی شوق بھی منسلک ہوگیا ہے جس کی تشفی صرف پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے ہوتی ہے۔

شاعرانہ تحلیل کا آخری درجہ یہ ہے کہ تجریدات کو اشیائے حقیقی کے برابر اہمیت دے دی جائے۔ یہی بدیعہ نگاری کی منزل ہے۔ جہاں کیفیاتِ اشیاء کو اشیاء سے مُنفکّ کر کے بازیچۂ تجزیہ و تحلیل بنا لیا جاتا ہے۔ ترکیبی شاعر کا انتہائی تنزل محض محاورہ بندی اور تحلیلی شاعر کا انتہائی تنزل محض بدیعہ نگاری ہے۔

غالب نے محض اپنی نظم کا انداز بیان ہی بیدل سے مستعار نہیں لیا بلکہ معنوی طور پر بھی وہ ایک نمایاں حد تک بیدل سے متاثر ہوا ہے۔ اس معنوی مناسبت کی ایک دلیل وہ بہت سے مخصوص الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو بیدل اور دور اول کے غالب میں مشترک ہیں۔ بیدل کے ان الفاظ و اصطلاحات کو غالب کسی کور ذوق اور فرومایہ نقال کی طرح بے سمجھے بوجھے استعمال نہیں کرتا بلکہ جن فلسفیانہ تصورات پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں' ان کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور انہیں اپنی شخصیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً جوہر اور عرض کے باہمی تعلق کی بہت سی ممکن صورتیں اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں اور ان صورتوں کو وہ اس طرح بار بار قیدِ شعر میں لانا چاہتا ہے جس طرح کوئی بچہ چکنی مٹی کو رہ رہ کر ایک نئی شکل دیتا ہے۔ ان مخصوص ترکیبوں میں سے بعض کو تو خود بیدل ہی نے وضع کیا ہے اور بعض اگرچہ نئی نہیں ہیں مگر بیدل نے کثرتِ استعمال سے انہیں ایک خاص مفہوم

دے دیا ہے۔ غالب کو ابتدائی دور میں یہ الفاظ و تراکیب بہت مرغوب ہیں اور ان کے استعمال کے ساتھ ساتھ بیدل کے خیالات کا اثر تقریباً ہر جگہ شامل ہے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

جوہر، عرض، تأمّل (بمعنی مطالعۂ باطن)، پرافشاں، بیضۂ طاؤس، بال طپیدن، کاغذِ آتش زدہ، دامِ خیال، غبارِ شیشۂ ساعت، یک الف کم اور یک الف بیش وغیرہ۔ اِسی طرح خوں شدہ دل اور غنچے کی تشبیہ غالب نے بکثرت استعمال کی ہے۔ مثلاً:

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

اس کا مأخذ بیدل کے اِس قسم کے اشعار ہیں:

غنچہ گردیدیم گلشن در گریباں ریختیم
عشرتِ سربستہ از دل ہائے خونیں بودہ است

(ہم نے غنچہ بن کر باغ کی بہار خود اپنے گریبان میں دیکھ لی
عشرتِ پنہاں کا مزہ کچھ خوں شدہ دل ہی میں آتا ہے)

غالب کا وہ شعر جس میں اس نے دل کو ایک ٹپکتے ہوئے قطرۂ خوں سے مشابہ قرار دیا ہے، بہت مشہور ہے۔ اس کا سراغ بھی بیدل کے ایک مقطع تک پہنچتا ہے:

ز احوالِ دلِ غم دیدۂ بیدل چہ می پرسی
کہ ہست ایں قطرہ چوں غنچہ محروم از چکیدنہا

(بیدل کے غم زدہ دل کا حال کیا پوچھتے ہو
یہ ایسا قطرہ ہے جو غنچے کی طرح ٹپکنے سے محروم ہے)

اگرچہ تشبیہ کا تعلق دراصل نظم کے صوری عنصر سے ہے لیکن مندرجہ بالا

تشبیہات کے استعمال میں معنوی اشتراک کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اِس سے قطع نظر ہمیں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں دونوں شاعروں نے ایک ہی مضمون ادا کیا ہے مثلاً بیدل کے اِن دو شعروں پر غور کیجئے:

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در قفس دارد
گہر دزدیدہ است ایں جاعنانِ موجِ دریا را
(ہمارے پُرسکوں دل میں تمام کائنات کے ہنگامے بند ہیں
یہاں موتی نے موجِ دریا کی باگ اپنی طرف پھیر لی ہے)

اضطرابِ موج آخر محوِ گوہر می شود
در کمینِ ما دلِ بے مدّعا افتادہ است
(دریا کا اضطراب آخر کار گوہر میں محو ہو جاتا ہے
اسی طرح ہماری (ہنگامہ خیزیوں کی) تاک میں بھی دلِ بے مدعا پڑا ہے)

اِن دونوں شعروں کے ساتھ غالب کے حسبِ ذیل شعر کا تعلق بالکل واضح ہے:

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اِسی طرح بیدل ایک اور جگہ کہتا ہے:

تنگنائے بیضہ' بیدل گوشۂ آرام بود
شد پریشاں مرغِ ما تا بال و پر آوردہ است

غالب نے اِسی مضمون میں پَرکشائی کی زیادہ وسعت پیدا کی ہے:

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

یہاں صرف چند اور مثالوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا:

بیدل: چوں غبارِ شیشۂ ساعت تسلی دشمنم
از مزاجِ خاکِ ما ہم بردہ اند آرام را

(مجھے اطمینان و سکون سے اتنا ہی بَیر ہے جتنا بالو جنتر کی ریت کو
میری مٹی کے خمیر ہی میں سے آرام نکال لیا گیا ہے)

غالب: نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

بیدل: صدائے کہ پیچیدہ بر سازِ ہستی
چہ دارد بجز نالہ زنجیر خانہ!

(تو ایک صدا ہے جو زندگی کے ساز سے پیدا ہوئی
زنجیر خانے میں نالے کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے!)

غالب: بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

بیدل: رمزِ فرصت بہ کفِ من بہ تو حیراں بودم
آنقدر دست نہ دارم کہ تواں سود بہم

غالب: فرصت آئینہ صد رنگ خود آرائی ہے
روز و شب یک کف افسوس تماشائی ہے

بیدل: ہر چند دستگاہ بود پیش، حرص بیش
از موجِ بحر تشنہ لبی می کشد زباں
(جب تمام اسباب میسر ہوں تو حرص اور بڑھ جاتی ہے
سمندر کی موج سے دراصل تشنہ لبی زبان پھیلاتی ہے)

غالب: ہوَا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

جس حد تک غالب کے اپنے ارادے کو تعلق تھا، اس نے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے کچھ پہلے بیدل کی تقلید ترک کردی۔ اگرچہ اندازِ بیان برسوں کی مشقِ سخن اور طبیعت کے تخیلی میلان کی وجہ سے جس روش پر پڑ چکا تھا، اس سے بالکل علیحدہ ہونا ابھی اَور چند سال تک عملاً غالب کے لیے ناممکن تھا۔ لیکن جب وہ زمانہ آیا کہ مرزا بیدل اور فارسی کے خیال بند شعرا کی روایت سے قطع نظر کر کے غالب نے اپنے ذاتی اجتہاد کی بنا پر اردو میں ایک نیا (مگر کسی قدر ملتا جُلتا) اسلوبِ بیان پیدا کرلیا، اُس وقت بھی اس نے اپنی اولین شاعرانہ عقیدت کو بالکل خوابِ فراموش نہیں بنا دیا۔ اب فارسی میں غالب خود پایۂ استادی کو پہنچ چکا تھا اور بیدل کی فارسی گوئی کے متعلق گاہ بہ گاہ کوئی حقارت آمیز اشارہ کرنے میں اسے باک نہیں تھا۔ تاہم اس کے عہدِ طفلی کے شاعر کی روح کبھی کبھی اس کے خیال کی دنیا میں پھر داخل ہوتی تھی۔ بڑھاپے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک خط لکھا ہے جس میں یہ عبارت نظر آتی ہے: "ایک چرخ ہے جو چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے وہ ہوَا جاتا ہے، اختیار ہو تو کچھ کیا جائے .... مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام
زیں ہوسہا بگذر یا نگذر، می گزرد"

پہلے دور سے آگے بڑھ کر بھی غالب کے کلام میں بار بار یہ شہادت ملتی ہے کہ ابھی بیدل کی آواز اس کے دل و دماغ میں گونج رہی ہے۔ مثال کے طور پر بیدل کا یہ شعر دیکھیے:

تا بہ کے بے مدّعا چوں شمع باید رفتنت
جادۂ خود را نسازی محو در منزل چرا؟
(تو کب تک شمع کی طرح بے مدّعا راہ پیما رہے گا؟
کیوں نہیں اپنے راستے کو منزل میں محو کردیتا)

ظاہر ہے کہ یہ غالب کے اِس شعر کا نقشِ اول ہے:

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کا عشق ہے!
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

بیدل کا شعر ہے:

نیست بیدل غیر از اظہارِ عدم اندر جہاں
تا خموشی پردہ از رخ بر نگند آواز بود
(بیدل! دنیا میں عدم کے ظہور کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے
جب خاموشی چہرے سے نقاب الٹتی ہے تو آواز ہوجاتی ہے)

غالب کہتا ہے:

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بیدل کا ایک اور شعر ہے:

نفی خود میکنم اثبات بروں می آید
تاکجا رنگ تواں بافت بہارست اینجا

اس کے مقابل میں غالب کا شعر اتنا بلند نہیں ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی پیچ در پیچ طریقے پر بیدل کا اثر اس کے دماغ میں کام کر رہا تھا:

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

غالب کے دورِ پختگی کا ایک اور بہت مشہور شعر ہے جو صاف طور پر بیدل کے ایک شعر کا ترجمہ ہے۔ بیدل کہتا ہے:

بہ ہستیٔ تو امید ست نیستی ما را
کہ گفتہ اند اگر ھیچ نیست اللہ است

(تیرے ہونے سے ہمیں نیستی پر بھی امید ہے
کیونکہ کہتے ہیں کہ اگر کچھ نہ ہو تب بھی خدا ضرور ہو)

غالب کے ترجمے میں منطقیانہ استواری کی شان زیادہ نمایاں ہے۔ بیدل کی نظر آئندہ امکانات کی دنیا پر بھی ہے۔ اس کے برعکس غالب نے بالکل قدرتی طور پر آغازِ کار کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں خیال بند شاعر کا لبریزِ جذبات استدلال اپنی پوری شاعرانہ کیفیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا مَیں تو کیا ہوتا!

دراصل لڑکپن میں جو چیز غالب کو سب سے زیادہ باعثِ کشش معلوم ہوئی وہ بیدل کے فلسفیانہ مضامین تھے۔ تحلیلی اندازِ طبیعت کا منطقی نتیجہ فلسفہ دانی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں کی طبیعت میں تحلیل و تجزیہ کا مادہ اِس شدّت سے موجود ہے کہ بیدل کا کلام تو تمام تر فلسفیانہ خیالات سے بھرا ہوا ہے اور غالب کی شاعری میں بھی فلسفے کو

ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ بیدل کی مابعد الطبیعی دلچسپی نے غالب کو شروع ہی سے بتا دیا کہ یہاں ایک ہم آہنگ روح موجود ہے چنانچہ دورِ اول میں جو اغلاق اور پیچیدگی نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ وہ فلسفیانہ باریک بینیاں ہیں جو بیدل کے مضامین کی تقلید میں ناگزیر ثابت ہوئیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ فلسفے کا آغاز استعجاب و تجسّس سے ہوتا ہے۔ غالب کے فطری فلسفیانہ میلان کا ثبوت اس سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ لڑکپن میں بھی فلسفیانہ تجسّس کا عنصر اس کے کلام میں بڑی وضاحت کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ کائناتی سوال جنھوں نے اس کے ذہن کو ہمیشہ بے چین رکھا اور جن کے لیے شعرائے اردو کی صف میں اسے ایک ممتاز رتبہ حاصل ہے' تقلیدِ بیدل کے دور میں بھی اس کے لیے خاص اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ اگر بیدل یہ پوچھتا تھا کہ :

کُو مقامے کہ تواں مرکزِ ہستی فہمید
از زمیں تا فلک آغوش کشیدست عدم

(وہ مقام کون سا ہے جسے مرکزِ ہستی قرار دیا جا سکے ؟
زمین سے آسمان تک تو عدم کا آغوش پھیلا ہوا ہے)

تو غالب بھی پکار اٹھتا ہے کہ :

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بہت سے فلسفیانہ تصورات ایسے ہیں جنھیں غالب واضح طور پر بیدل سے اخذ کرتا ہے۔ مثلاً زندگی کے لیے پابندیِ نظام کی ضرورت کا تصوّر۔ بیدل کہتا ہے :

قطرہ ہا در ضبط موج آئینہ دار گوہر اند
تا شود روشن کہ سعیٔ خامشی بیہودہ نیست

(قطرے موج سے وابستہ ہو کر موتی بن جاتے ہیں
یہ اس کا ثبوت ہے کہ خاموشی محض ایک سعیِ نامشکور نہیں ہے)

غالب نے اِسی خیال کو بہتر پیرائے میں ادا کیا ہے:

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندی گوہر
وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُر نم ہے!

بیدل اور غالب کے دو دو اَور شعر، جن میں فلسفیانہ مضمون کی مناسبت موجود ہے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

بیدل: در تکلّم از ندامت ہیچ کس آسودہ نیست
جنبشِ لب یک قلم جز دست برہم سودہ نیست

(بات کرنے میں کوئی شخص ندامت سے محفوظ نہیں رہتا
جنبشِ لب کو یہی سمجھو کہ (حسرت سے) ایک ہاتھ کو دوسرے پر مَل رہے ہو)

غالب: ز بسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

بیدل: قطرۂ ما تا کجا سامان خود داری کند
بحر ہم از موج ایں جا می شمارد دام ہا

(ہمارا قطرہ کب تک اپنے نفس کو بچاتا رہے
یہاں تو سمندر اپنی موج میں بھی دام چھپائے ہوئے ہے)

غالب: دامِ ہر موج میں ہے حلقہ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گُہر ہونے تک

ایک بڑی حد تک اسی فلسفیانہ رمز شناسی کی بدولت غالب اور بیدل دونوں اپنے

آپ کو عوام سے برتر سمجھتے تھے۔ غالب کی روشِ عام سے علیحدگی بہت مشہور ہے مگر بیدل کو بھی اس معاملے میں اپنی ذات پر کچھ کم اعتماد نہ تھا۔ ایک مرتبہ نواب شکراللہ خان کی مجلس میں مرزا بیدل اور شیخ ناصر علی دونوں جمع تھے۔ بیدل کے اِس مطلع کا ذکر آگیا:

شد آئینۂ کیفیتِ ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

(آرائش ظاہری نے ہماری اندرونی کیفیت کو کبھی آشکار نہ کیا
اِتنے لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم معنی کی طرح پنہاں رہے)

ناصر علی نے کہا کہ دوسرا مصرع خلافِ دستور معلوم ہوتا ہے کیونکہ معنی لفظ کے تابع ہے؛ لفظ جب بھی ظاہر ہوتا ہے معنی خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ بیدل نے ایک حقارت آمیز تبسّم کے ساتھ جو جواب اپنے نامور معاصر کو دیا وہ کسی ایسے ہی دماغ سے نکل سکتا تھا جو فلسفیانہ خیالات سے منجھا ہُوا ہو اور جسے اپنی فوقیت کا پورا احساس ہو۔ اس نے ناصر علی سے مخاطب ہو کر کہا: وہ معنی جسے آپ تابعِ لفظ قرار دیتے ہیں اس کی اصلیت بھی ایک لفظ سے زیادہ نہیں۔ جو چیز حقیقت میں معنی کہلاتی ہے وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی۔ مثلاً انسان کی ماہیت اُن شرحوں اور تفصیلوں کے باوجود جو کتابوں میں درج ہیں، بالکل نہیں کھل سکی۔" بچارے شیخ ناصر علی یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔[1]

بیدل عوام کا شاعر نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ عوام کی روش سے علیٰحدگی کی خواہش

۱۔ مرأۃ الخیال، ص ۲۹۶۔

نے بیدل کی طرف غالب کے میلان کو مزید تقویت پہنچائی ہو۔ بہرحال اِس خاص معاملے میں غالب اور بیدل کی طبیعت کا اشتراک بالکل روشن ہے۔ دونوں کے دل میں کسی نہ کسی وجہ سے عوام کے متعلق حقارت کا شدید احساس موجود ہے۔ بیدل کہتا ہے:

زابنائے جہاں بیہودہ دردِ سر مکش بیدل
اگر بارے نداری التفاتت چیست با خرہا؟

(بیدل! تم دنیا والوں کے ساتھ کیوں بے کار سر کھپاتے ہو؟
تمھارے پاس کوئی بوجھ تو ہے نہیں تو پھر گدھوں سے کیا کام؟)

اِسی طرح غالب ایک فارسی رباعی میں تمام دنیا کے جاہلوں کو گدھے قرار دیتا ہے اور ان کے مختلف طبقوں کے درمیان صرف اِتنا فرق کرتا ہے جتنا خرِ عیسیٰ اور خرِ دجّال میں ہے۔

بیدل اور غالب کے متعلق ایک اور بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر دونوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے---- دونوں کی فطرت میں وہ خاص روحانی کیفیت بدرجۂ اَتَم موجود ہے جسے غالب کہیں وارستگی اور کہیں خود بینی' آزادی یا آزادہ روی کہتا ہے۔ یہ کیفیت دوسرے لفظوں میں اپنی روح کے عزم و ہمت اور شخصی غرور و طاقت کا وہ احساس ہے جو مصائبِ حیات کو خاطر میں نہیں لاتا' جو اسبابِ ظاہری سے مرعوب یا مغلوب ہوجانے میں اپنی توہین سمجھتا ہے اور ناکامیوں کو ایک "رئیسانہ" شان سے نظرانداز کرنے یا حقارت سے ٹھکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مرزا غالب کے لیے (برعکس مرزا بیدل کے) خاندان و نسب کا غرور بھی اس احساس کی پشت پر موجود تھا۔ بیدل کی صورت میں اس احساس کو اس کے فلسفۂ خودی اور جذبۂ حرکت و عمل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ بیدل کی شاعری میں (دوسرے مضمونوں کے ناپید ہونے کی وجہ سے) یہ مضمون اس قدر نمایاں ہے کہ میں اس کے کلام میں سے صرف دو تین

مثالیں دینے پر اکتفا کروں گا:

بہ شوخی آمد از بے دست گاہی احتیاجِ من
درازی کرد دست آخر ز کوتہ آستینی ہا

(بے وسیلہ ہونے کی وجہ سے آخر میری غربت ہی شوخی میں آگئی
گویا میں نے اپنی کوتاہ آستینی کی وجہ سے دراز دستی کی)

مقامِ وصل نایابست، راہِ سعی نا پیدا
چہ می کردیم یا رب گر نہ بودے نارسیدنہا

(ہمیں منزلِ محبوب نہیں ملتی اور سعی و ہمت کا راستہ گم ہے
خدایا اگر نارسائی بھی نہ ہوتی تو ہم غریبوں کا کیا حشر ہوتا)

اِس پر غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے جسے بعض حضرات اس کی "قنوطیت" کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن جس میں دراصل یہی احساسِ وارستگی غالب کے دماغی پس منظر کے طور پر صاف نظر آتا ہے:

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم!

بیدل کا ایک اور شعر ہے:

واماندگی ز عافیتم بے نیاز کرد
بال آں قدر شکست کہ از آشیاں گزشت

(مصیبتوں نے مجھے عیش و آرام سے بے پروا کر دیا۔
میرے پر اس قدر ٹوٹے کہ آشیاں کے باہر جا پڑے)

غالب کے ایک مشہور شعر میں کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کیا گیا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اِتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ شعر غالب کے آخری دورِ شاعری سے ماخوذ ہے لیکن پہلے اور دوسرے دور میں بھی اِس طرز احساس کی کچھ کمی نہیں۔ مثلاً پہلے دور کا یہ شعر دیکھیے:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اِسی طرح دوسرے دور کے ایک شعر میں کہا ہے:

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا مَیں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اگر ایک طویل نظم میں یہ دیکھنا ہو کہ انتہائی درد و کرب کے احساس کے ساتھ ساتھ غالب کی یہ وارستگی و آزادگی کیا کیا مختلف اور متعدد شکلیں اختیار کرتی ہے؟ تو غالب کا وہ فارسی ترکیب بند پڑھنا چاہیے جو اس نے دہلی کی انگریزی عدالت سے سزائے قید پانے کے دو ڈھائی مہینے بعد غالباً ستمبر ۱۸۴۷ میں جیل خانے کی دیواروں کے اندر بیٹھ کر لکھا۔ یہاں عزیمت و وارستگی کا احساس بھی ہے، اور ظرافت کی وہ شان بھی، جس کی کوئی جھلک بیدل کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے رئیسِ شہر اور شریف النسب ہونے کا احساس غالب کے لیے بیک وقت سرمایۂ قوت اور سرمایۂ عذاب ہے۔ مگر یہ نظم اپنے متنوّع نفسیاتی پہلوؤں کے لحاظ سے بہت پیچیدہ ہے جن کے تفصیلی تجزیے کا یہ موقع نہیں۔

جن کیفیات کا ذکر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ ایک اور شخصی جوہر ایسا ہے جو بیدل

اور غالب دونوں کی فطرت کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ استغنا کا جوہر ہے جو غالب کے اس قسم کے اشعار میں کارفرما ہے:

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صِلے کی پروا
گر نہیں ہیں مِرے اشعار میں معنی نہ سہی

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہُوا
مَیں نہ اچھّا ہُوا، برا نہ ہُوا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کو بیدل کی طرف جو کشش ہوئی اس میں طبیعت کے اس رنگ کو خاص دخل تھا۔ بیدل اپنے استغنا کے لیے بہت زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس کی زندگی شروع سے آخر تک عملاً اسی استغنا کا مرقّع تھی۔ وہ خود بڑی دھوم دھام سے کہتا ہے:

آخر ز فقر بر سرِ دنیا زدیم پا
خلقے بہ جاہ تکیہ زد و ما زدیم پا
(آخر دنیا کو ہم نے اپنے پائے فقر سے ٹھکرا دیا
لوگوں نے جاہ و حشمت کا سہارا ڈھونڈا اور ہم نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری)

بعض لوگ جو غالب کی آخرِ عمر کی قصیدہ خوانیوں کو غیر متناسب اہمیت دینے کے خوگر ہیں، یہ سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں کہ بیدل جیسے قناعت شعار اور مستغنی المزاج انسان کے ساتھ اسے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ اس طرزِ خیال کے لوگوں کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ بیدل عہدِ اورنگ زیب کا شاعر ہے، جب ہندوستان ابھی "گولڈن انڈیا" کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ کا ہندوستان بڑی حد تک مفلس

ہندوستان تھا۔ حال ہی میں "مکاتیبِ غالب" کا جو نسخہ رام پور سے شائع ہوا ہے اس کے مندرجہ خطوط میں سے بعض غالب کے بڑھاپے کی مالی پریشانیوں پر دردناک انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ غالب کا افلاس اور بڑھاپا انتہائی تکلیف تک پہنچ گیا ہے اور اسے سو پچاس روپے کی حقیر رقموں کے لیے نواب صاحب رام پور کو جس عجز و ابرام کے ساتھ خط لکھنے پڑتے ہیں وہ بے حد عبرت انگیز ہے۔ اس کے مقابلے میں بیدل کا ماحول دولت و ثروت سے مالا مال تھا' تمام بڑے بڑے امراءاس کے دروازے پر آنا اور اس کی خدمت میں تحائف پیش کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ مجموعۂ رام پور کے بعض مکاتیب پر غور کیجئے اور اس کے ساتھ محمد حسین آزاد کی زبان سے بیدل کی زندگی کا یہ واقعہ سنیے:

"ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے کو لایا۔ اتفاقاً" سب انار اس کے گل گئے۔ حیران ہو کر چند انار جو باقی تھے بطریقِ نذر مرزا (بیدل) کے پاس لایا اور عرضِ حال کیا۔ مرزا نے ایک شعر اسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ وہ شعر یہ ہے:

بخیہ کنشم اگر دنداں نما شد عیب نیست
خندہ دارو چرخ ہم بر ہرزہ گردی ہائے من

نواب اسے حسنِ طلب سمجھے کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت غنیمت سمجھے۔ اُسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ مرزا نے کُل روپیہ اُسی کابلی کو دے دیا۔[1]"

۱۔ "نگارستانِ فارس"

جس شخص کے حالات یہ ہوں اس کی زندگی کی بنیاد اگر استغنا پر قائم رہی تو کیا تعجب ہے!

یہ سچ ہے کہ عزّ و جاہ کی جو طلب غالب میں نظر آتی ہے وہ بیدل میں مفقود ہے اور اس بنا پر دونوں کی سیرت میں یقیناً ایک امتیاز قائم ہے۔ اس فرق کی بنیاد یہ ہے کہ غالب کو دنیا کی لذتیں لذیذ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی نعمتوں اور مسرتوں کا حریص ہے اور بڑی سے بڑی حد تک ان سے لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ اس کے پاس استغنا تو ہے مگر قناعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس بیدل کے لیے لذائذِ دنیوی سرے سے کوئی کشش ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

کافرم گر مخمل و سنجاب می باید مرا
سایۂ بیدے کفیلِ خواب می باید مرا
(مخمل اور سنجاب کی حرص کس کافر کو ہے
میرے آرام کے لیے تو بید کے درخت کا سایہ کافی ہے)

ایک اور شعر میں اس سے بھی زیادہ خوبی کے ساتھ یہی مضمون ادا کیا ہے:

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش
(مجھے اگر دولت دنیا بھی دیں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلوں
میں نے پاؤں میں قناعت کی مہندی لگا رکھی ہے)

غالب کچھ اپنے حالات اور کچھ اپنی افتادِ طبیعت کی وجہ سے قناعت کی اِس بلندی تک کبھی نہ پہنچا۔ لیکن ساتھ ہی بیدل کا جنونِ استغنا اتنا پختہ بھی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے رقعات کو دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ دوستوں کے تحائف و ہدایا کے معاملے میں وہ کچھ ایسا بے نیاز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ نظام الملک

آصف جاہ اول کی استادی قبول کرنا بھی استغنا کی خاص دلیل نہیں ہے۔ باقاعدہ مدح گوئی اس نے اگرچہ نہیں کی لیکن اسے امراء کی خوشنودی حاصل کرنے سے عار نہیں تھا۔ امیر الامرا سیّد حسین علی خان کی تعریف میں اس کے دو شعر میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرۂ شعراء میں موجود ہیں۔ بیدل ایک عملی دور کا شاعر ہے اس لیے اپنے ممدوح کے لیے "نشۂ پیمانۂ قدرت" کی خوبصورت ترکیب استعمال کرتا ہے۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

اے نشۂ پیمانۂ قدرت ! بچہ کاری
ہستی اثری یا پئے تاراج خماری
مے در قدحی، گل بہ سری، جام بہ دستی
رنگِ چمنی، موجِ گلی، جوشِ بہاری !

غالب کو اس قسم کے قدردان نہ مل سکے جیسے خوبیٔ قسمت سے بیدل کو میسر آئے۔ بیدل دائیں ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ غالب کو اس قسم کی فیاضانہ داد و دہش کی حسرت ہی رہی:

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دھد
بہر بار زر پیل بارم دھد
کہ چوں پیل زانجا بر انگیزمے
زرش بر گدایاں فرد ریزمے

لیکن قسمت کی ان تمام کوتاہیوں اور ایک ہلکے سے فرقِ سیرت کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بیدل اور غالب استغنا کے معاملے میں بحیثیتِ مجموعی متحد تھے۔ اگر بیدل نے شاہزادہ محمد اعظم کی ملازمت کو ایک اصول کی خاطر ٹھکرا دیا تو غالب نے بھی

حکومتِ ہند کے چیف سیکرٹری مسٹر ٹامسن کی پیشکش کو اپنی آن پر قربان کردیا اور جب کعبۂ حکومت کا دروازہ اس کے لیے وا نہ ہوا تو وہ الٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ جو لوگ مکاتیبِ رام پور سے غالب کی طبیعت کا اندازہ کرنا چاہیں وہ اس واقعے کو بھی نظر انداز نہ کریں جو کلکتے جاتے ہوئے اسے لکھنؤ میں نائب السلطنت اودھ کی ملاقات کے سلسلے میں پیش آیا۔ نائب السلطنت آمادۂ لطف و کرم تھا مگر آدابِ ملاقات کے سلسلے میں جو شرطیں اس نے لگائیں، انھیں غالب کی خودداری قبول نہ کرسکی۔ چنانچہ مسٹر ٹامسن کی طرح اسے بھی غالب کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔

غالب میں استغنا کا یہ جوہر تقلیدِ بیدل کے دور ہی میں واضح ہوچکا تھا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شعر ہے:

وہ بے دماغِ منّتِ اقبال ہوں کہ مَیں
وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہُما کروں

اِسی زمانے کے قریب کا ایک اور شعر ہے:

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

تشریحاتِ بالا سے شاید یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ دورِ اول میں غالب محض بیدل کی صدائے بازگشت ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ غالب نے بیدل کے اندازِ بیان کی کامل تقلید تو ضرور کی ہے لیکن اپنی جامع الصفات شخصیت کو بیدل کی زیادہ طوفانی مگر یکطرفہ شخصیت میں بالکل ضم نہیں کردیا۔ اس زمانے میں وہ ایسے مضامین بھی لکھ جاتا ہے جو بیدل کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوسکتے تھے۔ مثلاً دورِ اول کی ایک غزل ہے جس میں بیدل سے صاف طور پر اظہارِ عقیدت کیا ہے:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

لیکن اسی غزل کے ایک شعر میں بڑے زور سے ایک ایسی آزاد خیالی کی بات بھی کہہ دی ہے جس کا متحمّل بیدل کا اسلامی فلسفہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شعر یہ ہے:

کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنّا ؟
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ !

یہ اختلافات تقلیدِ بیدل ترک کر دینے کے بعد اور نمایاں ہو گئے ہیں۔ مثلاً بہشت پر اگرچہ غالب اور بیدل دونوں کو اعتراض ہے مگر دونوں صورتوں میں وجوہِ اعتراض مختلف ہیں۔ بیدل کو اقبال کی طرح بہشت میں بھی آرزوؤں کی گرمی اور انسانی زندگی کے ہنگاموں کی تلاش ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

گویند بہشت است و ہمہ راحتِ جاوید
جائے کہ بداغے نہ طپد دل چہ مقام است
(کہتے ہیں کہ بہشت میں راحتِ جاودانی کا سامان ہے
مگر وہ بھی کیا جگہ ہوئی جہاں دل میں داغِ آرزو کی تپش پیدا نہ ہو)

طالبِ صحبتِ معنی نظراں باید بود
خاک در صحنِ بہشتے کہ نہ دارد آدم!
(اہلِ معرفت کی صحبت تلاش کرنی چاہئے
ایسی بہشت پر خاک پڑے جس میں آدمی نہ ہو)

بہشت پر غالب کے اعتراض کے وجوہ بہت سے ہیں مگر سب بیدل سے مختلف۔ اِس موضوع پر غالب کے اُردو شعروں سے تقریباً" ہر شخص واقف ہے۔ میں اس موقع

پر اس کے صرف ایک فارسی شعر کا حوالہ دوں گا۔ بیدل بہشت سے اس لیے گھبراتا ہے کہ وہاں راحت ہی راحت ہے۔ غالب کو یہ شکایت ہے کہ جنّت کی راحتیں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں جن کا تقاضا انسان کے آلامِ حیات کی تکلیفیں کرتی ہیں :

جنّت نہ کند چارۂ افسردگیٔ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیٔ ما نیست !

یہیں سے بیدل اور غالب کی فطرت کا ایک اہم فرق شروع ہوجاتا ہے۔ غالب میں ایک نرمیٔ جذبات، ایک ذکاوتِ حس، ایک ملاطفت ایسی ہے جو بیدل میں قطعی طور پر مفقود ہے۔ زندگی بیدل کے لیے حرکت، عمل اور پیہم تگ و دو ہے۔ سکون و راحت کو اس کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ملتی :

فال راحت مزن کزیں کفِ خاک
ہرچہ آسودہ تر فسردہ تر است

سرِ ہوائے اقامت دریں چمن مفراز
بہ ہوش باش کہ تیغ گزشتنی تیز است

غالب اس لطفِ خرام اور ذوقِ رفتار سے آشنا ہے مگر سکون و راحت کی لذتوں سے بھی یکسر بیگانہ نہیں ہے۔ راقم الحروف کو اس مسئلے پر ایک دفعہ علامہ اقبال سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ علامۂ ممدوح نے فرمایا کہ :

"غالب اور بیدل کی صوفیانہ شاعری میں بہت فرق ہے۔ بیدل کے تصوّف میں حرکت ہے مگر غالب کا تصوّف مائل بہ سکون ہے۔ بیدل میں یہ حرکی عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا معشوق بھی صاحبِ خرام

ہے..."

یہ ذوقِ سکون خصوصیت کے ساتھ اُس وقت واضح ہوا' جب غالب نے بیدل کی تقلید بالکل ترک کردی' ورنہ غالب کے دورِ اول میں اِس قسم کے اشعار کی کچھ کمی نہیں:

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

بیدل کے انداز سے روگرداں ہو کر غالب کی ذہنیت میں جو تبدیلیاں ہوئیں' وہ ایک الگ بحث کا موضوع ہیں جن کے لیے کسی اور صحبت میں گنجائش نکالی جائے گی۔

(تحریر: ۱۹۳۸)

غالب کی شاعری میں حُسن و عشق

غالب کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے پورے کلام میں اِس مضمون کے اشعار آدھے تو نہیں مگر ایک تہائی کے قریب ضرور ہوں گے۔ ان اشعار میں وہی تنوع' جدّت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان اور کلیات کے دوسرے مضامین کا امتیازِ خاص ہے۔ اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصّہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ اِن اشعار میں محض رنگا رنگ طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے' ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔ اِس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں ہے' اور نہ ہو سکتی تھی' لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دل کشا مناظر بکثرت ملتے ہیں۔ انسانی فطرت کے نا محدود پہلو جذبۂ عشق کے ماتحت جس جس طرح سنورتے' بگڑتے' پگھلتے اور ڈھلتے ہیں' اس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوشِ تخیّل اور پورا زورِ قلم صَرف کیا ہے۔

غالب کے کلام میں اجتہاد کے پہلو بہ پہلو روایت کی پاسداری سے جو شغف ہے وہ عشقیہ شاعری میں بھی قائم نظر آتا ہے۔ غزل کے روایتی عاشق' مجنوں سے لے کر

پروانے تک، اور روایتی معشوق، لیلیٰ سے لے کر شمعِ محفل تک، سبھی یہاں موجود ہیں۔ اِن اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہی معاشرت ہے جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ غالب کے بیان میں اسے زیادہ وسعت، شدّت اور وضاحت میسر ہوئی ہے۔ لیکن یہ درجے کا فرق ہے، کیفیت کا نہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اس کے ہم عصر شعرا میں ایک بنیادی اشتراک ہے۔ اِس مشترک کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک الگ مقام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر کی اپنی شخصیت اور اس شخصیت کی یکتائی نے اس حصّۂ کلام کو بھی ایک بالکل دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے۔

حسن و عشق کو ہم یہاں بطور ایک ملی جلی حقیقت کے دیکھ رہے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور ہوتا ہے:

شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دارِ ہم دگر
خار کو بے نیامِ جاں، ہم کو برہنہ پا سمجھ

اِس یگانگت کے باوجود ہم حسن و عشق کے درمیان عام گفتگو میں فرق ضرور کرتے ہیں۔ حسن کو ہم ایک بیرونی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور عشق اُسی بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں یقیناً ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔ جیسے ہم خود ہیں ویسا ہی ہمارا عشق ہے۔ لیکن ذرا سا غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ

ہمارا حسن کا تصوّر بھی ہماری اپنی شخصیت سے محصور ہے۔ حسن کی کون سی ادا کو آپ خاطر میں لاتے ہیں اور کس کو نظر انداز کر دیتے ہیں' یہ خود آپ کی افتادِ طبع کا کرشمہ ہے۔ انسان کی شخصیت کے الگ الگ ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے' ہمارے عمل اور خیال کی ہر سرگرمی' ہماری خود فروشی و خود داری' ہماری محبت و نفرت' ایک ہی ناقابلِ تقسیم شخصیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ غالب کا تصورِ حسن و عشق کیا تھا' یہ دراصل غالب کی شخصیت کا مسئلہ ہے۔ شدید و عمیق احساس کی حالت میں انسانی فطرت اپنے چہرے سے ہر نقاب الٹ دیتی ہے' اور عشق تو زندگی کے سب سے گہرے اور سب سے تیز جذبات میں سے ہے۔ اسی لئے یہ سوال کہ غالب کس حسن سے کس قسم کا عشق کرتا تھا' اگرچہ بجائے خود بھی دلچسپ ہے' لیکن نقاد کے لئے اس میں ایک خاص کشش یہ ہے کہ اس کی بنا پر غالب کے ذہنی حدود متعیّن کرنے میں مدد ملتی ہے۔

غالب نے حسن کی تفصیلی تصویر کشی کہیں نہیں کی' نہ کہیں اس قسم کا سراپا باندھا ہے جو مثلاً میر حسن' یا جرأت یا ذوق یا بعض انگریزی شاعروں کے کلام میں مل سکتا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد بہت ہی کم ہے جن میں شاعر نے ع

زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

کی حد تک صراحت سے کام لیا ہے' اور یوں بھی بیشتر اشعار حسن کے بجائے عشق کے موضوع پر ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی دیوان اور کُلیّات میں حسن کی مصوّری رسمی تشبیہ کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔ حسن کا جلوہ "صورتِ مہرِ نیم روز" ہے' اور "حسن مہ بہ ہنگامِ کمال" سے بھی بڑھ کر ہے' "حورانِ خلد" میں بھی وہ "صورت" نہیں ملتی' اس کی جھلک یوں ہے جیسے آنکھوں کے آگے ایک "بجلی کوند گئی"۔ "قدِ یار کا عالم" فتنۂ محشر کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی کمر موہوم ہے اور دہن نامعلوم۔ فارسی کی یہ پوری

غزل پڑھ جایئے:

تابم ز دل برد کافر ادائے
بالا بلندے ، کوتہ قبائے

کوئی واضح انسانی صورت سامنے نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی صورت گری، غالب کی شاعری کا موضوع ہی نہیں ہے۔ روایتی تشبیہ سے شاعر نے جابجا کام ضرور لیا ہے لیکن یہ تشبیہ فی نفسہٖ اس کے لیے باعثِ کشش نہیں ہے۔ بالعموم اس کا استعمال ضمنی ہے۔ اس کی ہلکی سی بنیاد پر وہ کسی لطیف نکتے کی تعمیر کرتا ہے، لیکن پیکرِ حسن کی وہ مفصّل عکاسی جو روایتی سراپا سے مخصوص ہے غالب میں کہیں نہیں ملتی۔ فارسی کلیات کے دس ہزار کے قریب اشعار کا خیال کیجیے تو اس بات پر کچھ اچنبھا ہوتا ہے۔

۱۸۲۷-۲۸ میں کلکتے جاتے ہوئے غالب کو بنارس میں قیام کا موقع ملا اور یہاں نسوانی حسن و جمال کے نظاروں نے اسے بے تاب کر دیا۔ کوچہ و بازار، در و بام، کنارِ دریا، جدھر نظر اٹھتی، شاعر کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ جاتی۔ مثنوی "چراغِ دیر" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ مسلسل نظم اور پھر عورت کے حسن کا پُرجوش بیان، جزئیاتِ حُسن کی مرقع نگاری کی کوئی تقریب، اگر ہو سکتی تھی۔ تو یہ تھی لیکن غالب کا تخیل حسن و جمال کے اس جمگھٹے کے قریب آکر، اس کے گرد گھوم کر، اس کے چاروں طرف پرواز کر کے، کچھ تاثرات، کچھ جذبات لیتا ہے اور کہیں دور نکل جاتا ہے:

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور — سراپا نورِ ایزد چشم بد دور!
تبسّم بسکہ در لب ہا طبیعی ست — دہن ہا رشکِ گل ہائے ربیعی ست
بہ لطف از موجِ گوہر نرم رو تر — بہ ناز از خونِ عاشق گرم دو تر

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش — بہارِ بستر و نوروز آغوش
زتابِ جلوۂ خویش آتش افروز — بتانِ بت پرست و برہمن سوز
بہ سامانِ دو عالم گلستاں رنگ — زتابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
رسانده از ادائے شست و شوے — بہ ہر موجے نویدِ آبروے
قیامت قامتاں مژگاں درازاں — زمژگاں برصفِ دل نیزہ بازاں
بہ مستی موج را فرمودہ آرام — زنغزی آب را خشیدہ اندام
فتادہ شورشے در قالبِ آب — زماہی صد دلش در سینہ بے تاب
زبس عرضِ تمنا میکند گنگ — زموج آغوش ہا وا می کند گنگ

یہ شعر حسینانِ بنارس کی تصویر پیش نہیں کرتے لیکن سرور و اضطراب کی اُس کیفیت سے ضرور لبریز ہیں جو اِس حسن کے نظارے سے غالب کے دل پر طاری ہوئی۔ اس سے کچھ زیادہ وضاحت اُس دلآویز (مگر غالباً" خیالی) نقش میں ہے جو ۱۸۴۰ کے قریب لکھی ہوئی ایک مسلسل فارسی غزل میں زندگی کے نور سے جھلملا رہا ہے۔ دورِ پختگی کا یہ مرقع ایک نقشِ تنہا کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بھی بدنی تصویر سے کہیں زیادہ ایک ذہنی کیفیت کا عکس جھلکتا ہے۔ اِس نقش کا موضوع ایک حسین عورت ہے جو پہلے مطلوب تھی، اب طالب ہے، اور راہِ طلب میں خود بھی انھی منزلوں سے گزرتی ہے جن میں کبھی دوسروں کے عشق کا امتحان ہوتا تھا:

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ برخاکش نگر
واں سینہ سودن از تپش برخاک نمناکش نگر

برقے کہ جان ہا سوختے دل از جفا سردش ببیں
شوخے کہ خوں ہا ریختے دست از حنا پاکش نگر

آں کو بہ خلوت با خدا ہر گز نہ کردے التجا
نالاں بہ پیشِ ہر کسے از جور افلاکش نگر
تا نام غم بردے زباں می گفت "دریا درمیاں!"
دریائے خوں اکنوں رواں از چشمِ سفاکش نگر
آں سینہ کز چشمِ جہاں مانندِ جاں بودے نہاں
اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر

دراصل غالب کو حسن کی تصویر سے نہیں' اس کی تاثیر سے سروکار ہے۔ جہاں کہیں اسے حسن کی مصوّری مقصود ہے' وہاں اس نے صرف اشارات سے کام لیا ہے اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیّل پر چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کا شعور تخلیق کے عمل میں شاعر کے ساتھ شریک رہتا ہے۔ مثلاً یہ شعر لیجیے:

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟

اب یہ ہمارے تصوّر کا کام ہے کہ آئینے میں دمکتے ہوئے اس شوخ و شنگ چہرے کے خال وخد کی نقش بندی کرے۔ شاعر نے دوسرے مصرع میں ہماری رہنمائی کے لیے ایک ہلکا سا اشارہ اس کے متعلق کر دیا ہے کہ شہر بھر میں اس چہرے کی مثال نہیں ہے۔ اِسی قسم کے اَور اشعار اردو فارسی کلام میں بہ آسانی مل جائیں گے:

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

دعویِ او را بود دلیل بدیہی
خندۂ دنداں نما بہ حسن گہر زد

شوخیِ شمیش بیں جنبشِ نسیمش بیں
غنچہ راست آہنگے سرو راست رفتارے

لیکن یہ اشارات کسی پیکرِ حسن کے قریب پہنچ کر میسر آتے ہیں۔ بعض دفعہ اس پیکر کے صرف بیرونی حاشیے کی جھلک ہم کو دکھا دی جاتی ہے۔ وہ پیکر کیسا ہے، جس کا یہ حاشیہ ہے؟ اس میں ہمارے تخیل کی رسائی کا امتحان ہو جاتا ہے:

گلے بر گوشۂ دستار داری
زہے بختِ بلندِ باغباناں

اردو میں یہی مضمون زیادہ خوبی سے بیان ہوا ہے:

ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں!

ایک منزل اس سے بھی آگے ہے جہاں غالب حسن کی توصیف تو کیا، اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ لیکن کسی ایسی لطیف چیز سے اس کی نسبت تلاش کرتا ہے کہ ہمارا تصور خود پیکرِ حسن کی لطافت تک جا پہنچتا ہے:

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

اس سلسلے میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اشعار سے غالب کی ذاتی پسند یا رجحان کا اندازہ کرنا ممکن ہے یا نہیں؟ غالب کے لیے نسائیت کے حسن کا معیار

کیا ہے؟ اس کی نظر حسن کے کن پہلوؤں پر جاتی ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمارے پاس دو ہی ذریعے ہیں۔ اشعارِ متعلقہ میں اندازِ بیان کی انفرادیت اور تکرارِ مضمون۔ جہاں ان دو کیفیتوں میں سے کوئی ایک موجود ہو یا دونوں جمع ہوں، وہاں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالب کے شخصی ذوق کا اظہار ہُوا ہے۔ اس خاص نکتے کی چھان بین کے لیے بیشتر مواد "نسخۂ حمیدیہ" میں ملتا ہے۔ حسن کے وہ پہلو جن کا خطاب روح کے بجائے حواس سے ہے "نسخۂ حمیدیہ" میں رہ رہ کر سامنے آتے ہیں۔ بعد کے کلام میں حسن کی رُو در رُو ملاقات کم میسر ہوتی ہے۔ اس کے بجائے شاعر کے ذہن میں حسن کی پیدا کی ہوئی کیفیتیں زیادہ ملتی ہیں۔ ان ابتدائی اشعار کا تعلق غالب کی نوجوانی سے بلکہ بارہا اُس دورِ بُلوغ سے ہے جو تمہیدِ شباب ہوتا ہے۔ اس پُرجوش زمانے میں حسنِ ظاہری کی کشش عروج پر تھی اور اردو غزل کی مقبولِ عام روش سے نو عمر شاعر کی بغاوت نے اظہار و بیان کے معاملے میں اسے بہت کچھ ڈھیل دے رکھی تھی۔ اس زمانے میں ہاتھ پاؤں کی مہندی اور ہونٹوں کی مسّی کا خاصی کثرت سے ذکر ہے مگر یہ آنی جانی دلچسپیاں معلوم ہوتی ہیں۔ برعکس اس کے نسوانی حسن کے تین عنصر ایسے ہیں جنھیں غالب کے تخیل میں نمایاں اور مستقل جگہ ملی ہے۔ ہم ان کا ذکر یہاں الگ الگ کریں گے۔

ایک خاص کیفیت جو اس زمانے میں اور اس کے بعد بھی توجہ کو بدستور دعوت نظر دیتی رہی، قامتِ یار کی رعنائی ہے:

اگر وہ سروقد گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

دوسرے اجزائے حسن مثلاً چہرے کی خوبی کا ذکر بھی ضرور ہے لیکن بارہا اس ذکر کے

ساتھ خوبیِ قامت سے شاعر کی دلی وابستگی کا اظہار شامل ہوتا ہے:

اسد بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سروقامت ہے

شاعر کے ذوق نگاہ میں "قد و رخ" کی لطافت کا یہ امتزاج عنفوان شباب کے بعد کی منزلوں میں بھی قائم رہا' لیکن اس سے قطع نظر حسن قامت کو بجائے خود اس کے تخیل میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ پورے کلام کو اس غرض سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بدن کی لچک اور موسیقیت یعنی پورے پیکر کی شوخی و رعنائی پر غالب کی نظر بار بار اٹھتی ہے:

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے!

گویا وہ عنصری وجود جو تمام کشش کا سرچشمہ ہے' اب شاعر کے سامنے نہیں ہے؛ ایک طوفانِ تابش و رنگ کی لہریں ہیں جو پیہم اٹھتی چلی جاتی ہیں:

بہ مستی چتر بستن ہائے طاؤس ست پنداری
نشستِ ساقی و انگیز مینائے مئے نابش

ہوائے ساقیے دارم کہ تابِ ذوقِ رفتارش
صراحی را چو طاؤسانِ بسمل پَر فشاں دارد

یہ وہ عالمِ ذوق ہے جہاں پہنچ کر غالب کے لیے خواہش کی تسکین سے کہیں زیادہ پیکرِ محبوب کا لطفِ نظارہ عزیز ہے:

نہیں نگار کو الفت' نہ ہو' نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے!

"شکل نہالی" ، "سرو قامت" وغیرہ تشبیہات یا اس قسم کے مضامین سے جیسے : "برتر بیتم از نخل قدت جلوہ فروبار" غالب کے پڑھنے والے مانوس ہیں۔ ان کو محض ایک شاعرانہ رواج کی تقلید قرار دینا بالکل ممکن ہے۔ لیکن جب ایک ہی خیال عالمِ شعر میں بار بار نمودار ہو تو صرف اس بنا پر کہ کوئی دوسرا بھی اس احساس میں شریک ہے' اسے شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر سے وابستہ نہ سمجھنا غلط قسم کی احتیاط ہے۔ "لطفِ خرام" کی ترکیب غالب نے بہ تکرار استعمال کی ہے۔ اسے محض اتفاقی تکرار ماننا دشوار ہے۔ اس کے پیچھے ایک ولی کیفیت کا لطف و ذوق ضرور موجود ہے۔ غالب کے لیے عورت کے موزوں پیکر میں وہ سحر ہے کہ اس کا عکس سطحِ آب پر پڑ جائے تو موجیں دم بخود ہو کر وہیں کی وہیں تھم جائیں۔ یہ مبالغہ ہے مگر لطف سے خالی نہیں :

تا در آب افتادہ عکسِ قدِّ دل جُویش
چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

یہ وہی کیفیت ہے جو بنارس والی مثنوی میں :

بہ مستی موج را فرمودہ آرام
ز نغزی آب را بخشیدہ اندام

بن کر ظاہر ہوئی ہے۔ تناسبِ اعضا کی مستی و ذوق کا شعور ایامِ شباب کے ایک شعر میں انتہا کو پہنچ گیا ہے' جہاں سیہ فام بدن کی نزاکتِ اعضا کی یوں داد دی ہے :

رچ گیا جوشِ صفائے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیہ فامی تری!

بدن کی طرف یہ واضح اشارات عنفوانِ شباب کے بعد بتدریج کم ہوتے گئے' لیکن قامتِ یار کی رعنائی کا لطف اگر شعور و لاشعور میں اپنے جھلملاتے نقش نہ چھوڑ گیا

ہوتا تو دورِ پختگی کی یہ تجلّیات کہاں نصیب ہوتیں:

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

ایں ست خلوت خانۂ روحانیاں کانجا ز دور
زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

بہ رخ نقاب چہ بندد کہ از فروزش رنگ
درونِ جامہ تواں دید نیز عریانش

اس قامت موزوں کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کو غالب نے جابجا اس طرح واضح کیا ہے کہ اسے شاعر کی شخصی پسند سے منسوب کرنا قرینِ قیاس ہے۔ یہ خصوصیت قامت کی درازی ہے جو غالب کے ہر رنگ میں، خواہ اس کا بھرم کھل جائے یا بنا رہے، عزیز ہے۔ اوپر جو شعر ابھی ہماری نظر سے گزرے ان میں "بختِ بلندِ باغباں" اور "اوجِ طالعِ لعل و گہر" کا اشارہ اسی درازیِ قد کی طرف نکلتا ہے۔ لیکن مختلف مقامات پر اس سے زیادہ صراحت بھی ملتی ہے۔ مثلاً یہ شعر:

بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم
ہر ایک داغِ جگر آفتابِ محشر ہو

صریحاً لمبے قد کی تعریف میں ہے۔ دورِ اول ہی کے ایک ایسے شعر میں قامتِ بلند کا ذکر ملتا ہے جس میں ذاتی احساس کی شدت بڑی وضاحت سے موجود ہے۔ بیان کی

عمومیت کے باوجود شعر کا رخ ایک خاص موقع کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ ایک عورت آرائشِ جمال میں مصروف بیٹھی ہے۔ اِسی دوران میں وہ کسی ضرورت سے اٹھتی ہے۔ گدرائے ہوئے بدن کی یہ نیم جنبش اس کے لمبے قد کو لطافت کا وہ ہچکولا دیتی ہے کہ اس کے حسن کے خطوط اور دائرے زندہ ہو جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی صناع نے اپنے شاہکار کی تخلیق کردی:

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

یہاں "مضمونِ عالی" سے قامتِ بلند مراد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مضمون قافیے کا بُجھایا ہوَا نہیں بلکہ قافیہ مضمون کی مناسبت سے تلاش کیا گیا ہے۔ مشابہتِ خیال کے لحاظ سے غالب کا ایک فارسی شعر بھی یہاں نقل کرنے کے قابل ہے:

چو غنچہ جوشِ صفائے تنش ز بالیدن
دریدہ بر تنِ نازک قبائے تنگش را

"جوشِ صفائے تن" کے بعد ہمیں "جوشِ صفائے زلف" کی طرف رجوع کرنا ہے۔ "قد و گیسو" کا یہ ساتھ' جوانی کے دنوں میں شروع ہوَا اور عمر بھر قائم رہا۔ سیاہ لمبے بالوں کی چمک غالب کی شاعری کے ہر دَور کو اِس طرح منور کرتی ہے کہ سرسری مطالعہ کرتے ہوئے بھی اس کی جھلکیاں بار بار سامنے آتی ہیں۔ "زلفِ سیاہ" یوں بھی اردو اور فارسی شاعری کا خاص الخاص سرمایہ ہے لیکن غالب نے حسبِ معمول اس پر بہت سے ذاتی اضافے کیے ہیں اور اپنی شخصیت کے پیچ و تاب کو اس خلوص و جوش سے شاملِ حال کیا ہے کہ اس پامال مضمون میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

نوجوانی کے دنوں کے اس ایک مصرع کو دیکھیے کہ کس طرح ایک پوری زندگی کی فریاد سے لرز رہا ہے ؏

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اس زمانے میں نوجوان شاعر کا دل زلفِ سیاہ کے سائے میں طرح طرح کے مبہم، غیر متشکل جذبات سے اُلجھتا ہے اور اس کشمکش کے وہ نقوش دیوان میں چھوڑ گیا ہے جن پر صبحِ جوانی کی شبنم آج بھی اسی طرح تازہ ہے:

تُو اور آرائشِ خمِ کاکل
مَیں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

یاد کر وہ دن کہ اک اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

زلفِ پری بہ سلسلۂ آرزو رسا
یک عمر دامنِ دلِ دیوانہ کھینچیے

زلف خیال نازک و اظہار بے قرار
یا رب بیان شانہ کش گفتگو نہ ہو

اس آخری شعر میں زلف کا تصوّر صرف ایک نئی تشبیہ کا سرمایہ بنا ہے لیکن زلف کا عینی وجود شاعر کے حواس سے کبھی دور نہیں ہوتا ؏

ابھی آتی ہے بو بالش کی اس کی زلفِ مشکیں سے

اِسی بالوں کی خوشبو کے موضوع پر ذیل کا فارسی شعر دیکھئے۔ اس کے مصرع ثانی کے رقص کی مستی گھنٹیوں کی ٹن ٹن اپنے ساتھ لاتی ہے:

بہ مشامے کہ رسد نکہتِ زلفِ سیہے
کہ ہمہ بے خودیِ بادِ صبا خیزد ازو!

اور اس کیفیت کو پہنچنے کے بعد بہشت کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم
ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں رفتم

زلفش نگر آنگہ بہ منِ شیفتہ بنمائے
گر سنبلِ فردوس چنیں غالیہ فام است

"وہ حلقہ ہائے زلف کہیں میں ہیں اے خدا" کے نعرۂ الاماں سے لے کر "نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں" کی سرمستی تک غالب نے زلفِ محبوب کے ہر تار کو چھیڑا ہے۔ کہیں اپنے اس مخصوص تبسّم کے ساتھ جو ہونٹوں پر آنے کے بجائے آنکھوں میں جھلکتا ہے' اس نے یہ پُرلطف بد دعا دی ہے:

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمھارے آئیو اے طُرّہ ہائے خم بہ خم آگے!

اور کہیں وہ خدا کے وحدت الوجودی تصور پر غور کرتے کرتے حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اگر اس ذات واحد کی یکتائی حقیقت ہے تو پھر یہ دوسری حقیقت' حسن' کہاں سے ' کیوں کر نمودار ہوتی ہے!؟ ع

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟

غالب کے لیے جو تین عناصرِ حسن' بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے تیسرے اور سب سے بڑے جُزو کا ذکر اس نے اسی کے مقابل کے مصرع میں کر دیا ہے ع

نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟

اِس شعر میں زلف و نگاہ کا یہ ربط اتفاقی نہیں بلکہ غالب کے تصوّرِ حسن کی ایک گہری خصوصیت پر مبنی ہے۔ قدو گیسو کے باہمی تأثر کی طرح اس کے تخیّل میں زلف بھی نگاہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لطافتِ اعضا میں صفائے زلف کا عکس ہے' حلقۂ زلف میں شوخیِ نگاہ کی جھلک ہے اور پھر اس سے آگے نگاہ کی تیزی میں شعلۂ آواز ہے۔ چنانچہ دورِ اول کے ایک پُرلطف شعر میں زلف و نگاہ کا باہمی رشتہ اِس طرح قائم ہے:

حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

حقیقت یہ ہے کہ غالب کے نزدیک محبوب کی چشم و نگاہ کی لذتیں حسن کے سب سے بڑے انعامات میں داخل ہیں۔ زلفِ سیاہ کی طرح یہاں بھی چشمِ سیاہ (جو بارہا چشمِ سرمہ سا ہے) شاعر کے لیے سرمایۂ نشاط ہے۔ سُرگیں نگاہیں اسے پسند ہیں۔ یہ بات اس لیے دلچسپ ہے کہ شاعر کو رخسار کے غازے اور ہاتھ کی مہندی پر تو پھبتی سوجھتی ہے:

پوچھ مت رسوائیٔ انداز استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا' رخسار رہنِ غازہ تھا

لیکن آنکھ کا سرمہ ہمیشہ اعتراض سے بالا ہے بلکہ سرمے کا احسان آنکھ پر مسلّم ہے:

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

حسن و عشق کے شعرا میں سے شاید ہی کسی نے چشم و نگاہ کی ان تمام کیفیتوں کا، جو شرم گینی سے بے باکی تک پہنچتی ہیں، اِس ذوق و شوق سے منزل بہ منزل ساتھ دیا ہو جس سے غالب ان کی حُدی خوانی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے یہ کیف و سرور عنفوانِ شباب ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور ابتدائی کلام میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ان چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں کا رخ شاعر کی طرف نہیں ہے، وہ بظاہر اپنے آپ میں گم ہیں، لیکن نوجوان غالب تک خودبخود ان کا پیغام پہنچتا ہے:

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

لیکن اسی ابتدائی زمانے میں یہی آنکھیں کسی اَور رنگ میں بھی غالب کے سامنے آتی ہیں۔ اس زمانے کا لکھا ہوا یہ شعر ایک حسین و جمیل مرقع ہے:

نگاہِ یار نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی
دیا ابرو کو چھیڑ اور اس نے فتنے کو اشارت کی:

اس اندازِ نگاہ کے مقابل کی کیفیت بھی جابجا موجود ہے ؎

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط

جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسد

منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

غصّے کے اِس انداز کے ساتھ غم کی یہ تصویر بھی ملاحظہ فرمایئے ؏

قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

یا اِس قسم کے تصوّرات:

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

غالب نے چشم و نظر کے موضوع پر وہ رنگ برنگ مضمون پیدا کیے ہیں کہ سرسری طور پر دیکھیے تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کے سوا حسن کے سراپا میں اسے اور کوئی چیز بھائی ہی نہیں۔ غالب کے لیے ؏

"بہ کیمیائے نظری تواں فریفت مرا"

محض شاعری ہی نہیں، ایک حقیقت کا بیان ہے۔ اگر غور کیجیے تو ؏

"بہ نیم غمزہ ادا کرحقِ ودیعتِ ناز"

کی ملتجیانہ امید و بیم سے شروع کر کے ؏

"دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی"

کی فتح مند سرمستی تک پہنچتے پہنچتے غالب حسن و عشق کے بے شمار دفتر کھولتا ہے۔ ایک مژگاں کی شاعری ہی کو لے لیجیے۔ یہ غالب کے عشقیہ کلام کا ایک مستقل باب ہے۔ بے باک نظروں کی چبھن کے بیان میں بزمِ حسن کا یہ ترنگا انسانی نقشہ، ذرا اپنے تصور میں ملاحظہ کیجیے:

تُو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
مَیں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

اس کے برعکس نسوانی حیا کی اس حسین تصویر کو دیکھئے جس میں وہی درازیِ مژگاں ایک ادائے شرم کو آب و رنگ دے رہی ہے۔ جھکی جھکی آنکھوں کی نگاہیں زمین پر جمی ہیں جس سے پلکوں کی دلفریبی کچھ اَور نمایاں ہوگئی ہے۔ شاعر نے اپنے پُرلطف انداز میں اِس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے کہ اس کی نظریں آنکھوں سے باہر آنے کے لیے بے تاب ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ لمبی پلکوں سے پوری نہیں اُتر سکتیں :

نہ از شرم است کز چشمِ وے آساں برنمی آید
نگاہش با درازی ہائے مژگاں برنمی آید

اِسی طرح ایک اور پُرلطف شعر میں شاعر پلکوں کو نگاہیں قرار دیتا ہے۔ یہ پلکیں دل تک نہیں پہنچ سکتیں مگر پھر بھی پہنچتی ہیں۔ اس مرقّع میں بھی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ شاعر لطفِ نگاہ سے محروم ہے مگر خلشِ مژگاں کا ذوق اس کے دل تک برابر پہنچ رہا ہے :

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

لطفِ نگاہ کی کم از کم ایک کیفیت ایسی ہے جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے کلام میں یہ کیفیت رہ رہ کر نمودار ہوتی ہے۔ ع

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا !

نسوانی حسن کی شاعری اتنی ہی وسیع ہے جتنی شاعری کی دنیا۔ لیکن اس کیفیتِ خاص کی مثالیں جو اِس وقت زیرِ نظر ہے اگر دنیا بھر سے بھی فراہم کی جائیں تو بھی حقیقت رسی، لطافتِ احساس اور حسنِ بیان میں غالب کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ مثلاً

اردو کے اس بے نظیر شعر کا لطف کبھی کم نہیں ہو سکتا:

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

اِس شعر کی نفسیاتی سچائی، معنوی لطافت اور اس کے دوسرے مصرع میں نگہ اور نگاہ کا صوتی فرق، مل جل کر وہ لطف پیدا کرتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس خاص طرزِ خیال سے قطع نظر غالب نے اسی لطفِ نگاہ کے مضمون سے اَور بھی طرح طرح کے نکتے پیدا کیے ہیں۔ جو لوگ ان سے بہرہ اندوز ہونا چاہیں، انہیں کلیات اور دیوان کے صفحات صلائے عام دیتے ہیں۔ اِس بارے میں غالب کے ذوقِ نکتہ سنجی کی تسکین جب صرف ایک حسین سے نہیں ہوتی تو دو حسینوں کو سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ فارسی کے ایک شعر میں اس پُرلطف صورت حال پر ایک مخصوص معنوی اضافہ یہ کیا ہے کہ نگاہ اور نُطق کے منصب کو باہم بدل دیا ہے:

چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحثِ ناز پیچیدن
نگہ در نکتہ زائی ہا، نفس در سرمہ سائی ہا

الغرض یہ ہیں غالب کے تصورِ حسن کے نمایاں اجزا۔ اب اگر اِسی حسن کو بطور ایک کُل کے دیکھیے تو دو نکتے بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ غالب کا محبوب ایک جاندار انسانی شخصیت ہے، محض ایک حسین نقش ہی نہیں۔ غالب اس کے حسن کی توصیف میں کوئی رسمی تشبیہ استعمال کرتا ہے تو فوراً اس تشبیہ پر کسی انسانی خاصے کا اضافہ کر کے اس نقش کو زندہ کر دیتا ہے:

چوں لعلِ تست غنچہ، امّا سخن نہ داند
چوں چشمِ تست نرگس، امّا حیا نہ دارد

غالب اپنے محبوب کی "آب و گِل" میں "فتنۂ شورِ قیامت" دیکھتا ہے کیونکہ "نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا" وہ شوخ و شنگ، بے باک، تُنک مزاج، بے وفا، غیر منطقی سبھی کچھ ہے مگر خون آشام درندگی کے اُن خصائص سے مبرّا ہے جو شعرا کے روایتی معشوق میں خواہی نخواہی موجود ہوتے ہیں۔ اس کی انسانی صورت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

دوسرا نکتہ جس کا ذکر یہاں مقصود ہے، اس سے کچھ زیادہ دلچسپ ہے۔ غالب حسن کا تصور کرتا ہے تو بارہا اسے سکون کے بجائے حرکت کی حالت میں دیکھتا ہے "موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کُتر گئی"۔ "لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر"۔ "لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ" میں شاعر کی ذہنی کیفیت بالکل واضح ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر مختلف اشعار میں یہ کیفیت بھی موجود ہے کہ حسن کے گرد و پیش کی جو چیزیں طبعاً" ساکن ہیں، وہ بھی شاعر کو عالمِ ذوق میں متحرک ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہ متحرّک حسن جب باغ کی روشوں پر خراماں خراماں نکلتا ہے اور سبز پوش درختوں کے درمیان اس کا پیکر کبھی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے، کبھی اپنی جھلک دکھاتا ہُوا گزرتا ہے تو یہ خاموش درخت بھی ایک عالمِ سرخوشی میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں:

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے!

اِسی غزل کے دو اور شعروں میں یہی کیفیت قائم ہے۔ پتھر کی دیواریں زندہ ہو جاتی ہیں اور ہمہ تن چشم آئینے طوطیوں کی طرح بولنے لگتے ہیں:

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طُوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

اس قسم کا ایک فارسی شعر سننے کے قابل ہے۔ اس شعر میں آئینے یا دیوار ہی پر نہیں، ایک عالم پر کیف چھا جاتا ہے اور زمین اس پیکر حسن کے ذوق رفتار سے تڑپ جاتی ہے:

بُتے وارم کہ گوئی گر بہ روئے سبزہ بخرامد
زمیں چوں طوطیِ بسمل تپد از ذوقِ رفتارش

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس زندگی سے بھرپور، متحرک، مضطرب حسن سے غالب کے دل و دماغ کو کیا تعلق ہے۔ بہ الفاظ دیگر غالب کا تصور عشق کیا ہے؟

غالب کو اپنے ترجمانِ عشق ہونے پر خود ناز ہے:

بلبلِ گلشنِ عشق آمدہ غالب ز ازل
حیف گر زمزمہ مدح و ثنا خیزد ازو

اور اپنے فنی منصب پر شاعر کی یہ تنقید بے جا بھی نہیں، اس لیے کہ غالب کی وسعتِ بیان کو "ظرفِ تنگنائے غزل" کے متنوع مضامین میں جو موقعے ملے، وہ قصیدے میں میسّر نہیں تھے۔ غزل کے کڑے سانچے میں ڈھل کر بھی غالب کے جوہرِ ذاتی کے نقوش چھپ نہیں سکے بلکہ جابجا اس طرح ابھرے ہیں کہ شاعر کے سن و سال کی مناسبت سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ نوجوانی کے اشعار میں والہانہ رندی کے مضامین ہمیں بار بار ملتے ہیں لیکن عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ عشق کا مفہوم بدلتا چلا جاتا

ہے اور ہم دورِ پختگی کے اِس عمیق و لطیف جذبے تک پہنچتے ہیں جس کی تدریجات ذیل کے اشعار میں جھلکتی ہیں:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

(قبل ۱۸۲۱)

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

(قبل ۱۸۴۷)

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

(قبل ۱۸۵۷)

نوجوانی کے اشعار میں عشق کے بدنی پہلو خصوصیت سے نمایاں ہیں۔ مثلاً بوس و کنار پر جو زور دورِ اول میں ہے وہ دیوان کے کسی اَور حصّے میں نہیں ملتا:

امیدوار ہوں تاثیرِ تلخ کامی سے
کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرّر ہو

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج
آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

اسی قسم کا ایک شعر نفسیات کے اس نظریے کی روشنی میں دلچسپ معلوم ہوگا جس کے مطابق ہمارے خواب ناآسودہ خواہشوں کی تشفی کا سامان بنتے ہیں :

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آتا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

"نسخۂ حمیدیہ" سے قطع نظر، متداول دیوان میں بھی اسی دور شباب کے اس قسم کے اشعار موجود ہیں جیسے "غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو" یا "غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں۔"

عشق میں بدنی لذتوں کی یہ طلب آگے چل کر بالکل غائب نہیں ہو جاتی لیکن عنفوانِ شباب کے وفور و جوش کے بعد اس کی کمی نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ بعد کے کلام میں اِس رنگ کے سب سے زیادہ قابلِ ذکر اشعار وہ ہیں جن سے کلیات کا قصیدۂ ہشتم شروع ہوتا ہے :

دوش آمد و بہ بوسہ لبم بر دہاں نہاد
رازِ دہانِ خویش بہ لب درمیاں نہاد
وانگہ بہ مغز ریزش راز از لب زباں
مُہرے ز بوسۂ دگرم بر زباں نہاد
چوں لب ز بوسۂ گنج گُہائے راز شد
بر گنجِ لب ز تیزیِ دنداں نشاں نہاد

لیکن یہ قطعہ محض ایک استثنا ہے۔ لمس بدن کی وہ آرزو، جس کے مرقعے "نسخۂ حمیدیہ" کے ایک بڑے حصے میں بہ کثرت موجود ہیں، بہ تدریج الشّاذ کالمعدوم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ گو نوجوانی میں غالب کا نظریۂ عشق کچھ اس قسم کا تھا:

ہے وصل، ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

لیکن وہی تمکین و ضبط، جس کا ذکر اس شعر میں ناپسندیدگی سے ہوا ہے، آہستہ آہستہ شاعر کی رندانہ وارستگی پر غالب آ جاتا ہے۔ خود جوانی کے پختہ اشعار میں یہ کیفیت نمودار ہو چکی ہے۔ مثلاً یہ مشہور شعر لیجئے۔ بوسے کی خواہش موجود ہے لیکن شاعر کا تأمّل و احتیاط دونوں قابلِ ملاحظہ ہیں:

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

یہ وہ منزل ہے جہاں "پیش دستی کر بیٹھنے" پر شاعر کو اظہارِ ندامت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے:

می ربایم بوسہ و عرضِ ندامت می کنم
اختراعے چند در آدابِ صحبت می کنم

اور پھر یہ نوبت بھی آتی ہے کہ اس کا عشق لمسِ ظاہری سے بے نیاز ہو جاتا ہے:

تا لب کشودۂ مژہ در دل دویدہ است
بوس لب ترا بہ ربودن چہ احتیاج؟

حسرتِ وصل از چہ رُو چوں بہ خیال سرخوشیم
ابر اگر بایستد بر لبِ جُوست کشتِ ما

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مژدۂ بوس و کنار اور جور و جفا دونوں نتیجے کے لحاظ سے ایک ہو جاتے ہیں:

جفا بر چوں منے کم کن کہ گر کشتن ہوس باشد
بہ ذوقِ مژدۂ بوس و کنارم می تواں کشتن

اب بھی محبت قرب چاہتی ہے لیکن لطفِ بوسۂ آغوش اب ناقابلِ ذکر ہے۔ اب شاعر کا احساس کچھ نئی کیفیتوں سے لذّت اندوز ہے:

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

پھر چاہتا ہوں نامۂ دل دار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کُتر گئی

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان چار شعروں میں سے دو ملاقات اور دو جدائی کی کیفیتیں پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نوجوانی میں عشق کے بدنی پہلوؤں پر غالب کی توجہ زیادہ ہے تو ضمناً ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اس حصّۂ کلام میں وصل کے کوائف زیادہ اور فراق کے مضامین کم بیان ہوئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ قدرتی طور پر عشق کے بدنی پہلوؤں کی شاعری بہت بڑی حد تک ملاقات کی شاعری ہے۔

نوجوانی کے بعد کے اشعار کا معتدبہ حصہ گویا اِس حقیقت کا اعتراف ہے کہ عشق میں جدائی بھی ایک جداگانہ لطف رکھتی ہے اور یہ حقیقت اس حصۂ کلام میں بتدریج زیادہ جلی اور خط کشیدہ ہوتی جاتی ہے مگر دورِ پختگی کے اشعار میں نہ صرف لذّتِ فراق کے عنصر کا اضافہ ہوا ہے بلکہ لذّتِ وصال کے مضامین میں بھی ایک قابلِ ذکر تبدیلی ہوئی ہے۔ اب وصال کے بدنی پہلو توجہ کا مرکز نہیں رہے۔ اب شاعر کی توجہ ان لطیف اور رنگ رنگ احساسات کا احاطہ کرتی ہے جو قُربِ محبت میں بظاہر ضمنی طور پر ہاتھ آتے ہیں۔ اسے اب نقشِ پا کی دلفریبی اور تقریر کی لذّت زیادہ عزیز ہے۔ شاعر کے تخیّل کا دائرہ اب بھی لطفِ وصال کے گرد گھومتا ہے لیکن لمسِ بدن کے نادیدہ مرکز سے دور دور۔ دائرے کا مرکز کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہے لیکن دائرے کے محیط سے اس کا خاص فاصلہ ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ اس فاصلے کا پیمانہ غالب کے اس قسم کے لطیف اشعار ہیں جن میں لمسِ بدن کی طرف صریح اشارہ ہے لیکن پھر بھی عنفوانِ شباب کی بے قابو رندی و سرمستی کا ابال معلوم نہیں ہوتے۔ ان میں لطافتِ اظہار کے ساتھ ساتھ جذبات پر وہ ضبط بھی صاف جھلکتا ہے جس نے ان معاملات کے بیان میں شاعر کے لیے ایک حد مقرر کر دی ہے۔ یہ وہ حد ہے جس نے غالب کے متداول دیوان کے تقریباً دو ہزار اشعار میں شاید صرف ایک مرتبہ تجاوز کیا ہے۔ لیکن اس ایک موقع سے قطع نظر حواس کی لذتوں اور جذبہ و بیان کی لطافتوں کے درمیان کی یہ حدِ فاصل اردو اور فارسی کلام میں ہر جگہ قائم ہے:

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

جوئے از بادہ و جوئے زعسل دارد خلد
لبِ لعلِ تو ہم این ست و ہم آن ست مرا

نے کف گرفتہ ساعد و نے لب ربودہ بوس
در ناخوشی' وصال' بہ ہجراں برابرست

اور ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ اشعار بھی غالب کے شعری معمول سے باہر کی دنیا سے آئے ہیں۔ دیوان اور کلیات سے اس نوعیت کی مثالیں بجز کاوش کے فراہم نہیں ہو سکتیں۔ غالب کا سرور عشق (دورِ اول کے اشعار سے قطع نظر) بالعموم یہ راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ ان معاملات میں اس کا احساس اس قدر نازک ہو گیا ہے کہ اس کا اظہار اکثر اس قسم کے معجزات بیان میں ہوتا ہے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

نہ دانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصور کردہ ام بگستنِ بندِ نقابش را

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اَور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

اب شاعر کی بے تابیوں کا ماحصل اس قسم کی دعوت وصال ہے۔ اشعارِ ذیل میں سے پہلے دو "نسخۂ حمیدیہ" سے ماخوذ ہیں:

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہانتاب اِدھر بھی !
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

درازیٔ شبِ ہجراں زحد گزشت ، بیا
فدائے روئے تو عمرِ ہزار سالۂ ما !

وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد
ہزار بار برو ، صد ہزار بار بیا

جسمانی وصال کے متعلق شاعر کے تخیّل نے جو پلٹا کھایا اس کی ایک دلچسپ مثال اس غزل میں ملتی ہے جس کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا ہے :

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

یہ "نسخۂ حمیدیہ" (قلمی) کی ایک سَو اکیسویں غزل ہے۔ یہ مطلع اور اس غزل کے پانچ اَور شعر دیوان کے متن میں درج ہیں۔ گویا ۱۸۲۱ یا غالباً" اس سے بھی پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ قلمی نسخے کے حاشیے پر شکستہ خط میں چار شعروں کا اضافہ نظر آتا ہے۔ یہ چاروں شعر لازماً" ۱۸۲۱ سے بعد کی تصنیف ہیں۔ ان میں سب سے پہلا یہ معنی خیز شعر ہے :

گر ترے دل میں ہو خیال "وصل میں شوق کا زوال؟"
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں!

"وصل میں شوق کا زوال!" اس رمز تک پہنچ کر بھی جسمانی حسن کی کشش شاعر کے لیے بدستور قائم رہی۔ غالب نے پورے پچاس سال تک شعر گوئی کی۔ اس نصف صدی میں ہر منزل پر وہ جسمانی حسن کو دعوتِ نظر کا سامان سمجھتا اور اس کے نظارے سے پوری طرح لذت اندوز ہوتا رہا:

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است
خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب

بہ ظاہر یہ طریقہ ہر کسی کا طریقہ ہے لیکن غالب اس میں اپنی اور عوام کی روش کے درمیان ایک بنیادی فرق کرتا ہے۔ غالب کا ذوقِ نظارہ بحیثیتِ مجموعی خالص ذوقِ جمال ہے۔ ہوسِ بدن نہیں ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ اہلِ نظر حسنِ نسوانی کے نظارے سے بے نیاز ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ اہلِ نظر حسن سے "عشق" کرتے ہیں، اس کی "ہوس" نہیں کرتے۔ "معنی" تک پہنچتے ہیں، "صورت" پر نہیں رک جاتے۔ آغازِ شباب کے طوفانی دور میں بھی غالب کو اس فرق کا احساس ضرور تھا ورنہ: "چشمِ پری شفق کدۂ راز ہے مجھے" کا مضمون پیدا نہ ہوتا اور نہ اس قسم کے بعض اور اشعار دورِ اول میں ملتے:

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں درپردہ "یارب ہا"

ابتدائی کلام میں ایسے اشعار کم یاب ہیں اور اسی لیے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں بھی شاعر حسن کے چہرے پر بغیر خواہش کے نظر ڈالنے کی کیفیت سے آشنا تھا:

نے سر و برگِ آرزو نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تُو ہم کو بھی آشنا سمجھ

لیکن یہ شعر عشق کے عام موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جگہ ہمیں بحث صرف لذتِ دیدار کے مضمون سے ہے جسے غالب جنسی خواہش کے مضمون سے عادۃً الگ رکھتا ہے۔ اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں:

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاط دل
ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا ؟

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اے روئے تو بہ جلوہ در آوردہ رنگ را
نقشِ تو تازہ کردہ بساطِ فرنگ را

نہ دارد حاجتِ لعل و گہر حسنِ خداداوت
عبث در آب و آتش راندۂ بازارگاں را

غالب نے جوانی کے دنوں میں کلکتے کی سیر کی تھی۔ اُس وقت کلکتہ انگریزوں کا

صدر مقام اور آبادی کے لحاظ سے نیم یورپی شہر تھا۔ یہاں حسن فرنگ کی پوری بہار غالب کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ برسوں بعد غالب نے جو مشہور قطعہ کلکتے کے حسن و خوبی کے بیان میں لکھا اس میں شاعر کے ذوقِ جمال کو زیادہ اور جنسی خواہش کو بہت کم دخل ہے۔ حسنِ فطرت کے ساتھ نسوانی حسن اور ان دونوں کے ساتھ ذائقہ و زبان کی روزمرہ کی لذتوں کو اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ انسان اور فطرت کے حسن کی یہی تخیلی یگانگت بلند تر سطح پر ذیل کے مشہور مطلع میں بھی ملتی ہے:

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب کے ذوقِ نظر کی کیفیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نمایاں طور پر "جمالیت" کے قریب اور "جنسیت" سے دور ہے۔ اس کا ایک اور امتیاز اس کی فلسفیانہ شدّت ہے۔ شاعر کو محض ایک تماشائی کا اندازِ نگاہ پسند نہیں ہے۔ وہ یوں سراپا نظارہ بن جاتا ہے کہ اس کے روح اور جسم کی تمام قوتیں اس کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہیں۔ وہ حسن کو صرف دیکھتا ہی نہیں، اس کے نظارے میں کھو جانا چاہتا ہے:

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا [1]

۱۔ دورِ اول کے ایک شعر میں شوقِ ہم آغوشی کی یہی شدت نظر آتی ہے:

اسد جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پرسیدنی جانے

یہ وہ شدید جذبہ ہے جس میں اپنے علیحدہ وجود کا احساس اسے ایک بوجھ سا معلوم ہونے لگتا ہے:

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

یہ مقام اُس منزل کے قریب ہے جہاں صرف حسن رہ جاتا ہے، عشق نہیں رہتا۔ جہاں شاہد و مشہود ایک ہو جاتے ہیں:

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

نوجوانی کے دنوں میں بھی غالب ذوقِ نظر کی اس شدّت اور گہرائی سے آشنا تھا۔ ذیل کا شعر اگر دورِ اول کی یادگار نہیں ہے تو بھی اس زمانے کے قریب کا لکھا ہوا ضرور ہے۔ کم از کم اِتنا یقینی ہے کہ جس وقت یہ لاجواب شعر موزوں ہوا شاعر نے اپنی عمر کا چوبیسواں سال ابھی ختم نہیں کیا تھا:

خبر نگہ کو، نگہ چشم کو، عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

ذوقِ نظارہ کی فلسفیانہ شدّت حسن سے غالب کے ذہنی تعلق کا صرف ایک پہلو ہے۔ "مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے" مگر یہ کامیابی شاعر کی معراجِ آرزو نہیں ہے۔ ایسے لمحے آ جاتے ہیں جب اس کا دل کسی اِس سے بھی زیادہ لطیف اور مکمل تسلّی کے لیے تڑپتا ہے جس میں آنکھ اور کان دونوں برابر کے شریک ہیں:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

شاعر کے لیے لطفِ گفتار کی یہ طلب اِتنی سچی اور خالص ہے کہ گفتگو کا مضمون اس لطف پر قطعاً" اثرانداز نہیں ہوتا' نہ تلخ باتیں آواز کی شیرینی کی لذت کو اس کے لیے کم کر سکتی ہیں:

بہ خشم ناسزا می گوید و از لطفِ گفتارش
گماں دارم کہ حرفِ دل نشینے بعد ازیں گوید

ایک اور جگہ کہا ہے:

دعا کدام ؟ وچہ دشنام ؟ تشنۂ سخنیم
بہ کامِ ماست زباں چوں زباں بجنباند

یہی خیال اردو میں اِس سے بھی زیادہ خوبی سے موزوں کیا ہے:

مرتا ہوں اس آواز پہ ' ہرچند سر اُڑ جائے
جلّاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اَور!"

"مضمون" سے قطع نظر کیجیے اور صرف "انداز" گفتگو کو لیجیے تو بعض باتیں ایسی ہیں جو عیوبِ گفتار میں گنی جاتی ہیں۔ مثلاً لُکنت۔ لیکن محبت کسی عیب کو نہیں پہچانتی۔ جس سے محبت ہو اِس کے منہ سے باتوں کا رک رک کر نکلنا بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ اِس بظاہر انوکھے احساس پر شاعر نے اپنے اِس لطیف شعر کی بنیاد رکھی ہے:

زلکنت می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہر بارش
شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویش است گفتارش

یہ سب لطیف اور لطیف تر کیفیتیں عشق کو حواس سے ملتی ہیں۔ مگر حواس کی بخشی ہوئی بلند سے بلند لذتیں بھی اس روحانی سرور سے نیچے ہیں جس میں عشق کسی

بیرونی تسلی کا محتاج نہیں رہتا بلکہ خود اپنے وجود سے تقویت اور اطمینان حاصل کرتا ہے ع

لذّتِ عشقم ز فیضِ بے نوائی حاصل است

یہ جذبہ حواس کی لذتوں سے شروع ہو کر لطیف سے لطیف تر شکلیں اختیار کرتا ہوا بالآخر روح کی بلندیوں تک پہنچتا ہے اور وہاں ایک اخلاقی جوہر بن کر چمکتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری کے عام حالات کا خیال کیجئے تو اس اخلاقی جوہر کا ظہور عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ اس شاعری میں عشق رات دن کی بے کاری اور لاأبالی پن کا دوسرا نام ہے۔ عاشق ہوش و خرد سے بے نیاز اور معشوق بے وفا و ستم پیشہ ہوتا ہے لیکن دراصل یہی دشواریاں اور یہی بیوفائی و ستم پیشگی انسانی فطرت اور اس کے ممکنات کو ظاہر ہونے کے لیے للکارتی ہیں اور جیسا شاعر کا ظرف ہوتا ہے ویسا ہی اخلاقی کمال اس کے تصوّرِ عشق میں نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ جذبہ کہیں محض دل لگی کا سامان ہے اور کہیں موت و حیات کی بازی بن جاتا ہے۔ اس دوسری صورت میں سب سے پہلے عشق کی شدّت اور خلوص خود عشق کے وجود کی سفارش بنتے ہیں اور پھر دنیا کی نعمتوں اور مسرتوں کو وہ مناسب مقام دیتے ہیں جہاں ایثار کا پہلا قدم پڑتا ہے۔ زندگی کی قدروں کا یہ نیا تصور زندگی کو ایک بالکل نیا اور حیرت انگیز مفہوم دیتا ہے :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی ' درد لادوا پایا

اس انکشاف کے بعد متاعِ دنیوی کی کوئی حقیقت نہیں رہتی بلکہ اس کی بربادی انسان کی روحانی عظمت کے فروغ کا بہانہ بنتی ہے :

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اور ظاہر ہے کہ ایسے عشق کے بغیر زندگی رائیگاں ہے:

تا فتنہ در نظر نہ نہی از نظر چہ سود؟
تا دشنہ برجگر نہ خوری از جگر چہ حظ ؟

اب حواس کی لذتوں کی ابتدائی منزل اتنی پیچھے رہ گئی ہے کہ شاعر اسے بہ خوشی دشمن کی نذر کرنے پر آمادہ ہے۔ اپنے لیے اس نے روح کے سرور کا بلند مقام چن لیا ہے:

نظر فروز ادا ہا بہ دشمن ارزانی
بہ من سپار اگر داغ سینہ تابے ہست !

اب شاعر کو غمِ عشق پر ناز ہے اور اسی غم میں اسے خوشی ہے:

اے کہ بہ دیدہ نم زتست وے کہ بہ سینہ غم زتست
نازشِ غم کہ ہم زتست خاطرِ شاد می دہد

اگر "خاطرِ شاد" کا مفہوم یہی ہے تو پھر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں عشق کی راہ میں سختیاں جھیلنے کا موقع ملے:

داغم ز عاشقاں کہ ستم ہائے دوست را
نسبت بہ مہربانیٔ گردوں نہ کردہ کس

یہ سختیاں عشق کے انعاماتِ خاص میں سے ہیں اور بلند فطرت انسان کو وہ ارزاں عشق قبول ہی نہیں ہے جس میں یہ انعامات ہر کسی کو بلا تمیز نصیب ہوں:

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

یہی ستم کیشی دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ جس شخص کو اس آگ میں سے

گزر کر روح کا گداز مل چکا ہے وہ بہشت کی نعمتوں کا مستحق ہے۔ جسے اس آگ میں جل کر پاک ہونا نصیب نہیں ہوا وہ جنّت کے قابل نہیں ہے:

یارب بہ زاہداں چہ دہی خلد رایگاں
جورِ بتاں نہ دیدہ و دل خوں نہ کردہ کس

جس عشق کی بلندی کا معیار یہ ذوقِ ستم ہو اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہو سکتا کہ معشوق کا کردار، اخلاق کے سماجی اور مقبولِ عام ضابطوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ بلکہ معشوق جس قدر حسنِ خلق اور وفا سے دور ہے، اسی قدر عاشق کو اپنی انفرادی شخصیت کے ارتقا کا موقع بہم پہنچتا ہے۔ غالب نے معشوق کی سیرت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں بجائے کسی اخلاقی خوبی کے تیزیِ طبیعت اور شوخیِ مزاج کو خاص طور پر جلا دی ہے۔ ذیل کے مصرعے جن شعروں سے لیے گئے ہیں ان پر غور کیجیے: "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے؟" "کہوں جو حال تو کہتے ہو مدّعا کہیے" "الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ" "کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی" "میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی" "سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا" "ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اَور" "کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا۔" حقیقت یہ ہے کہ غزل میں معشوق کی اخلاقی سیرت کے متعلق سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اخلاقی کمال حسن سے نہیں، عشق سے حاصل ہوتا ہے اور عشق کے تقاضے "دین و دل" کے تقاضوں سے بہت بلند ہیں۔ دیوان کے ایک لاجواب شعر میں غالب نے یہ مضمون بڑے جوش و خروش سے بیان کیا ہے:

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!

لیکن اس والہانہ جوش و خروش کے باوجود غالب کے عشق میں نہ حافظ کی شیرینی اور سادگی و برجستگی ہے، نہ میر کا سوز اور عجز و نیاز۔ اس کی ایک وجہ غالب کی فطری عقلیت اور تحلیلی اندازِ فکر ہے، چنانچہ خود کہتا ہے:

ہم نکتہ سنجِ عشقم و ہم نکتہ دانِ علم
ناہید ساز و مشتریم طیلساں دہد

غالب کے عشقیہ کلام میں اس خصوصیت کی دوسری وجہ غالب کی انتہائی خودداری اور خودنگری ہے جس کے ہوتے ہوئے میر کی اُفتادگی اور سوز کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح حافظ اور غالب کی فطرت میں بھی ایک بنیادی فرق ہے۔ حافظ میں عقل سے زیادہ احساس پر انحصار ہے۔ غالب میں احساس سے زیادہ عقل کو حصّہ ملا ہے لیکن اس مجموعی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے نقّاد کو وہی مشکل درپیش ہے جس سے غالب کو سمجھتے وقت کسی صورت مفر نہیں ہوتا۔ یعنی غالب کے متعلق کوئی بھی کلیہ وضع کیجیے، شاعر کی سیرحاصل شخصیت طرح طرح کے استثنا ضرور مہیا کر دیتی ہے۔ سادگی اور سوز و گداز کی مثالیں بھی غالب کے کلام میں ضرور مل جاتی ہیں، جیسے ذیل کے یہ تین شعر:

جان تم پر نثار کرتا ہوں
مَیں نہیں جانتا وفا کیا ہے

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

زمن بہ جرمِ تپیدن کنارہ ی کردی
بیا بہ خاکِ من و آرمیدنم بنگر

لیکن اس قسم کے اشعار غالب کے معمولات میں شامل نہیں ہیں۔ ان کی نوک پلک کی جنبشوں میں غالب کے ہاتھ کی صفائی موجود ہے لیکن عقل کا وہ کڑاپن اور ارادے کا وہ تناؤ، جن سے دیوان اور کلیات کے ہزار ہا ابیات حصار بند ہیں، ان میں نظر نہیں آتا۔ یہ شعر شاعر کی افتادِ طبع کا اعلان نہیں کرتے۔ ان شعروں کے ساتھ کے چند شعر آپ کو بجز تلاش کے ہاتھ نہیں آئیں گے اس لیے انھیں بطور نمونۂ کلام کے پیش کرنا غلط ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب شاعر یہ کہتا ہے:

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

تو ہمیں کسی قدر حیرت ہوتی ہے کہ اس "عجز و نیاز" کا ذکر شاعر نے کب اور کہاں کیا تھا کیونکہ ہم نے تو جب دیکھا شاعر "اس کے دامن" کو کم و بیش سختی سے کھینچتا ہوا نظر آیا۔ غالب کا اپنا نفس اس قدر مستحکم ہے کہ اس کا عام اندازِ کلام یہ ہے:

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

اِن پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

جلوہ کن ' منت منہ ' از ذرہ کمتر نیستم
حسن باایں تابناکی آفتابے بیش نیست

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے ' یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بَلا ہے !

لطف یہ ہے کہ جہاں غالب اعترافِ عجز پر آمادہ ہو وہاں بھی بسااوقات لہجے کی سختی سے یہ گمان ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کو دعوتِ مقابلہ دے رہا ہے :

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

ذوق و سرور کے عالم میں بھی غالب کی یہ "خود مرکزیت" بار بار ابھر آتی ہے۔ اس مشہور پُرکیف مسلسل غزل کو پڑھیے جس کا مطلع ہے:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

اِس غزل کے چند شعر یقیناً ایسے ہیں جو عشق کی خالص سرمستی سے لبریز ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم
گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

لیکن اِسی غزل میں ایسے شعر بھی ہیں جو کیفِ عشق سے کہیں زیادہ غالب کے اپنے مستحکم نفس سے لبریز ہیں:

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

اپنی "خود مرکزیت" کی تاویل غالب نے اپنے لطیف ترین ظریفانہ انداز میں یوں کی ہے:

سچ کہتے ہو خودبین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئنہ سیما مرے آگے

غالب کا رشک جسے عام طور پر محض اس کے انداز بیان کی جدت طرازی سمجھ لیا جاتا ہے، دراصل اس کے سماجی ماحول سے اس کی شخصیت کے اسی پہلو کی ٹکر کا نتیجہ ہے:

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

اسی خودداری و خود نگری کا ایک دوسرا پہلو وضع داری ہے جس کا غالب کو اتنا خیال ہے کہ ملاقات کی مسرت کو اس پر بے تکلف قربان کر دیتا ہے:

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

یہی جذبہ اس قسم کے شعروں کا پس منظر ہے:

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یا بہ بساطِ دلبری عام مکن ادائے لطف
یا ز نگاہِ خشمگیں مژدۂ امتیاز دہ

ابھی ہم نے یہ کہا تھا کہ غالب کی فطری عقلیت اس کی نیازمندی و سرافتادگی کو سدِ راہ ہے۔ جو شخص بات بات میں معاملہ شناسی کے رموز کھولتا ہو اسے عجز و الحاح

سے قدرۃً" کم سروکار ہوتا ہے اس لیے کہ معنی آفرینی اور نکتہ طرازی دونوں زار نالی کے حریف ہیں۔ مثلاً ع

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے

ایک بالکل قدرتی درخواست ہے لیکن شاعر کی ذہنی ذکاوت مصرعِ ثانی میں ایک غیرمتوقّع لطیفہ پیدا کرتی ہے ع

کچھ نہیں گر تو عداوت ہی سہی

اِسی قسم کی التجا اِس فارسی شعر میں بھی ہے مگر یہاں ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے:

اگر نہ بہرِ من از بہرِ خود عزیزم دار
کہ بندہ خوبیِ او خوبیِ خداوندست

یا رشک کے مضمون میں یہ جدت ملاحظہ کیجئے ع

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف

بالکل صاف بات ہے۔ لیکن شاعر فوراً اپنے آپ کو تسلی دیتا ہے کیونکہ ع

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ان اشعار کی خوبی مسلّم، لیکن اس خوبی کا نام نہ نرمی و شیرینی ہو سکتا ہے اور نہ سوز و گداز۔

غالب کی عقلیت بارہا مضامینِ عشق میں بھی دلیل آرائی کے موقعے ڈھونڈتی ہے۔ کسی ایسے شخص سے عجز و نیاز کی زیادہ امید رکھنا لاحاصل ہے جو عشق کے معاملات میں بھی بحث و استدلال کا دروازہ کھول دینے کا عادی ہو:

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہ ناممکن ہے کہ دوسری طرف سے کوئی غلط دلیل پیش ہو اور غالب چپ رہ جائے۔ اَور نہیں تو اس کے لیے تعریضاً "کم از کم اِتنا کہہ دینا لازم ہو جاتا ہے کہ "بجا کہتے ہو' سچ کہتے ہو' پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو" گالی کے جواب میں وہ خواہ دعا ہی دے لیکن کوئی نہ کوئی جواب دینا اس پر فرض ہے ؎

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب ؟

کلیات میں ایک پُرلطف شعر اِسی موضوع پر ملتا ہے :

خاموشیٔ ما گشت بدآموز بتاں را
زیں پیش وگرنہ اثرے بود فغاں را

اِس معاملے میں غالب کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا :

ہر گونہ رنج کز تو در اندیشہ داشتم
ہم با تو ور مباحثہ گفتم بہ پند تو

یہی عقلیت جنونِ عشق میں بھی غالب کے ہاتھ سے ہوش کا دامن چھٹنے نہیں دیتی۔ وہ اس دیوانگی کے عالم میں صحرا کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی ناگہاں منزلِ محبوب کے پاس جا نکلتا ہے لیکن اپنی ان مجنونانہ حرکات کو اس طرح سلامتِ طبع سے دیکھتا ہے جیسے عشق میں کوئی اَور شخص مبتلا ہے اور وہ خود محض ایک تماشائی ہے :

گوشۂ ویرانہ را آفتِ ہر روزہ ام
منزلِ جانانہ را فتنۂ ناگاہیم

"آفت" اور "فتنہ" ان دو لفظوں کے استعمال نے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے کیونکہ ان سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاعر خود اپنی کمیں میں بیٹھا گویا کسی دوسرے کی نظروں سے اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔ میر اور غالب کی عشقیہ شاعری میں فرق اس وجہ

سے بھی کچھ زیادہ نمایاں ہو گیا ہے کہ میر صاحب میں وہ کیفیت نہیں ہے جسے انگریزی میں sense of humour کہتے ہیں۔ اسے لفظی طور پر "احساسِ ظرافت" مگر معنوی لحاظ سے "سلامتِ طبع" کہنا چاہیے۔ ایسی سلامتِ طبع کو خود فروشی و افتادگی سے بَیر ہے۔ میر کی عاشقانہ بے نفسی اُس شخص میں ہو بھی نہیں سکتی جس کی سلامتِ طبع کی بیداری کا عالم یہ ہو کہ ایک آنکھ سے محبوب کو، دوسری آنکھ سے اپنے آپ کو اور ایک تیسری آنکھ سے دونوں کے ربطِ باہم کی کیفیت کو دیکھتا جا رہا ہو:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

غالب نے ایک فارسی شعر میں "برہمن" پر اعتراض کیا ہے کہ بتوں کا جلوہ دیکھنے کے بعد بھی اس کے ہوش بجا رہتے ہیں۔ لیکن یہی اعتراض خود غالب پر بھی وارد ہوتا ہے:

بت را بجلوہ دیدہ و بر جائے ماندہ است
گر بحث می کنم بہ برہمن دریں چہ بحث

دیوان میں کم از کم ایک غزل اس قسم کی بھی ملتی ہے جو یقینی طور پر ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جس سے غالب نے واقعی محبت کی لیکن اِس غزل کے مقطع میں غالب کی اسی تیسری آنکھ کی روشنی کی جھلک ہے:

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

اشعار ذیل میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے:

بہ پایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہدِ وفا نابستہ دادم دلستانے را

ہوں مَیں بھی تماشائیِ نیرنگیِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اِس سے کہ مطلب ہی بر آوے

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

وارداتِ قلبی کی یہ آزمائش، یہ تماشا، یہ یاد علم النفس کے طریقِ کار سے ملتی جلتی ہے۔ ایسے بیسیوں اشعار نظر آتے ہیں جن میں غالب کا عشق عاشقانہ نہیں طالب عالمانہ ہے۔ اسے عشق کی نفسیاتی کیفیتوں سے عشق ہے چنانچہ اس کے عشقیہ کلام کا ایک قابلِ ذکر حصّہ انھی کیفیتوں کے مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس مشاہدے کی وسعت اور ہمہ گیری، لطافت اور گہرائی غزل کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ "معاملہ بندی" میں دوسرے غزل گو شعرا نے بھی کمال دکھایا ہے لیکن غالب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ صرف حسن و عشق کے باہمی معاملات کی تصویر کھینچتا ہے بلکہ بے انتہا صفائی اور خوبی سے ان محرکات کی تشریح بھی کر دیتا ہے جو ان معاملات کے پیچھے ہیں۔ حسن و عشق کے موضوع پر غالب کے کلام کا بہت بڑا حصہ شفاف ہے کثیف نہیں۔ مثلاً یہی ایک کیفیت کہ حسن اپنے آپ کو عشق کی خاطر آراستہ کرتا ہے، طرح طرح کے واقعات، واردات اور معاملات میں ظاہر ہوتی ہے:

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئنہ زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

اسی طرح "شرم" کے موضوع پر یہ تین شعر دیکھیے:

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

معشوق کے مطالعۂ نفس سے قطع نظر خود عاشق کے وارداتِ قلبی کے مشاہدے پر غالب کے اشعار کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ یہاں ان کا حوالہ دینا تحصیلِ حاصل کے برابر ہوگا۔ لیکن غالب کو حسن و عشق کے متعلق محض نفسیاتی نکات ہی سے شغف

نہیں ہے' وہ اس مضمون پر بارہا متعدد واقعات کی ایک زنجیر پیش کر دیتا ہے جن میں کئی جذبات و حسیات برسرِ منظر آتے ہیں۔ اِس سلسلۂ واقعات کو ذرا کھول کر دیکھیے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی "نفسیات" ہی نہیں' ایک ڈراما ہمارے سامنے ہے:

خدارا وقتِ پرسش نیست گفتم بگذر از غالب
کہ ہم جاں بر لب و ہم داستاں ہا بر زباں دارو

عیادت ست نہ پرخاش تندخوئی چیست
بیاوِ غمزدہ بنشین و لب گزاں برخیز

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہُوا

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا ' اگرچہ اشارے ہُوا کیے

یہ ڈراما صرف عشق کا ڈراما ہی نہیں' انسانی فطرت کا ہزار رنگ مرقع ہے۔ دوستی و دشمنی' عجز و غرور' شرافت و رذالت' مسرت و غم' ہمت کی بلندی و پستی کا کون سا رنگ ہے جو اس مرقع میں نظر نہیں آتا! یہ مکمل تصویرِ زندگی کے ایک عظیم الشان

دور کی تصویر ہے۔ اِس تصویر کے بعض پہلو ہمارے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ بعض دوسرے پہلو ہمارے جدید احساس کو گراں گزرتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہ زندگی مر چکی ہے اور مردہ چیزیں دلچسپ نہیں ہوتیں۔ لیکن انسانی فطرت کو کبھی موت نہیں آتی۔ سماج کو نئے دستور ملتے ہیں' نئے تمدن آتے ہیں مگر نئے انسان نہیں آتے۔ غالب کا ہاتھ انسانیت کی نبض پر ہے اور یہ نبض آج بھی اسی طرح چلتی ہے جس طرح سو برس' پانچ سو برس' ایک ہزار برس پہلے چلتی تھی۔ عشق گلیوں سے نکل کر محل سراؤں میں پہنچ جائے تو صرف اس کا خول بدل جاتا ہے' مغز نہیں بدلتا۔ غالب کی شاعری میں عشق کا جو ڈرامہ ہمیں ملتا ہے' اس کا پس منظر چھوٹے چھوٹے اشاروں' چھپے چھپے کنایوں کی روشنی میں بتدریج واضح ہونے لگتا ہے اور بالآخر گزری ہوئی صدیوں کا وہ ناموجود ماحول اس طرح زندہ ہو جاتا ہے کہ مغلیہ ہندوستان کی زندگی کے عیش و نشاط اور لطافت و کثافت کا پورا ڈرامہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

شاعری تاریخ نہیں ہوتی لیکن غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ جس کا جی چاہے آج بھی غالب کے اشعار کے بین السطور میں اس پرانی زندگی کو ایک بار پھر زندہ دیکھ لے۔ بایں ہمہ ایک بنیادی حقیقت کبھی نہیں بھولنی چاہیے اور وہ یہ کہ گو غالب کی شاعری میں عہدِ مغلیہ کے رسم و رواج نے انسان کا چہرہ اپنے خاص آب و رنگ سے چمکایا ہے لیکن ان اشعار میں اس چہرے کا پیدائشی نور آج بھی اسی طرح قائم ہے' جس طرح ایک سو برس پہلے تھا۔

(تحریر: ۱۹۴۹)

غالب کا کلکتہ

اگر اُن شہروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن میں مرزا غالب کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصّے میں رہنے کا اتفاق ہُوا تو مدّتِ قیام کے لحاظ سے اس فہرست میں دہلی اور آگرے کے بعد کلکتّے کا نمبر آئے گا۔ کلکتّے کا سفر مرزا صاحب نے ایک مجبوری سے اختیار کیا تھا۔ وہ اپنی جاگیر کا قضیہ طے کرانے کے لیے یہاں آئے تھے مگر یہاں پہنچ کر شروع میں جو امیدیں بندھیں وہ کچھ عرصے کے بعد باطل ثابت ہوئیں اور بالآخر وہ کلکتّے سے مایوس ہو کر واپس دہلی کو گئے۔ اس پہلو سے کلکتّے کو مرزا غالب کی یاد پر کوئی خاص حق باقی نہ رہا۔ لیکن بعض اور پہلوؤں سے کلکتّے کا نقش اِس قدر پائدار ثابت ہُوا کہ خود دہلی و آگرہ بھی رشک کرتے تو جائز تھا۔ آگرہ اور دہلی غالب کے پیدائشی اور اختیاری وطن ہونے کی حیثیت سے قدرۃً اپنی اپنی مخصوص کشش رکھتے تھے، چنانچہ غالب نے اپنے فارسی اور اردو مکاتیب اور اشعار میں جابجا ان کا ذکر محبّت اور احترام سے کیا ہے۔ کلکتّے کو غالب سے اس قسم کی کوئی نسبت حاصل نہ تھی۔ پھر بھی کلکتّے کے متعلق انھوں نے اپنی پسند کا اظہار اِس پُرجوش پیرائے میں کیا ہے کہ ہمیں اس پسند پر کچھ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

پنشن کا مقدمہ لڑنے کے لیے مرزا غالب ۱۸۲۶ میں جس لمبے سفر پر روانہ ہوئے' اس کے سلسلے میں دہلی سے لے کر کلکتے تک اُنھیں شمالی ہند کے اکثر بڑے شہروں سے ذاتی واقفیت حاصل ہوئی۔ لیکن لکھنؤ' الہ آباد' بنارس' پٹنے' کسی کو بھی شاعر کی تحسین و توجہ سے وہ حصّہ نہ ملا جو کلکتے کے لیے مقدّر تھا۔ بنارس کی تعریف میں ضرور ایک رنگین مثنوی فارسی کلّیات میں موجود ہے' لیکن یہ تعریف بنارس سے کہیں زیادہ "صبحِ بنارس" کے لیے وقف ہے۔ بخلاف اس کے' کلکتے میں نسوانی حُسن کے جلووں کے علاوہ شہر کی خالص جغرافیائی کیفیتیں بھی غالب کو قابلِ قدر معلوم ہوئیں۔ اِس شہر کا پانی' اس کی ہَوا' اس کا سبزہ' اس کی سڑکیں' غرضکہ اس کی ہر چیز اُن کے لیے موجبِ فرحت تھی۔

وہ جب دہلی سے چلے تو ہر طرف پریشانیوں کا ہجوم تھا۔ ذاتی مکان فروخت کرنا پڑا' قرض خواہ پیچھے لگے پھرتے تھے' بھائی دیوانہ ہوگیا تھا۔ اس حالت میں کلکتے پہنچ کر ایک عجیب ذہنی آسودگی محسوس ہوئی جسے انگریز حکام کی امیدافزا ملاقاتوں نے بظاہر محکم بنیاد پر کھڑا کردیا اور جسے شہر کے عام کاروبار میں انگریزی معاشرت کی آمیزش نے ایک دل پذیر تازگی بخشی۔ کلکتے کا آنا مرزا غالب کو ہر لحاظ سے ایک نئے جہان کا انکشاف معلوم ہُوا:

خوشا روز و شبِ کلکتہ و عیشِ مقیمانش
گورنر مہر و مکناٹن بہادر ماہِ تابانش

اِس معروف مدحیہ مطلع میں بھی کلکتے کی ستائش کا وہ جذبہ چھلکا پڑتا ہے جو اِس شہر کی جدّت طراز زندگی میں ایک خاص صفائی اور قرینہ دیکھ کر غالب کے دل میں خودبخود پیدا ہُوا۔ کلکتے سے لکھے ہوئے ایک فارسی خط میں ایک مختصر سی عبارت ملتی

ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ کی بین الاقوامی چہل پہل، بازاروں کی رونق اور کلکتے کے مغربی شہرسازوں کی ہنرمندی کا مرزا غالب کی طبیعت پر کیا اثر ہُوا۔

"چہ کلکتہ جہانے از ہر گونۂ کالا مالا مال، جز چارۂ مرگ ہرچہ گوئی پیشِ ہنرورانش سہل، و جز بخت ہرچہ خواہی بہ بازارش ارزاں"۔

(خط بنام علی بخش خاں رنجور)

تقریباً" دو سال بعد کلکتے کو الوداع کہہ کر پھر دہلی پہنچ گئے ـــــ مگر:

"رسیدن بہ دہلی تلافیِ ہجرانِ کلکتہ نہ کرد، تا بہ شادی چہ رسد؟ ہر کہ از اہلِ نظر مرا نگرد ہرگز نداند کہ ایں رہرو بہ منزل رسیدہ بہ وطن آرمیدہ ایست، بلکہ پندارد درد مندیست از وطن دور افتادہ، تازہ بہ داغِ غربت مبتلا"

(خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

واپس دہلی آئے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے کہ نواب امین الدین خاں کو کلکتے روانہ ہوتے دیکھ کر اپنے قیامِ کلکتے کی حسرت آمیز یاد ستانے لگی:

"برادرِ والا قدر ستودہ سیرَ نواب امین الدین خاں بہادر . . . محملِ عزم بہ جانبِ کلکتہ راندہ و من چوں نقشِ قدم ہم دریں خرابہ خاک بہ سر ماندہ"۔

(خط بنام نواب علی اکبر خاں طبا طبائی)

کلکتے کے دو سالہ قیام نے غالب کے لیے اس صدہا میل دور شہر کو نیم وطن بنا دیا تھا۔ وہاں اگر کچھ نئے دشمن بنے تھے تو کچھ نئے دوست بھی ہاتھ آئے تھے۔ اوپر کے دونوں خط انھیں دوستوں کی یاد سے معمور ہیں۔ لیکن کلکتہ صرف ان دوستوں کی وجہ



دریائے ہگلی، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)



پورٹ کمشنر کا عرشہ، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)

سے نہیں بلکہ خود اپنی وجہ سے بھی عزیز تھا۔ اس سلسلے میں وہ مشہور قطعہ دیکھیے جو یوں شروع ہوتا ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اِسی قسم کے جذبات کا اظہار نثر میں بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں کہ اگر میں عیال وار نہ ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کلکتے میں بس گیا ہوتا۔ پھر کلکتے کی چار خوبیاں اِس طرح گنائی ہیں:

"زہے ہَوا ہائے سرد و خوشا آب ہائے گوارا!
فرخا بادہ ہائے ناب و خرما ثمر ہائے شیریں"

(خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

یہ شہر جسے ہماری تہذیب کے دورِ آخر کے اِس سب سے بڑے ترجمان نے اِس طرح سراہا اب بھی کلامِ غالب کے شائقین کے لیے کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور رکھتا ہے۔ لیکن آج کا کلکتہ، بلکہ خود تین سال پہلے کا بین الاقوامی کلکتہ، غالب کا کلکتہ نہ تھا۔ غالب کے وقت سے لے کر اب تک ہندوستان کا جغرافیہ اور اس کے شہروں کے خدوخال بے حد بدلے ہیں۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کے رُبعِ اوّل کا کلکتہ، جس میں ابھی نہ ریل نمودار ہوئی تھی نہ تار برقی نہ بجلی کی روشنی اور نہ کالج اور یونیورسٹی، صحیح معنوں میں اب موجود نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس شہر میں سَوا سو برس ہوئے غالب نے قدم رکھا، اُس کی اصل بہار دیکھنے کے لیے ہمیں اب خاص کاوش کی ضرورت ہے۔

کلکتہ ساحلِ بحر سے تقریباً ایک سَو میل دور ہے مگر سمندر کی طرف سے چلنے



جنرل پوسٹ آفس، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)

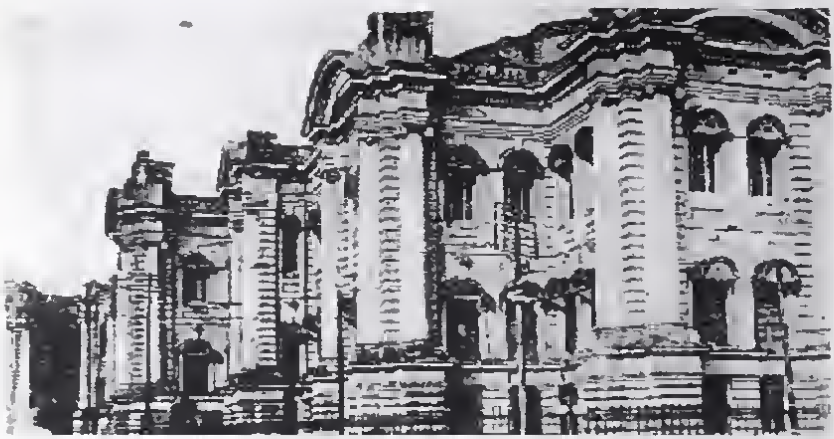


ڈلہاؤزی سکوئیر، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)

والی معتدل اور مرطوب ہواؤں سے دور نہیں ۔ اورنگ زیب کے عہد تک اِس مقام پر ایک وسیع اور گھنا جنگل تھا جو تالابوں سے اَٹا پڑا تھا اور وحشی جانوروں کا مسکن تھا۔ سترھویں صدی کے رُبعِ آخر میں انگریزوں نے یہاں کلکتے کی تعمیر شروع کی۔ اِس نئی بستی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اِس کی داغ بیل انگریزوں نے اپنی پسند کے مطابق ڈالی اور اس کی اُٹھان میں بھی شروع ہی سے یورپی معیار ملحوظ رہے۔ اِس آغاز کے ڈیڑھ سو برس بعد غالب کی آمد کے موقع پر ہندوستان کا یہ نوعُمر شہر ہندوستان کا سب سے زیادہ آباد شہر بن چکا تھا۔ شہر اور اس کے ملحقہ مضافات کی مجموعی آبادی کا اندازہ نو لاکھ کے قریب کیا جاتا تھا۔[1] ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ بھی ہو کیونکہ ۱۸۲۲ کی مردم شماری میں اندرونِ شہر کے مقیم باشندوں کا شمار دو لاکھ اور شہر میں ہر روز کام کے لیے آنے والوں کی تعداد ایک لاکھ مقرر کی گئی تھی۔ لیکن جس چیز میں مبالغے کا شائبہ معلوم نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ اِس مجموعی تعداد میں پچاس پچپن ہزار کے لگ بھگ یورپین اور اِسی قدر دوسری قومیتوں کے غیر ملکی باشندے شامل تھے۔ آبادی کا باقی حصّہ مسلمانوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ متموّل مسلمانوں کی ایک نہایت معقول تعداد اس وقت کلکتے میں موجود تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ دہلی کے مسافر کی منتظر نگاہ کو اس نیم انگریزی شہر کی پہلی جھلک کس طرح دکھائی دی۔

کلکتہ دریائے ہگلی کے مشرقی کنارے پر ایک بے قاعدہ مستطیل کی شکل میں آباد تھا۔ اِس کا انتہائی طول چھ میل اور اس کی چوڑائی، جو کسی جگہ بھی بہت زیادہ نہ تھی،

۱۔ یہ اعداد اور بعد کے بعض کوائف کلکتے کے بڑے سرکاری کتب خانے (سابق امپیریل لائبریری) میں حسبِ ذیل نسخے سے لیے گئے: نمبر 203 B.2 (4)



بنگال بنک، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)



سیکریٹریٹ آفس، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)

کہیں کہیں دو میل کے قریب پہنچتی تھی۔ شہر کے باہر ہر طرف ایک شاداب اور سرسبز علاقہ تابہ حدِ نگاہ پھیل رہا تھا جس کے اوپر مصنوعی اور قدرتی نہروں اور تالابوں کا ایک جال بُنا ہُوا تھا۔ اس علاقے کی ہریاول اپنی تابانی اور تنوّع سے کلکتے کو مرشد آباد سے ملاتی تھی۔ مرزا غالب پٹنے اور مرشد آباد ہی کے راستے سے آئے تھے۔ فروری ۱۸۲۸ کی جس صبح کو، پہر دن چڑھے، وہ کلکتے میں وارد ہوئے، اُنھیں یہ شہر دور سے اسی بے کراں ہریاول کے دامن میں ٹنکا ہوا دکھائی دیا۔ کاسی پور کے گاؤں تک پہنچ کر کلکتے کی عمارتوں کی پوری شان و شوکت ان کی نظروں میں تھی۔ لیکن اُس زمانے میں کلکتے کا نظارہ دیکھنے کے لیے سب سے اچھا موقع فورٹ ولیم کے سامنے کا میدان تھا۔ یہ وسیع و بسیط سبزہ زار اب بھی موجود ہے۔ اس کے گرد یورپی طرز کی عالی شان عمارتیں حلقہ باندھے کھڑی تھیں اور خود انگریزوں کے خیال میں بھی یہاں سے کلکتے کی آب و تاب یورپ کے کسی شہر کے مقابلے میں کم نہ تھی۔ تاج محل اور لال قلعے کی عمارتوں کے لاشریک حُسن کی یکتائی اور بے ہمگی سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ انگریزی تعمیرات ایک الگ کیفیت رکھتی تھیں۔ بادشاہی دَور کے آخری شاعر کی ذکاوتِ ذہن اس نئے جمہوری فنِ تعمیر کی زیبایش، اور یورپی شہر سازی کے اجتماعی آہنگ سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ کلکتے کی سرکاری عمارتوں میں نہ سنگِ مرمر استعمال ہُوا تھا، نہ سنگِ سرخ۔ یہ پوری کی پوری اینٹ کی بنی ہوئی تھیں، لیکن چونے کے پلستر نے خشت و سنگ کے فرق کو اِس سلیقے سے چھپا رکھا تھا کہ اِن عمارتوں کے شکوہ میں کوئی کمی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کلکتے کا گورمنٹ ہاؤس، ٹاؤن ہال، سینٹ جان کا گرجا اور پرانا مشن گرجا منجملہ اُن عمارتوں کے ہیں جو غالب کے زمانۂ قیام میں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ کلکتے کے میوزیم کا اُس وقت تک کوئی وجود نہ تھا، نہ ہگلی کا پُل ابھی بنا تھا۔

کلکتے کے جس حصّے میں یورپین آبادی تھی اُس کی سڑکیں پختہ، فراخ اور صاف ستھری تھیں۔ لیکن کشادگی کے باوجود ان کے کناروں پر پیادہ روشیں ابھی نظر نہیں آتی تھیں[1]۔ شہر کی معروف سڑکوں میں چاندنی چوک سٹریٹ، چت پور روڈ، کلائیو سٹریٹ، بڑا بازار، بوبازار سٹریٹ، دھرم تلہ سٹریٹ، سرکلر روڈ وغیرہ اُس زمانے میں بھی موجود تھیں۔ انگریزوں کے تمام مکانوں میں ہندوستانی شرفا کے مکانوں کی طرح، ہَوا کے لیے بڑے بڑے پنکھے چھت سے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک عام نظارہ یہ تھا کہ مکانوں کی چھتوں پر، عمارتوں کی اونچی چوٹیوں پر، درختوں کی ٹہنیوں پر، غرض کہ ہر ممکن جگہ پر کرگس بسیرا کرتے نظر آتے تھے۔ یہ جانور غلاظت سے پیٹ بھرتے اور شہر کی صفائی میں مدد دیتے تھے۔

شہر کا ہندوستانی حصّہ شمال میں تھا۔ یہ نہ ویسا دل کشا تھا، نہ ویسا صاف جیسا جنوب کی طرف کا یورپین حصّہ۔ یہاں اکثر گلی کوچے تنگ، ٹیڑھے اور پُر پیچ تھے۔ ان محلوں میں جا بجا پانی کے گڑھے اور تالاب تھے۔ بہت سے مکان بانس کے بنے ہوئے یا کچے تھے اور ان کی چھتیں چھپر کی تھیں۔ کہیں کہیں پختہ سڑکیں بھی ملتی تھیں اور کسی امیر مسلمان یا ہندو کا بڑا مگر بند سا مکان گرد و پیش کی فلاکت میں سے سر اونچا کیے نظر آجاتا تھا۔ اِن مکانوں کا نقشہ بالعموم یہ ہوتا تھا کہ ایک مربّع صحن کے گرد دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارت کھڑی کی جاتی تھی۔ اوپر کا حصّہ عورتوں کے لیے الگ کر دیا جاتا اور نچلی منزل سے مردانے کا کام لیا جاتا تھا۔

شہر کے مغرب میں ایک وسیع قطعۂ زمین دریائے ہگلی کے رخ کھلا پڑا تھا۔ یہاں

۱۔ کلکتے کا پہلا فٹ پاتھ ۱۸۵۸ میں چورنگھی کی سڑک پر بنا۔

دریا کا پاٹ میل سوا میل تک پہنچتا تھا۔ اور سطحِ آب پر ملک ملک کے چھوٹے بڑے جہازوں اور کشتیوں کا ہجوم تھا۔ ان کے درمیان کہیں کہیں کوئی "دُخانی جہاز" بھی نظر آتا تھا۔ لیکن بادبانی جہاز ان نوساختہ "دُخانی جہازوں" کے مقابلے میں تگنے چوگنے سے بھی زیادہ تھے۔

بندرگاہ پر انسانوں کا مجمع بین الاقوامی نوعیت کا تھا۔ یہی انداز شہر کے کوچہ و بازار میں بھی قائم تھا۔ اُس وقت شمالی ہند میں یہ ایک ہی مقام تھا جہاں انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے سے شہر کے کم و بیش ہر موڑ پر ملتے تھے۔ اِس بارے میں کلکتے کا مشہور میدان ایک الگ خصوصیت رکھتا تھا۔ شام کو جب ٹھنڈی ہوا چلتی اور اس مصفّا سبزہ زار پر انگریز مرد اور عورتیں تفریح کے لیے نکلتیں تو یہ ایک ایسا سماں ہوتا جو ہندوستانی آنکھوں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اِس نیم فرنگی نیم ایشیائی شہر میں مشرقی اور مغربی معاشرت کا عجیب امتزاج نظر آتا تھا۔ انگریز اگر عطر الائچی اور پان کے استعمال سے بے خبر نہ تھے تو ہندوستانی بھی وِسکی اور اولڈ ٹام سے مانوس ہوتے جاتے تھے۔ اس زمانے کے انگریز حکام نہ صرف فارسی سمجھتے اور بولتے تھے بلکہ فارسی قصیدہ و غزل سے لطف اندوز بھی ہوسکتے تھے۔ دوسری طرف اہلِ ہند بتدریج انگریزی مصنوعات کا استعمال سیکھ رہے تھے اور ان میں سے بعض کو انگریزی زبان اور علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق تھا۔[1]

اِس مِلے جُلے تمدّن کی جھلک شہر کے وسائلِ حمل و نقل میں بھی نمایاں تھی۔

۱۔ یہ ذکر مِکالے کی اُس مشہور روئداد سے پہلے کا ہے جس کے مطابق ہندوستان میں جبری انگریزی تعلیم کے نفاذ کا فیصلہ ہوا۔



کلائیو سٹریٹ، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)



گرینڈ سٹینڈ، ریس کورس، کلکتہ (تصویر کارڈ : ۱۹۳۸)

انگریز گھوڑا گاڑی کو پسند کرتا تھا جس کی تین شکلیں سڑکوں پر ملتی تھیں: "بند گاڑی' فِٹن اور بگھی"۔ ہندوستانی اپنی سواری میں بیل یا آدمی جوتتا تھا اور بہلی یا چھکڑے' تام جھام یا پالکی میں سوار نظر آتا تھا۔ ان سواریوں سے قطع نظر' اونٹ کی سواری بھی اٹھارھویں صدی تک بنگال میں بہت مقبول تھی[1]۔ بعد میں اس کا استعمال کم ہوتا گیا مگر یک قلم ترک نہیں ہُوا۔ کلکتے کے بڑے سرکاری کتب خانے میں پرانے کلکتے کی (غالباً ۱۷۹۴ کی تیار شدہ) ایک تصویر آویزاں ہے۔ اِس تصویر میں یورپی حصّۂ شہر کا مرکز' چَورنگھی کا علاقہ' خاص طور پر نمایاں ہے۔ چَورنگھی کے پاس ہی ایک تالاب ہے۔ اردگرد کے مکانات سب انگریزی وضع کے ہیں مگر چوک میں پالکی' بہلی' رتھ اور شتر سوار سبھی نظر آتے ہیں۔

کلکتے کے مضافات کے لمبے فاصلے طے کرنے کے لیے ایک اور ذریعہ بھی تھا: کِشتی کا سفر۔ لوگ چندرنگر اور ہگلی (بلکہ پلاسی اور مرشد آباد اور ان سے بھی آگے مونگھیر اور پٹنے) تک کشتی میں آتے جاتے تھے۔ غالب اپنے ورودِ کلکتہ کے تیسرے ہی دن بعد دریا کے راستے سے ہگلی کو روانہ ہوئے۔ کشتی کا سفر انھیں پسند تھا۔ وہ اُن لوگوں میں نہ تھے جنھیں آبی سفر سے متلی ہونے لگتی ہے۔ اِس کے علاوہ یوں بھی ریل گاڑی کے زمانے سے پہلے سب سے زیادہ آرام کشتی کے سفر میں ملتا تھا۔ غالب کا اِس عجلت سے ہگلی کو جانا اُسی مقصد سے تھا جسے لے کر وہ کلکتے آئے تھے۔ یہ واضح رہے کہ ہگلی نہ صرف کلکتے کے دریا کا نام تھا بلکہ مضافات کی نئی بستیوں میں سے بھی

۱۔ نواب سراج الدولہ کی فوج کو میر جعفر نے جب کلائیو کے ہاتھ بیچ ڈالا تو وہ پلاسی کے گاؤں سے ایک تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر فرار ہوئے۔

ایک اِسی نام سے موسوم تھی۔ یہ بستی کلکتے سے بیس بائیس میل اوپر دریا کے دوسرے کنارے پر تھی۔ یہاں کی مسجد اور امام باڑہ بہت مشہور تھا۔ اِس امام باڑے کے بانی ایک صاحب کرامت علی تھے۔ مگر اُنیسویں صدی کے اوائل میں امام باڑے کی شہرت اور شان و شوکت حاجی محمد محسن کی رہینِ منت تھی۔ حاجی صاحب نے ۱۸۱۲ میں اپنے انتقال پر اپنی لاکھوں کی جائداد اِس امام باڑے کے لیے بطور وقف چھوڑی۔ جس زمانے میں غالب کلکتے پہنچے' امام باڑہ ہگلی کے متولی نواب اکبر علی خاں طبا طبائی تھے۔ یہ اپنے علاقے کے نہایت ذی اثر اور بارسوخ لوگوں میں تھے اور غالب کو اپنے مقدمے میں ان سے مدد کی توقع تھی۔

مرزا غالب کو کلکتے پہنچتے ہی ہندوستانی حصۂ شہر میں دس روپے ماہوار پر حسبِ خواہش مکان مل گیا۔ اِس کا پتا اُن کے ایک فارسی خط میں یوں درج ہے :

"در کلکتہ قریب چیت بازار در شملہ بازار نزدیک تالاب گردد' در حویلی مرزا علی سوداگر"

اس پتے میں "چیت بازار" تو ظاہر ہے کہ سہوِ کتابت کا نتیجہ ہے۔ کلکتے میں کبھی کوئی چیت بازار نہ تھا۔ چت پور روڈ غالب کے زمانے میں بھی اسی نام سے موسوم تھی۔ اِسی طرح "تالاب گردد" میں بھی کلیاتِ نثر کے کاتب سے سہو ہُوا ہے۔ یہ ترکیب غالباً "تالابِ کرگدن"[1] ہے۔ شملہ بازار آج بھی اِسی نام سے موجود ہے۔ لیکن

۱۔ اِس قیاس کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان ہے۔ ۱۹۳۸ میں مولانائے موصوف نے ایک گفتگو میں راقم الحروف کو بتایا کہ کلکتے آکر مرزا غالب جس مکان میں رہے وہ گینڈے کے تالاب کے پاس تھا۔

مرزا علی سوداگر کی حویلی کا جس میں غالب مقیم ہوئے' اب صرف نام باقی رہ گیا ہے۔ تلاش کے باوجود شملہ بازار میں اب اُس حویلی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ البتہ وہ تالاب قریب ہی موجود ہے جس کا ذکر غالب نے اس مکان کے پتے میں کیا ہے۔ کلکتے کے شملہ بازار کو شملہ شہر سے کوئی تعلق نہیں۔ شمل بنگالی زبان میں کپاس کے پودے کو کہتے ہیں اور بازار منڈی کو۔ گویا مغربی پاکستان میں شملہ بازار کا نام کپاس منڈی ہوتا۔ شملہ بازار کا موجودہ پتہ یہ ہے : نزد کارنوالس سٹریٹ' متصل مکان لیڈی پرنسپل' بتھیون فیمیل سکول۔[1]

غالب کے سوانح نگار کے لیے کلکتے کی ایک اَور عمارت بھی خاص کشش رکھتی ہے۔ یعنی مدرسۂ کلکتہ' جس کے اندر مرزا قتیل کی زباں دانی کی بحث میں ایک ایسا جھگڑا کھڑا ہوگیا کہ اس کے عواقب آخرِ عمر تک غالب کے لیے موجبِ کلفت ثابت ہوتے رہے۔ اِس قصّے کو یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ "یادگارِ غالب" میں مولانا حالی نے اور خود غالب نے اپنے مکاتیب میں اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ البتہ ایک چیز جس کا ذکر مولانا حالی نے اور خود مرزا غالب نے بھی نہیں کیا' یہ ہے کہ معترضین میں سب سے زیادہ بلند بانگ ایک صاحب بنام نواب مرزا امان علی خاں تھے۔ یہ بھی غالب تخلص کرتے تھے۔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور کچھ مدت پہلے کلکتے میں آ رہے تھے۔

مدرسۂ کلکتہ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۲ میں قائم کیا۔ اس کی موجودہ عمارت ولزلی سکوئر کے شمال میں ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کی نچلی منزل کے وسط میں

۱۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آگرے کے اس مکان میں بھی جہاں مرزا غالب پیدا ہوئے اب ایک زنانہ مدرسہ ہے۔

ایک صحن ہے۔ اِس صحن کو ہر طرف سے دالان گھیرے ہوئے ہیں اور دالانوں کے پیچھے مدرسے کے کمرے ہیں۔ اِس نچلی منزل کے اوپر اِسی طرز کی دوسری منزل بنی ہے۔ اگست ۱۹۳۸ میں جب میں کلکتے میں تھا' مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مجلس میں مجھ سے کہا کہ "مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں ۱۸۶۰ یا ۱۸۷۰ کے قریب منتقل ہوا۔ غالب کو مثنوی 'بادِ مخالف' والا ہنگامہ مدرسے کی پہلی عمارت میں پیش آیا جو سیالدہ میں بیٹھک خانہ روڈ پر تھی۔" اِس سراغ کے مطابق مَیں نے مدرسے کی پرانی عمارت کے آثار تلاش کرنے میں سعی کی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی بعض اسباب کی بنا پر یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ مولانا کی اطلاع' موجودہ عمارت میں مدرسے کے انتقال کی تاریخ کے متعلق' شاید درست نہیں۔ کلکتے میں میرا قیام مختصر تھا اس لیے میری درخواست پر خان بہادر شمس العلماء مولوی محمدؐ موسیٰ صاحب نے' جو اُس وقت مدرسے کے پرنسپل تھے' یہ ذمہ لیا کہ تحقیق کرکے مجھے صحیح کیفیت سے مطلع کریں گے۔ بعد میں ان کی طرف سے جو خط مجھے وصول ہوا' اس کے مضمون سے اس مسئلے کے متعلق فیصلہ کن معلومات حاصل ہوئے۔ اِس خط کا ترجمہ عام دلچسپی کے لیے درج ذیل ہے:

"آپ نے دو باتوں کی تحقیق کی خواہش کی ہے۔ یعنی (الف) مدرسۂ کلکتہ اپنی موجودہ عمارت میں کس سال منتقل ہوا؟ اور (ب) مدرسے میں جو مشاعرے ۱۸۲۸-۲۹ میں ہوئے ان کا مدرسے کے پرانے کاغذات میں کوئی ذکر ہے یا نہیں؟

"میں اِس سلسلے میں آپ کی توجہ جس حد تک (الف) کا تعلق ہے Bengal Past & Present کی جلد ہشتم' نمبر ۱۵ کے ص ۸۳-۱۱۱ پر مبذول کرانا چاہتا ہوں' جہاں یہ درج ہے کہ گورمنٹ نے

جون ۱۸۲۳ میں فیصلہ کیا کہ ایک نیا کالج ایک موزوں تر مقام بنام کالنگا (حال ولزلی سکوئر) میں، جہاں بیشتر آبادی مسلمانوں کی ہے، تعمیر کیا جائے۔ اِس غرض سے مبلغ ۱۴۰۵۳/۷- روپے کی رقم زمین کی قیمت اور عمارت کے مصارف کے لیے منظور ہوئی۔ نئے کالج کا سنگِ بنیاد ۱۵ جولائی ۱۸۲۴ کو رکھا گیا اور مدرسہ اگست ۱۸۲۷ میں یہاں منتقل ہوگیا۔

"جہاں تک (ب) کا تعلق ہے، مدرسے کے کاغذات میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہوئی۔"

مدرسۂ کلکتہ کے کاغذات غالب کے ذکر سے بے نیاز ہیں۔ تاہم کلکتے نے غالب کو بالکل نظرانداز نہیں کر دیا۔ کلکتے کے بڑے سرکاری کتب خانے کے اُس حصّے میں جو بہار لائبریری کہلاتا ہے، شعرا کا ایک قلمی تذکرہ پڑا ہے۔ یہ میر وزیر علی متخلص بہ عبرتی عظیم آبادی کی تصنیف موسوم بہ "ریاض الافکار" ہے (مخطوطہ نمبر ۹۳ بہار لائبریری) اس نسخے کا سالِ تحریر ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) ہے۔ عبرتی نے اپنے تذکرے میں غالب کا ذکر یوں کیا ہے:

"اُسمِ منیف آں میرِ آہنگِ قافلۂ نغز کلامانِ ہند مرزا اسد اللہ خان است۔ مولدِ حمیدہ بنیادش خاکِ جوہر خیزِ دارالسلطنت دہلی۔ بہ تقریبے از وطنِ مالوف بہ کلکتہ پیوستہ۔ مذاق ناشناسانِ کلکتہ بر سیفِ لسانی و موشگافی آں سخن رس نکتہ پیوند، خارِ حسرت در دل ہا شکستہ در صددِ آویزش بہ آں مغتنمِ روزگار گشتند، خصوصاً" مرزا امان علی خاں کہ اصلا بہ آں مستعدِ روزگارِ جادو بیاں نسبتے ندارد۔ ازانجا کہ آں معنی سگال خیلے ماہرِ ایں فن بودہ، بہ نیروئے طبعِ رسا بر ہمہ غالب آمد۔ ہر چند من محرّرِ اوراق را دولتِ ہم بزمیِ آن جانِ

سخن نصیب نہ گشت مگر پارۂ نظم و نثرِ آں خوش تلاش کہ از بیاضِ مشفقی میرذوالفقار علی صاحب بہ چشم در آمد ایں قدر دریافت گشت چہ نظم و چہ نثر درہمہ بہ پارسی زبان استادِ طرزِ خاص است۔ ما ہم عصراں را جز گوش گشتن و شنفتنِ کلامِ متینش چہ یارائے حرف زدن بر روئے او؟ خیلے آزادانہ وضعِ زیست فرمودے و بہ ہرا نجمنے کہ رفتے بہ رنگیں مقالی ہم رنگِ چمن ساختے۔ تادمِ تحریرِ ایں اوراق بہ شاہجہاں آباد بہ عیش می گزارد۔"

مرزا غالب فروری ۱۸۲۸ میں کلکتے پہنچے اور اکتوبر ۱۸۲۹ میں واپس دہلی روانہ ہوئے۔

(تحریر: ۱۹۵۰)



مرزا غالب

اسد اللہ خاں تمام ہؤا

(ایک سوانحی تمثیل)

غالب کی زندگی اپنے آغاز و انجام اور درمیانی واقعات کی ترتیب و ارتقا کے لحاظ سے ایک ڈرامائی کیفیت رکھتی ہے۔ دنیائے شعر میں تو مرزا غالب خلاق معنی اور فن کار تھے ہی، لیکن ان کی شخصی زندگی کے مرقع کو بھی رنگ اور روشنی اور سائے کی آمیزش نے ایک مستقل فنی کارنامہ بنا دیا ہے۔ غالب کی زندگی کا پورا ڈراما، تخیل کی ذرا سی کوشش سے، ہم پر خود بخود منکشف ہو جاتا ہے۔ یہ ڈراما سلطنتوں کے ہبوط و زوال، عظیم الشان اخلاقی و دینی قوتوں کی پیکار اور مشرق و مغرب کی فیصلہ کن آویزش کے پس منظر پر نمودار ہوتا ہے۔ غالب کے سوانح حیات کا قاری صرف یہ کرتا ہے کہ نصف صدی کے واقعات کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اپنے فنی شعور کے دائرے کے اندر لے آتا ہے اور پھر یہ حیرت انگیز ڈراما خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے۔

مرزا غالب نے اکہتر برس کی عمر پائی۔ ان کا زمانہ حیات مسلمانان ہند کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا۔ جنوب سے مرہٹوں، مغرب سے سکھوں، مشرق سے انگریزوں نے مغلوں کی سیاسی طاقت پر پے در پے حملے کیے لیکن مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا ایک

ننھا سا نقطہ پھر بھی ہندوستان کے قلب میں روشن رہا۔ اس روشن نقطے کا نام تھا "دلی"۔ انیسویں صدی کی دلی میں اہل کمال کا ایک ایسا مجمع نظر آتا ہے جس سے اکبری اور شاہجہانی عہد کے علم و فضل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اہل کمال کی اس جماعت پر نظر ڈالیے تو بزرگوں میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل' مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولوی امام بخش صہبائی' شیخ محمد ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں مومن اور نوجوانوں میں سید احمد خاں اور حالی' ذکاء اللہ اور نذیر احمد کے پائے کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔

اسی دلی میں ۱۸۳۰ کے موسم گرما کا ذکر ہے کہ ایک دن سہ پہر کے وقت مرزا اسد اللہ خاں غالب کے مکان کے باہر...

ایک خوش الحان فقیر: کنکر چن چن محل بنایا مورکھ کہے گھر میرا ہے
نا گھر میرا ' نا گھر تیرا ' چڑیا رین بسیرا ہے
نا گھر میرا نا گھر تیرا... الخ

(آواز دور ہوتی جاتی ہے)

(گھر کے اندر بیگم غالب تخت پر بیٹھی ہیں۔ صحن میں بیری کے درخت سے طوطے کا پنجرا ٹنگا ہے)

بیگم غالب : ووا ! اے ووا ! ذرا اٹھیو جلدی سے۔ لیجیو یہ ادھنا۔ دروازے تک جا کر بچارے کو دے آئیو۔

(ووا جاتی ہے)

(ایک آہ سرد کے ساتھ' تاسف آمیز لہجے میں آہستہ) چڑیا' رین بسیرا! چڑیا کے بھاگ پھر اچھے کہ "اپنے" گھونسلے میں تو بیٹھی ہے۔ اور میں!

نواب الٰہی بخش کی بیٹی ! غریب کے سر پر بھی اپنا جھونپڑا ہوتا ہے' لیکن میرے لیے دلی میں کرایے کے مکانوں کے سوا' اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ابا جان نے آنکھیں کیا بند کیں' میرے نصیب سو گئے۔ چار سال سے چولھا اٹھائے گھر گھر پھرتی ہوں۔ اب برسوں کے رکھے ہوئے' زر.نفت اور کمخواب کے جوڑے بھی ایک ایک کرکے بکنے لگے۔ یہ کلکتے کا سفر مجھے بہت مہنگا پڑا۔ کیا کیا امیدیں لے کر مرزا صاحب روانہ ہوئے تھے اور پھر کس حال میں واپس ہوئے ! اب چھ مہینے بعد بھی کبھی کوئی نیک خبر کلکتے سے نہیں آئی (ذرا بلند آواز سے) دوا ! مدار خاں سے کہو مرزا صاحب سے پوچھے کہ ٹھنڈائی دیوان خانے میں پئیں گے یا---- کیا کہا ؟ آرہے ہیں؟ تو بس ٹھیک ہے۔

(طوطا بولتا ہے)

لو اب' میاں مٹھو کو تھوڑی سی چوری دے دو۔

(مرزا غالب آتے ہیں)

غالب : چڑیا رین بسیرا---- آپ نے بھی یہ وعظ سنا ؟ لیکن زندگی کتنی ہی بے ثبات ہو اس کا یہ مرتبہ تو دیکھیے کہ اس پر وعظ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (طوطا پھر بولتا ہے) کہو میاں مٹھو اب کیا فریاد ہے؟ آج چوری نہیں ملی؟ ارے میاں خوش رہو۔ نہ تمھارے بچے' نہ جورو' چوری کھاؤ اور مزے کرو' یہی زندگی ہے۔

بیگم : ان باتوں سے کیا فائدہ؟ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری اپنی زندگی کیسی ہے؟

غالب : اچھی---- اور بری---- اور اچھی !

بیگم : اب یہ پہیلیاں بھلا کون بوجھے !

غالب : بات تو صاف کہتا ہوں۔ سب سے پہلے اچھی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شروع میں برسوں تک زندگی خوب گزری۔ پھر بری اس لیے کہا کہ پچھلے چار پانچ برس سے ہم لوگ چکر میں ہیں اور پھر دوبارہ اچھی اس لیے کہ مقدمے کا فیصلہ ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بیگم : میں تو پانچ سال سے انھی امیدوں پر جی رہی ہوں!

غالب : تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ بھی ہو ؟ سرکار انگریزی نے پچیس برس پہلے ہم دونوں بھائیوں کے لیے دس ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر کی۔ شمس الدین خاں نواب ہیں تو فیروزپور جھرکہ کے ہیں' میرے سرکاری وظیفے کے نواب نہیں ہیں' نہ اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں۔ ہمارے اس دس ہزار کو پندرہ سو کون بنا سکتا ہے؟ سرکاری شقے کسی کی جعلسازی سے بدل نہیں جاتے۔ یہ رقم مل کر رہے گی بلکہ اگر انصاف ہوا تو اب تک جس قدر کم رقم ملتی رہی ہے' اس کی واصلات ابتدا سے آج تک دلوائی جائے گی۔

بیگم : (زیرِ لب سے) انصاف ! میں نے صرف اس کا نام سنا ہے۔ انصاف کرنے والے حاکم بدلتے ہیں' معزول ہوتے ہیں' مرتے ہیں مگر انصاف نہیں ہوتا۔

غالب : انصاف ہوگا!

بیگم : نہیں ہوگا۔ ایسے انصاف کو میں کیا کروں جس کے انتظار میں ایک بھائی پاگل ہو گیا اور دوسرا۔۔۔۔

غالب : اور دوسرا؟

بیگم : اور دوسرا مٹ گیا۔ چکی کے دو پاٹوں تلے پس کر رہ گیا ----

غالب : میرا پس جانا کچھ ایسا آسان نہیں ہے' چکی کے پاٹ البتہ گھس گئے ہیں۔ ابھی اور گھسیں گے۔

(باہر کے دروازے پر دستک۔ مدار خاں ملازم آتا ہے)

مدار خاں : سرکار! مولانا فضل حق صاحب کا آدمی یہ رقعہ چھوڑ گیا ہے۔

غالب : مولانا کو آج خود یہاں آنا تھا---- خیر لاؤ---- رقعہ---- (رقعہ کھولتے ہوئے)

اچھا! کروڑی مل مہاجن کو میرے خلاف ڈگری مل گئی۔ ہوں! کروڑی مل بھی کیا کرے۔ کلکتے جانے سے پہلے اس سے قرضہ لیا تھا۔ اب کروڑی مل اور دیوانی عدالت کا پیادہ میری تلاش میں منڈلا رہے ہیں۔

بیگم : اب کیا ہوگا؟

غالب : ہوگا کیا' گھر میں بیٹھوں گا۔ (طوطا بولتا ہے) میاں مٹھو سے باتیں کروں گا۔ آپ کی نماز میں حارج ہوں گا۔ دستور کے مطابق شرفا کو دیوانی عدالت کے ڈگری دار گھر کے اندر تو گرفتار کر نہیں سکتے اور دن کے وقت میں باہر نکلنے سے رہا۔ (ذرا ہنس کر) دونوں وقت ملتے جب چراغ میں بتی پڑتی ہے' میں بھی چمگادڑوں کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے نکلا کروں گا' اور باہر کا کام دھندا کر آیا کروں گا---- مدار خاں! دیکھو سرس کی گلی جاؤ۔ جو چھینٹ میں نے آج فرغل کے لیے خریدی تھی وہ عزیز النسا خانم' میری بھتیجی کو' دے آؤ۔ (بیگم سے' ذرا دھیمے لہجے میں) وہ بچی نئے

کپڑے کو ترس گئی ہے---- اور دیکھو! یوسف بیگ خاں کا حال پوچھنا اور کہہ آنا کہ میں آج حکیم صاحب کو نہیں لاؤں گا۔ ہاں کل مغرب کے بعد انھیں ساتھ لیے آؤں گا۔ (مدار خاں جاتا ہے) بچارا یوسف! ہمارے لڑکپن میں لوگ کہا کرتے تھے کہ دونوں بھائیوں میں وہی کماؤ ہوگا۔ کیا بدن تھا، جیسے لوہے کی لاٹھ! اور جب حیدر آباد سے اپنے رسالے کو چھوڑ کر آیا تو دیکھ کر دل کانپ جاتا تھا---- مجذوب، مخبوط، ٹوٹی ہوئی کمان کی طرح بے حال اگر اس کا حال ٹھیک ہوتا تو میں اس مقدمے کے لیے شاید اسی کو کلکتے بھیجتا۔

بیگم: اف! کلکتے کے نام سے میرے سینے میں ایک تیر لگتا ہے۔ اس کلکتے کی امید نے ہمیں ویران کر دیا، ورنہ لکھنؤ کے دربار سے کچھ نہ کچھ مل گیا ہوتا۔

غالب: (ذرا تلخی سے) تمھیں لکھنؤ کے دربار کا حال کیا معلوم؟ روشن الدولہ کے ہاتھ دو چار ہزار کے عوض اپنی آبرو بیچ ڈالتا؟ وہ اگر نائب السلطنت تھا، تو میں بھی خاندانی شریف زادہ تھا۔ وہ میری تعظیم دینے پر کیوں آمادہ نہ ہوا؟ کیا اس کے لیے یہ کافی نہ تھا کہ میں نے اس کی مدح میں ایک نثر تیار کی؟ اس کے ساتھ یہ شرط کیوں لگائی گئی کہ گداگروں کی طرح نذر بھی پیش کروں؟ میں نے فوراً کہا کہ میں ایسی حضوری سے معافی چاہتا ہوں۔

بیگم: اچھا ہمارا مقدر!

غالب: جو کچھ مقدر میں لکھا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا۔ ہم اگر شکوہ کریں بھی

تو کیا حاصل؟

بیگم : ہاں تمھارے لیے سب کچھ آسان ہے۔ اور نہیں تو شعر لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لی۔

غالب : آپ کے آنسوؤں سے بھی تو دل کی بھڑاس خوب نکل جاتی ہے۔

بیگم : (دردناک آواز میں) تو کیوں نہ روؤں! باپ مر گیا' بھائی سے تمھاری ان بن ہو گئی۔ مکان بک گیا۔ گھر میں جو زیور یا کپڑا تھا' وہ بھی یہ جاگیر کا مقدمہ کھا گیا۔ اب تمھارے پیچھے عدالت کے پیادے قید کرنے کو پھرتے ہیں---- بچے تھے... (بھرائی ہوئی آواز میں) وہ مر کر مجھے جس سناٹے میں چھوڑ گئے' میرا ہی دل جانتا ہے (سسکیاں لے کر روتے ہوئے) کیسے پیارے بچے تھے جیسے چاند کے ٹکڑے۔ ابھی تتلانا ہی شروع کیا تھا کہ اللہ کو پیارے ہو گئے' (روتے ہوئے) ایک ایک کرکے سب گئے۔ پہلا---- اور دوسرا' پھر تیسرا بھی---- چوتھا بھی

(مختصر وقفہ)

غالب : (آہستہ سے) دوا! کیا زین العابدین خاں آج ادھر نہیں آیا؟ میں نے صبح اس سے کہا تو تھا کہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اپنی خالہ کے پاس ہو جایا کرو---- بڑا نیک بخت لڑکا ہے۔ کسی کام کی وجہ سے رک گیا ہو گا۔ دیکھو صبح ان کے ہاں جانا اور کہنا' میاں بھول کیوں گئے؟ تمھاری خالہ تنہائی میں کڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں آؤ گے' کچھ میں تمھیں پڑھا دوں گا' کچھ تمھاری خالہ تم سے باتیں کریں گی' ان کا جی بہل جائے گا---- اور بیگم! اب جلد ہی ہمارے دن پھریں گے۔ میرے کاغذات گورنر جنرل کے سامنے عنقریب

پیش ہوں گے۔ انگریز سیکریڑی میرا دوست ہے۔۔۔۔

بیگم : ہاں، مگر سال بھر پہلے وہ بھی تو تمھارا دوست تھا۔۔۔۔ دلی کا انگریز ایجنٹ۔۔۔۔

غالب: کول برک ؟

بیگم : جو معزول ہو گیا۔ خیر پھر تم نے دل کو یوں تسلی دی کہ اس کی جگہ دوسرا انگریز دوست آ گیا۔

غالب: ہاں ہاں فریزر۔

بیگم : لیکن فریزر چھ ہفتے کے اندر بدل گیا اور اس کی جگہ نیا ریذیڈنٹ آیا جو تمھارا نہیں، شمس الدین خاں کا دوست ہے۔

غالب : تو کیا ہوا ؟ ہر بار ایسے ہی اتفاق تو پیش نہیں آئیں گے۔ نہ ہاکنز کی روداد پر آخری فیصلہ ہو جائے گا۔ کلکتے میں لاٹ صاحب کا سیکرٹری اسٹرلنگ صاحب میرا مخلص اور بہی خواہ ہے۔ کیا خوب آدمی ہے۔ پہلی ملاقات پر شریفوں کی طرح اٹھ کر مجھے تعظیم دی۔ اپنے ہاتھ سے عطر اور الائچی پیش کی اور بعد میں بھی ہمیشہ تکریم سے پیش آتا رہا۔ میرے کاغذات اسی کے ہاتھ سے نکلیں گے۔ پھر ابھی چند سال وہ اپنی جگہ سے ٹل بھی نہیں سکتا، اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسٹرلنگ کلکتے میں ہے تو سب ٹھیک ہے۔

(باہر کے دروازے پر دستک)

بیگم : یا الٰہی خیر! اب یہ کون آیا ؟

غالب : کوئی نہیں، مدار خاں واپس آیا ہوگا۔

(مدار خاں آتا ہے)

مدار خاں: سرکار، صدر الصدور صاحب کا آدمی میرے ساتھ ہی پہنچا اور یہ پرچہ دے گیا۔

غالب: آج سب دوستوں کی طرف سے ایک ایک رقعہ ضرور آئے گا۔ لاؤ دیکھیں کیا کہتے ہیں مفتی صدرالدین خاں صاحب (کاغذ کھولتے ہیں)۔

بیگم: خدایا کوئی خیر کی خبر دیجو!

غالب: کلکتے سے ---- خبر آئی ہے ---- اسٹرلنگ صاحب ۲۳ مئی کو مر گئے۔ ہائے جواں مرگ!

یہ مرزا غالب کی زندگی کا ایک رخ تھا۔ لیکن اس ذاتی اور خانگی پریشانی کے علاوہ ان کی زندگی کے کچھ اور پہلو بھی تھے۔ ان پہلوؤں کا تعلق ان کے روشن ضمیر دوستوں کی صحبت اور ان کی بڑھتی ہوئی شاعرانہ شہرت سے تھا۔ لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل نے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف کیا۔ کچھ پرانی پریشانیوں میں کمی ہوئی، کچھ نئی پریشانیوں کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح اور بارہ سال گزر گئے۔ اس زمانے میں ایک صبح کا ذکر ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی مرزا غالب کے مکان پر پہنچے:

مولانا: ارے بھئی مرزا، اب اٹھو اور خدا کا نام لو۔ مرد خدا یہ بھلا سونے کا وقت ہے؟ میں دو گھڑی تم سے بات کرنے آیا تھا اور تم ہو کہ شرابیوں کی طرح صبح کے وقت غافل پڑے ہو۔

غالب: یہ جو آپ نے مجھے شرابی سے تشبیہ دی، اسے اصطلاح میں تشبیہ تام کہتے ہیں۔

مولانا : اب آپ علم معانی پر اپنا درس رہنے دیجئے اور ذرا اٹھ کر ہاتھ منہ دھو لیجئے۔

غالب : بھئی مولانا' مجھے اتنی مہلت تو دو کہ تمھاری تشریف آوری پر ذرا خوش ہو لوں۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ قلعہ معلی سے چوبدار نے آکر خبر دی کہ جہاں پناہ نے یاد فرمایا ہے۔ سو اسی خواب کی تعبیر تمہاری ملاقات ہے :

جہانے مختصر خواہم کہ در وے
ہمیں جائے من و جائے تو باشد

---- کلو آفتابے میں پانی لاؤ۔ ذرا منہ بھی دھولیں' اور باتیں بھی کرتے جائیں' اور دیکھو مولانا کے لیے شربت بھی لاؤ۔ مولانا' یہ پیشگاہ حضور میں طلبی کا خواب کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کبھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں۔ میاں ابراہیم خاقانی ہند حسب معمول اس پر جزبز ہوتے ہیں' لیکن بادشاہ سلامت کو اس طرف توجہ ضرور ہو گئی ہے۔ خیر یہ قصہ تو پھر سناؤں گا' آپ کہیے کہ صبح صبح کیسے آنا ہوا۔

مولانا : بھئی پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں' یہ غیر مقلدین کا فتنہ کسی طرح فرد ہونے میں نہیں آتا۔

غالب : میں تو "آپ کے" مقلدین میں سے ہوں' یوں کہ منہ دھوئے بغیر دین کی بات نہیں کرتا۔ لیجئے یہ شربت نوش فرمایئے اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

مولانا: مرزا' اس پیالے میں سے دو ایک گھونٹ پہلے تم پیو!

غالب: یہ کیوں؟

مولانا: اس لیے کہ تمھاری زبان کا اثر میری زبان میں آ جائے۔

غالب: مولانا، اگر ایک رند گنہگار کو یوں کانٹوں میں گھسیٹو گے، تو میں اٹھ کر تمھارے قدموں کو چھو لوں گا۔ میرے لیے یہی سعادت کم نہیں کہ میں اور تم ایک ہی سال پیدا ہوئے اور تم نے جوانی سے لے کر اس عمر تک جس طرح میری رہنمائی کی ہے...

مولانا: تو بھئی مرزا! اس رہنمائی کے بدلے، اب کچھ میری رہنمائی کرو۔ وہی مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین ---- اس پر اپنا اور وہابی جماعت کا اختلاف مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تم میرا یہ عقیدہ جانتے ہو کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے، یعنی جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کو اصرار ہے کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرتؐ کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ مرزا، تم ذرا غور کرو کہ کیا یہ بالواسطہ ختم نبوت سے انکار نہیں ہے؟

غالب: ہے، مگر مولانا، اگر خدا لگتی سنو تو میں یہ کہوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ذات باری کی قدرت کاملہ سے انکار ہے، شاہ اسماعیل کے پیرو اس پر چراغ پا نہ ہوں تو کیوں؟

مولانا: ارے میاں! یہ کیا کفر بکنے لگے؟ کون خدا کی قدرت کاملہ کا منکر ہے۔ تمھارے نزدیک تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے قوانین کو خود ہی توڑے، حالانکہ اس

طرح اس کی قدرت محدود ہو جاتی ہے۔ میرے رسالہ "بحث قاطیغوریاس" میں یہ ذکر موجود ہے۔ ہاں جس کی طبیعت معقول کے بجائے غیر معقول کی طرف راغب ہو' اس کا راستہ مجھ سے جدا ہے۔ (ذرا ٹھہر کر) تو میں آج اس لیے تمھارے پاس آیا تھا کہ تم سے ایک مبسوط اور مدلل مثنوی لکھنے کو کہوں جس سے نظیر خاتم النبیین کا امتناع ثابت ہو۔ کاش مجھے بھی بیان پر وہی قدرت حاصل ہوتی جو تمھیں ہے تو میں یہ خدمت خود انجام دیتا۔

غالب : مولانا' یہ معاملہ نازک ہے۔ اور شعر و حجت کو جمع کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ تاہم آپ کے ارشاد کی تعمیل ناگزیر ہے' میں اس باب میں ضرور فکر کروں گا۔ اب کہو تو مصطفیٰ خاں کے ہاں چلیں۔ وہاں آج صدرالصدور صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ شاید مومن خاں بھی ہوں۔

مولانا: تو آؤ چلیں۔ میری پالکی باہر موجود ہے۔

غالب : بس میں ذرا کان میں دوا ڈال لوں۔

مولانا: کیوں خیریت تو ہے؟

غالب : کچھ دنوں سے اونچا سننے لگا ہوں۔ اس سے گھبراتا ہوں۔ حکیم صاحب نے مسہل پلا کر تنقیہ کیا۔ اس کے بعد ہفتہ بھر عرق انار ترش اور روغن گل مساوی ملا کر چند قطرے نیم گرم کان میں ٹپکاتا رہا۔ کل سے اب برگ شفتالو نیم گرم ٹپکا رہا ہوں۔ ابھی تک کچھ افاقہ نہیں ہوا۔

مولانا : یہ تشویش کی بات ہے ۔ تمھاری تمام دنیا تو بس یہی چشم و گوش کی دنیا ہے۔

غالب : کئی برس ہوئے' میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یوں

ہے:

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

اب اس فردوس گوش سے نکلنے کا تصور مجھے اسی طرح مضطرب کر دیتا ہے جس طرح آدم اول کو فردوس بریں سے نکلنے کا خیال ---- لیجئے دوا تو کان میں پڑ گئی، آیئے اب چلیں۔

اس طرح یہ دونوں ہم عمر، ہم مذاق، ہم علم دوست باتیں کرتے ہوئے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان تک پہنچے۔ نواب صاحب کے دیوان خانے میں مجلس احباب جمی ہوئی تھی۔ گانا ہو رہا تھا اور ایک غزل ابھی ختم ہوئی تھی ---- مرزا غالب اور مولانا فضل حق کو سازوں کی موسیقی کے ساتھ صرف آخری لفظ "ایسی" کی گونج سنائی دیتی ہے۔

شیفتہ : (دونوں دوستوں کو دیکھ کر) آیئے مرزا صاحب، آیئے مولانا، تشریف لایئے۔ میری آنکھیں تو دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور مولانا صدرالدین خاں آزردہ بھی کئی بار پوچھ چکے تھے۔ مفتی صاحب! یہ لیجئے آخر آہی پہنچے مرزا نوشہ۔

آزردہ : اور مرزا نوشہ کے مرزا شہ بالا بھی تو ساتھ ہیں۔ بہت خوب! خوش آمدید!

شیفتہ : افسوس صرف اتنا ہے کہ آپ مفتی صاحب کی ایک مرصع غزل سے محروم رہے۔ مفتی صاحب کم گو ہیں اور نغز گو۔ کاش آپ آ جاتے اور سنتے۔

غالب : تو آپ میری موجودگی کو عدم موجودگی سے کیوں تعبیر فرماتے ہیں۔ مجھے وقت کی روانی مقرر نہ فرمایئے کہ ابھی ہوں اور ابھی نہیں ہوں' (ہنس کر) ع: ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔

مولانا: مفتی صاحب' یہ بڑا ظلم ہوگا اگر ہم محروم رہ گئے۔

آزردہ : صاحب غزل مختصر ہے اور اس میں بھی کام کے شعر بس دو ہیں۔ آپ کو اصرار ہے تو میں خود ہی سنائے دیتا ہوں۔

مولانا: ارشاد۔

آزردہ: نکھڑا وہ بلا ' زلف سیہ فام وہ کافر
کیا خاک ہے جس کی شب ایسی ' سحر ایسی

("واہ وا ! مرحبا ! کیا شعر ہے" کا شور۔ آزردہ دوسرا شعر پڑھنے سے پہلے یہ مصرع دہراتے ہیں) ع

کیا خاک ہے جس کی شب ایسی ' سحر ایسی

اور پھر یہ شعر پڑھتے ہیں:

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا ' کمر ایسی

(پھر داد کا شور)

مولانا : کیا اچھوتا انداز ہے ! اور پھر یہ زمین ! مفتی صاحب یہ زمین کہاں سے پائی ؟

غالب: کہاں سے پائی؟ ارے بھئی آسمان سے اور کہاں سے !

شیفتہ: صاحبو' پان اور شربت حاضر ہے !

غالب : میں تو شربت پیوں گا ---- اس شربت کا رنگ مجھے پکار پکار کر بلا رہا ہے ---- مولانا ! آپ کیوں للچائی ہوئی نظروں سے میرے صدقے قربان ہوئے جاتے ہیں۔ آپ کو اس شربت کا ایک گھونٹ بھی نہیں ملے گا۔

(دوستوں کا قہقہہ)

آزردہ : ہاں صاحب' میں ذکر کرنے والا تھا کہ انگریزی گورمنٹ کو دلی کالج کا انتظام از سرنو منظور ہے۔

مولانا : مفتی صاحب' یہ دلی کالج کا نیا انتظام کہیں ویسا ہی نہ ہو' جیسا سات آٹھ برس پہلے تاج محل کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔

شیفتہ : کیا کہنے ہیں تاج محل کے ! آگرہ اس ویرانی پر بھی ایک مرصع غزل ہے مگر بیت الغزل تاج محل ہے۔

مولانا : یہ تو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کہتے ہیں نا ! انگریزوں کی قدردانی ملاحظہ فرمایئے کہ لارڈ ولیم بنٹنگ نے تاج محل کا تمام سنگ مرمر اکھڑوا کر فروخت کر دینے کی تجویز کی اور بچاؤ اس طرح ہوا کہ پہلے اکھڑوائی کا اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ خرچ زیادہ ہوگا اور آمدنی کم۔

غالب : مولانا ! ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو ! لیکن آپ تو انگریزوں کی نفرت سے ابلے پڑتے ہیں' آپ کیا انصاف کریں گے!

مولانا : نہ مانو' مگر میری یہ بات یاد رکھو کہ اگر انگریزوں کو خدا اختیار دے تو تاج محل اور لال قلعے میں گدھے بندھوا دیں۔ جامع مسجد کو اپنا اصطبل بنالیں۔

آزردہ : تو مولانا' آپ خدا سے سفارش کیجئے کہ انگریزوں کو اختیار نہ دے۔ مجھے تو انگریزوں کے اختیار میں فی الحال کوئی کمی ہوتی نظر آتی نہیں۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ٹامسن صاحب آگرہ سے دلی آئے ہیں۔ دلی کالج کے لیے سو روپے مہینے پر فارسی کے استاد کا تقرر ہو رہا ہے۔ میں نے مرزا نوشہ سے پوچھے بغیر ان کے لیے تحریک کرا دی ہے۔ مشاہرہ نہایت معقول ہے اور یہ جگہ مرزا صاحب کے لیے مناسب بھی معلوم ہوتی ہے۔

غالب : (ہنس کر) شکر ہے میری شاعری نہیں تو میری زبان دانی آپ کے نزدیک مسلم ہو گئی ---- یہ منصب واقعی میرے لیے نہایت مناسب ہے' اور نہایت نامناسب بھی۔

شیفتہ : مرزا صاحب' للہ اس باب میں یوں شاعری نہ فرمایئے۔ یہ تقرر اگر ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔

غالب : لیکن صاحب ! میں کیا کروں' کل میری شاعری اس تقرر کا قصہ پاک کر بھی آئی۔

شیفتہ و آزردہ : (چونک کر) یعنی ؟

غالب : یعنی یہ کہ پرسوں ٹامسن صاحب نے مجھے یاد فرمایا۔ کل میں پہنچا' صاحب کو اطلاع کرائی۔ خود پالکی سے اتر کر ٹھہرا رہا کہ صاحب حسب دستور استقبال کو نکلیں گے۔ تھوڑی دیر میں صاحب کا جمعدار ہمہ تن سوال بن کر نکلا کہ آپ اندر کیوں نہیں آتے ؟ میں نے کہا' صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے' میں کیوں کر اندر جاؤں؟ جمعدار پھر اندر گیا' تو صاحب خود باہر نکل آئے' اور بولے "جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت رئیس کے

تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہو گی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ اس وقت وہ صورت نہیں ہے"۔

آزردہ : ہئے ہے! مرزا تم نے غضب کر دیا!

غالب : ہاں میں نے ان کو صاف جواب دیا کہ صاحب، میں سرکاری نوکری کو ذریعہ افزائش عزت جانتا ہوں۔ یہ نہیں کہ بزرگوں کی بخشی ہوئی عزت بھی کھو بیٹھوں۔ بس یہیں بات تمام ہو گئی۔ ٹامسن صاحب نے اپنے دروازے کا رخ کیا اور میں نے غالب علی شاہ کے تکیے کا۔

شیفتہ : سبحان اللہ مرزا صاحب! دنیا کچھ بھی کہے، اس میں شک نہیں کہ خودداری اور آزادہ روی کو آپ نے انتہا پر پہنچا دیا۔

غالب : کل شام ایک غزل ہو گئی تھی، جس میں اتفاق سے یہی مضمون آگیا۔ لیجئے یہ پرچہ ملاحظہ فرمایئے۔

آزردہ : کیوں صاحب، یہ پرچہ وہی کیوں ملاحظہ فرمائیں؟ پڑھ کر سنایئے۔ محفل کو محروم نہ کیجئے۔

شیفتہ : ہاں صاحب، تو پھر ارشاد ہو!

غالب : (داد و تحسین کے شور میں یہ غزل ختم کرتے ہیں):

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام کا میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے ' پہ تماشا نہ ہوا

اس طرح مرزا غالب کی زندگی کے پندرہ سال اور گزر گئے۔ اس عرصے میں مرزا صاحب مانے ہوئے بزرگان ادب میں شمار ہونے لگے۔ ایک خاندانی صدمہ اس عرصے میں انھیں پہنچا۔ زین العابدین خاں عارف جوان ہوئے' شاعر بنے اور مر گئے۔ ان کا چھوٹا بچہ حسین علی خاں اب مرزا صاحب کے گھر میں رہتا تھا' اور مرزا صاحب اسے اپنے بیٹے کے مانند عزیز رکھتے تھے۔ شعر و سخن' نغمہ و سرور' محبت و دوستی کی یہ فضا آخر کار ۱۸۵۷ میں ایک دم برہم ہوئی۔ پہلے مئی میں انگریز قتل ہوئے' لیکن پھر ستمبر میں انگریزوں کی فتح مند فوج دلی میں داخل ہوئی او دلی کے مسلمانوں نے وہ مصیبتیں دیکھیں' جن سے چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ ہو گئی۔

ستمبر ۱۸۵۷ میں مرزا غالب اپنے مکان میں بیٹھے ہیں۔ حسین علی خاں بھی موجود ہیں:

غالب : بیٹا ! بیٹا حسین علی خاں ! حکیم صاحب نہیں آئے ؟ یہ بہرا پن تو جان کا روگ بن گیا!

حسین علی خاں : (آواز بلند کر کے) دادا حضرت ! شہر میں بلوہ ہو رہا ہے

غالب : بلوہ؟ ---- ابھی تک!

حسین علی خاں : (چیخ کر) آپ سن نہیں رہے ہیں' ہماری گلی میں سے لوگ بھاگتے ہوئے جا رہے ہیں؟

غالب : ہاں' کچھ شور سا سنائی تو دیتا ہے ---- ہائے دلی ! کیا تو اس طرح سسک سسک کر مرے گی؟ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جا۔ (پھر ذرا دھیمی آواز میں) اودھ کی سلطنت مجھ پر مہربان ہوئی۔ میری قضا نے اسے دو برس میں ختم کر دیا۔ دلی کی سلطنت کچھ زیادہ سخت جان تھی' سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی----

حسین علی خاں : (پھر چلا کر) سنے۔ بادشاہ سلامت کو گوروں نے پکڑ لیا۔

غالب : (اسی لہجے میں) اچھا یہ شمع بھی بجھ گئی!

حسین علی خاں : (چیخ کر) اور سنے' میر میکش اور مولانا صہبائی قتل ہو گئے!

غالب : (سرد آہ بھر کر) اللہ! ---- اللہ!

(ہجوم کا شور۔ گولی چلنے کی آواز)

حسین علی خاں : کلو کہتا ہے' مولانا فضل حق کو گورے پکڑ کر لے گئے!

غالب : (بے تابانہ) ہائے!

حسین علی خاں : اور نواب مصطفیٰ خاں کو اور مفتی صاحب کو بھی!

غالب : اچھا ہے' اچھا ہے! میں بھی اب کفن پہن کر زندگی کے دن گزار دوں گا۔ جاؤ کلو سے کہو' میرے کپڑے لائے۔ میں اپنے دوستوں سے ملنے جاتا ہوں' وہ حوالات میں میرے منتظر ہیں۔

(ہجوم کی چیخ پکار)

حسین علی خاں : (کانپتی آواز میں) سرس کی گلی سے آدمی آیا ہے----
دادا یوسف بیگ خاں کو گوروں نے مار ڈالا۔

غالب : مر گیا ! یوسف مر گیا ! اف۔ اوف ! میرا بھائی---- (قہقہہ لگا کر)
دیوانے کو گولی مار دی ! اف (کانپتی ہوئی آواز میں) بیٹا ! لوگ یوسف
کو مجنوں کہتے تھے۔ آج میں مجنونوں سے بدتر ہوں۔ ئی

حسین علی خاں : دادا حضرت ! خدا کے لیے ----

(حسین علی خاں کی آواز گولیوں کی باڑھ میں
گم ہو جاتی ہے)

حسین علی خاں : دادا حضرت ! حکیم صاحب تشریف لا رہے ہیں!

غالب : اب کیا فائدہ ! میرے سننے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے!

(تمت)

(تحریر : ۱۹۵۰)

ضمیمہ جات

ضمیمہ ۱

غالب کا سوانحی خاکہ: اہم تاریخیں

۱۔	غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں کی سمرقند سے لاہور کو ہجرت	۱۷۴۸ – ۵۴
۲۔	مرزا اسداللہ بیگ خاں ("غالب") کی آگرہ میں پیدائش	۲۷ دسمبر ۱۷۹۷
۳۔	غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں کی رحلت	۱۸۰۲ – ۱۸۰۳
۴۔	ابتدائی تعلیم کا زمانہ، آگرہ میں اور دہلی میں	۱۸۰۳ – ۱۲ ۱۸۱۲ – ۱۴
۵۔	چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کی وفات	۱۸۰۶
۶۔	شعر گوئی کی ابتدا	۱۸۰۷ – ۱۸۰۸
۷۔	آگرہ اور دہلی میں کھیل کود اور عیش و عشرت کے ایام	۱۸۰۶ – ۱۸
۸۔	شادی	۹ اگست ۱۸۱۰
۹۔	اپنا تخلص "اسد" سے بدل کر "غالب" رکھتا ہے	۱۸۱۰
۱۰۔	مستقل طور پر دہلی منتقل ہو جاتا ہے	۱۸۱۲
۱۱۔	تخلیقی سرگرمی کا زمانہ	۱۸۱۵ – ۲۵
۱۲۔	غالب کی زندگی کا بڑا معاشقہ	۱۸۱۷ – ۲۰
۱۳۔	اردو دیوان کے پہلے مسوّدے کی تکمیل	۱۸۲۱

۱۴۔	مالی مشکلات کا آغاز	۱۸۲۲ – ۲۳
۱۵۔	برطانوی پنشن کے لیے مقدمہ بازی کا آغاز	۱۸۲۶
۱۶۔	کلکتہ کو روانگی	۱۸۲۶
۱۷۔	دہلی کو واپسی	۱۸۲۹
۱۸۔	مشکلات اور مایوسیوں میں اضافہ ـــــ شاعری کا سنہری دور	۱۸۳۰ – ۵۰
۱۹۔	اردو دیوان کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت	۱۸۴۱
۲۰۔	دہلی کالج میں فارسی کے صدر مدرّس کا عہدہ قبول کرنے سے انکار	۱۸۴۲
۲۱۔	ملکہ وکٹوریہ غالب کی آخری اپیل مسترد کرتی ہے	۱۸۴۴
۲۲۔	پہلے فارسی دیوان کی اشاعت	۱۸۴۵
۲۳۔	جوئے کے الزام میں گرفتاری اور قید و بند	۱۸۴۷
۲۴۔	آخری مغل بادشاہ کی طرف سے (۳۰۰ روپے ششماہی تنخواہ پر) شاہی مؤرخ کے طور پر تقرر	۱۸۵۰
۲۵۔	بیوی کے بھتیجے زین العابدین خاں عارف کی وفات پر اس کے بیٹوں کو متبنّیٰ بناتا ہے	۱۸۵۲
۲۶۔	مرزا فخرو (مغل تخت کے ولی عہد) اور نواب واجد علی شاہ شاعری میں اس کی شاگردی اختیار کرتے ہیں (مشاہرہ بالترتیب ۴۰۰ اور ۵۰۰ روپے سالانہ)	۱۸۵۴ – ۵۵
۲۷۔	نواب واجد علی شاہ کو تخت سے اتار کر کلکتہ میں نظربند کر دیا جاتا ہے	فروری ۱۸۵۶
۲۸۔	مرزا فخرو کی اچانک رحلت	جولائی ۱۸۵۶

۲۹۔ رامپور کا نواب یوسف علی خاں شاعری میں اس کی شاگردی اختیار کرتا ہے	فروری ۱۸۵۷
۳۰۔ ۱۸۵۷ کی عظیم جنگ اور مغلیہ سلطنت کا خاتمہ	مئی – ستمبر ۱۸۵۷
۳۱۔ خطوط نویسی کا عشرہ	۱۸۵۸ – ۶۸
۳۲۔ خطوط کے پہلے مجموعے کی اشاعت	۱۸۶۸
۳۳۔ وفات	۱۵ فروری ۱۸۶۹
۳۴۔ خطوط کے دوسرے مجموعے کی اشاعت	مارچ ۱۸۶۹
۳۵۔ بیگم غالب کی رحلت	۴ فروری ۱۸۷۰

ضمیمہ ب

"سفرِ غالب، ۱۹۳۸ء"

مصنّف کے خطوط، والدہ کے نام[1]

۱۔	دہلی، ۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۳۱	۱۱۔	علی گڑھ، ۴ اگست ۱۹۳۸ء	۲۷۵
۲۔	دہلی، ۱۵ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۴۴	۱۲۔	علی گڑھ/بریلی، ۷/۸ اگست	۲۷۸
۳۔	دہلی، ۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۵۳	۱۳۔	رام پور، ۱۰ اگست ۱۹۳۸ء	۲۸۱
۴۔	دہلی، ۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۵۶	۱۴۔	لکھنؤ، ۱۳ اگست ۱۹۳۸ء	۲۸۳
۵۔	دہلی، ۲۲ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۵۷	۱۵۔	الہ آباد/بنارس، ۱۵، ۱۷ اگست	۲۸۵
۶۔	دہلی، ۲۴ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۶۲	۱۶۔	کلکتہ، ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء	۲۹۲
۷۔	دہلی، ۲۷ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۶۷	۱۷۔	کلکتہ، ۲۱ اگست ۱۹۳۸ء	۲۹۴
۸۔	دہلی، ۲۹ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۷۰	۱۸۔	کلکتہ، ۲۵ اگست ۱۹۳۸ء	۳۰۱
۹۔	دہلی، ۳۱ جولائی ۱۹۳۸ء	۲۷۳	۱۹۔	بھوپال، ۶ ستمبر ۱۹۳۸ء	۳۰۳
۱۰۔	دہلی، ۲ اگست ۱۹۳۸ء	۲۷۴	۲۰۔	دہلی، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء	۳۰۵

۱۔ یہ تمام خطوط "مرقّعِ غالب" کے بارے کاغذات میں فائل "والدہ صاحبہ کے نام میرے خطوط۔ سفرِ غالب، جولائی۔ ستمبر ۱۹۳۸ء" سے لیے گئے ہیں۔

۱

امپرس ہوٹل، فتحپوری، دہلی
۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء، ۱۱ بجے صبح

میں نے پرسوں صبح یہاں پہنچنے کے بعد جو کارڈ آپ کو لکھا تھا، اس میں یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ہو سکا تو اسی شام بیٹھ کر مفصل خط لکھوں گا۔ پرسوں شام میں نو بجے کے قریب گھر (یعنی ہوٹل) آ گیا تھا اور اگرچہ میں گیارہ بجے کے بعد سویا مگر آپ کو خط لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ مجھے ممتاز حسن اور عبد الواحد کو ایک ایک مختصر خط لکھنا تھا، ممتاز حسن کو تو اپنے قیام کلکتہ کے انتظام کے سلسلے میں اور عبد الواحد کو ملفوظات اقبال کے متعلق (سید سلیمان ندوی کا خط مجھے اپنے خط کے جواب میں اترسوں لاہور میں ملا تھا۔ چونکہ ملفوظات اقبال کا اہتمام اب عبدالواحد کے ذمے ہے اس لیے یہ خط جو میرے ساتھ ہی دہلی آ گیا تھا، ان کو واپس لاہور بھیجنا تھا) . . . کل صبح نواب خضر مرزا سے ملنے کے لیے (جو عارف کے بھتیجے ہیں) مہرولی جانا تھا۔ مہرولی دہلی سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ ہے۔ نواب صاحب سے ساڑھے آٹھ بجے شام رخصت ہو کر کہیں رات کے ساڑھے دس بجے ہوٹل میں واپس پہنچ سکا، چنانچہ کل بھی خط لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ آج کچھ فراغت ہوئی ہے تو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔

اب میں آپ کو اپنے اس وقت تک کے حالات ذرا تفصیل سے سناتا ہوں۔

۱۱ جولائی (پیر) کی شام کو . . . لاہور سے ٹھیک نو بجے گاڑی روانہ ہوئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے کپڑے بدلے، چیزوں کو قرینے سے رکھا، سامان کو زنجیر میں باندھ کر قفل لگایا۔ پنکھا جھلنے کے لیے نکالا۔ یہ پنکھا دراصل چھوٹی سی پنکھیا ہے اور میں سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے

چھاج سے ہوا لینے والے کو اس "نازک بدن" سے کیا ہوا ملے گی مگر جھلنے پر معلوم ہوا کہ ہوا کی گنجائش بھی اس میں رکھی گئی ہے۔ اٹاچی کیس کے طفیل گویا میری میز متحرک ہو کر میرے ساتھ آ گئی۔ سونے سے پہلے میں نے اس میں سے چاقو نکال کر پنسل بنائی۔ حساب کی کاپی نکال کر حساب لکھا' کچھ اور یادداشتیں لکھیں اور ٹوتھ برش سے دانت صاف کیے۔ اس کے بعد رات بھر بری بھلی طرح سوتا رہا۔ صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا۔ دلّی کے قریب آسمان پر ہلکا سا ابر تھا اور ہوا میں خنکی تھی۔ دلی پہنچ کر اگرچہ دھوپ نکل آئی مگر موسم ناگوار نہ تھا۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ دلی کی گرمیاں لاہور کے مقابلے میں بسا غنیمت ہیں۔ شام کو تو ہر روز ٹھنڈی ہوا چلتی ہے جو رات بھر رہتی ہے اور دوپہر کو بھی دھوپ میں چلنا پھرنا لاہور کے ستائے ہوؤں کو زیادہ ناگوار نہیں ہوتا۔

سٹیشن پر بہت سے ہوٹل والوں کی کشمکش سے جان چھڑا کر میں آخر ایک شخص کے ساتھ ہولیا جو مجھے اس ہوٹل میں لے آیا۔ یہ ہوٹل بہت اچھا نہیں ہے اور اُسی ایک روپے یومیہ میں اس سے بہتر اور بڑا کمرہ دوسرے ہوٹلوں میں ملنا ممکن ہے' لیکن اب جب یہاں آ پڑا ہوں تو سستی کے مارے یہاں سے جنبش کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے کمرے کی تلافی بجلی کے پنکھے نے کر دی ہے جو اسی ایک روپے یومیہ میں مجھے دے دیا گیا ہے۔ دوسرے ہوٹلوں میں بجلی کا خرچ الگ دینا پڑتا ہے۔ سچ پوچھیے تو دلّی میں پنکھے کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں ہے۔ گزشتہ رات میں بند کمرے میں بغیر پنکھے کے تھوڑی دیر بیٹھا رہا لیکن اس کے باوجود کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ یوں بھی ہوا چلتی رہتی ہے اور اگر کمرہ ذرا ہوا دار ہو تو پنکھے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کو تو میں نے رات بھر کمروں کے اندر سوتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ ہوٹل بالکل سڑک کے کنارے پر ہے۔ بازار کا شور' گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ اور

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں ہر وقت سنائی دیتی رہتی ہیں۔ میرے کمرے کا جنوبی دروازہ فتحپوری کے چوک کے بالکل سامنے ہے۔ مشرق کی طرف کے دونوں دروازے اُس سڑک کی طرف کھلتے ہیں جو سٹیشن سے فتحپوری کو آتی ہے (کمرے میں داخل ہونے کا دروازہ شمال کی طرف ہے' جدھر ہوٹل کی سیڑھیاں ہیں)۔ یہاں پہنچ کر جب میں اپنا سامان کھول رہا تھا تو تھوڑی دیر پلنگ پر بیٹھ کر بازار کو دیکھتا رہا۔ "بازار کی سیر" کا مفہوم کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ آخر اس میں لوگوں کو کیا دلچسپی نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں بیٹھ کر چاندنی چوک اور فتحپوری کی سڑکوں کی گہما گہمی پر جب نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ بازار کی سیر میں بھی کوئی بات ہے اور تھوڑا سا اندازہ اس بات کا بھی ہوا کہ غالب کے زمانے میں دلّی کے لوگ شام کے وقت کیوں سڑک کے کنارے کے کوٹھوں پر بیٹھ کر بازار کی چہل پہل دیکھا کرتے تھے۔ اُس وقت آج کل کی طرح اخبار بھی نہ تھے' اس لیے ایک حد تک یہی "بازار کی سیر" ان لوگوں کو اخبار بینی کا کام دے جاتی تھی۔ آج کل کے اخبار بیں بھی تو آخر انھی باتوں میں وقت کھوتے ہیں کہ فلاں جگہ مار دھاڑ ہوئی' فلاں شخص فلاں جگہ سے گزرا۔ یہی بات ایک محدود پیمانے پر بازار کی دنیا میں نظر آ جاتی ہے (اگر بہت دور کی کوڑی لانی منظور ہو تو "اخباری پن" اور "بازاری پن" کا باہمی تعلق بھی یہیں سے واضح ہو جائے گا)۔

ٹھیک پونے بارہ بجے میں نیچے بازار میں اترا۔ سب سے پہلے شیخ سردار علی کے پاس جانے کا ارادہ کیا کیونکہ انھی کی وجہ سے میں نے لاہور سے آنے میں جلدی کی تھی۔ شیخ سردار علی لاہور کے رہنے والے ہیں اور اسلامیہ کالج کے لائبریرین صاحب نے ان کے نام مجھے تعارف کا خط دیا تھا۔ یہ دلّی کے سینٹ سٹیفن سکول میں مدرّس ہیں لیکن چونکہ مدرسے کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا اس لیے میں نے ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ ٹریم میں

بیٹھ کر جامع مسجد پہنچا (ٹریم والے نے دو پیسے لیے)۔ جامع مسجد سے پیدل دریا گنج گیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دھوپ میں پیدل چل کر بھی کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ دریا گنج میں "کلاں محل" اور "کلاں محل" میں "عبد اللہ ٹال والے" کو تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ شیخ سردار علی صاحب مکان بدل کر دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ تھوڑی سی پریشانی ہوئی کیونکہ وہاں اکثر لوگوں کو شیخ سردار علی کا پتا چھوڑ نام تک معلوم نہ تھا۔ آخر ایک نیک دل لڑکا جو مسعود کا ہم عمر تھا کہنے لگا کہ چلیے میں ایک جگہ چل کر دریافت کرتا ہوں، شاید پتا چل جائے۔ وہاں بہت ماسٹر رہتے ہیں۔ چنانچہ بہت سی گلیوں کا چکر کاٹ کر وہ لڑکا مجھے ایک مکان پر لایا اور معلوم ہوا کہ شیخ سردار علی یہیں رہتے ہیں۔ میں نے لڑکے کو شاباش دی اور خود اندر جا کر بیٹھ گیا کیونکہ شیخ صاحب ابھی مدرسے سے نہیں آئے تھے۔ ایک بجے کے قریب وہ آئے اور ملاقات ہوئی۔ کھانا انھوں نے زبردستی اپنے ساتھ کھلایا۔ میں نے مہرولی چلنے کے لیے کہا۔ انھوں نے کہا شام کو اکرم صاحب سے مل لیں گے۔ وہ ولی کے رہنے والے ہیں اور ان کے والد ("حاجی صاحب") پر نواب صاحب (خضر مرزا، مہرولی والے) بہت مہربان ہیں۔ ان کے ساتھ مہرولی جانے کے لیے کل کا کوئی وقت مقرر کر لیں گے۔

الغرض طے یہ ہوا کہ میں چھ بجے شام پھر شیخ صاحب کے پاس پہنچوں اور ہم دونوں مل کر اکرم صاحب کے ہاں چلیں۔ شیخ صاحب نے چلتے ہوئے اپنی بائیسکل بھی مجھے دے دی۔ میں بائیسکل لے کر ان کے گھر سے نکلا تو پونے دو بجنے کو تھے۔ لاہور کے مقابلے میں یہاں دھوپ کچھ ایسی گرم بھی نہ تھی۔ میں نے دل میں کہا بائیسکل پاس ہے اور دریا گنج کا علاقہ ہے، کیوں نہ "زینت المساجد" اور نواب شمس الدین کا مکان دیکھتا چلوں۔ "زینت المساجد" اورنگ زیب کی ایک بیٹی زینت النساء بیگم نے ۱۷۱۰ میں بنوائی تھی اور میں نے پڑھ رکھا تھا کہ یہ مسجد دریا گنج میں ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نواب شمس الدین

(والیٔ فیروز پور جھرکا و لوہارو) جن کو فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی ہوئی تھی' ان کا مکان (یا حویلی) بھی اسی مسجد کے قریب دریا گنج میں واقع ہے۔ کشن گڑھ کے راجہ کا مکان بھی جہاں فریزر نے اپنی زندگی کی آخری شام کو کھانا کھایا تھا' دریا گنج میں واقع تھا۔ میں نے چاہا کہ ان تینوں کو اسی وقت دیکھتا جاؤں۔ "زینت المساجد" تو بلا زحمت دور سے نظر آگئی۔ میں نے اندر جا کر بھی اسے دیکھا۔ اب یہ ویران پڑی ہے۔ نہ کوئی امام ہے نہ مقتدی' البتہ عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہیں آکر پچھلی صدی میں پیر غوث علی قلندر ٹھہرے تھے جن کی سوانح عمری "تذکرۂ غوثیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ مرزا غالب ان پیر غوث علی کے لیے اپنے گھر سے کھانا پکوا کر اسی مسجد میں خود لایا کرتے تھے۔ مسجد سے نکل کر میں نے دو تین آدمیوں سے نواب شمس الدین کے مکان کا پتا پوچھنا چاہا مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ تاہم جو کچھ مجھے معلوم ہوا اسی سے میں نے اندازہ کیا کہ نواب صاحب کا مکان کہاں ہوگا...

نواب شمس الدین کا مکان جا کر دیکھا' اب یہ بڑی حد تک منہدم ہو چکا ہے۔ صرف ایک حصہ باقی ہے اور باقی جگہ پر ہندوؤں کی کوٹھیاں بن رہی ہیں یا بن چکی ہیں۔ راجا کشن گڑھ کی حویلی مجھے نہ ملی اس لیے تین بجے کے قریب میں اپنے ہوٹل میں واپس چلا آیا...

پرسوں رات اکرم صاحب سے مہرولی جانے کا وقت مقرر کرکے آئے تو شیخ سردار علی صاحب نے پھر اپنے ساتھ بہ اصرار ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ اس کے بعد نو یا ساڑھے نو بجے شب ہوٹل میں پہنچا اور جیسا اس خط کے شروع میں کہہ چکا ہوں' عبد الواحد اور ممتاز حسن کو خط لکھے اور پھر کوٹھے پر جاکر سو گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا رات بھر چلتی رہی۔ صبح اٹھا تو قریب ہی فتحپوری کی مسجد پر نظر پڑی اور اس کے پیچھے ایک عالیشان عمارت مسجد سے پشت بہ پشت نظر آئی۔ یہ سیٹھ "گڈ وڈ ڈ ڈویا" یا "گنڈویا" (جو نام بھی ہو) ان کی عمارت ہے۔ اتنی بڑی عمارت کا اپنی جگہ سے سرکنا ناممکن ہے اور چونکہ مسجد کمیٹی کی اجازت سے

انھوں نے یہ عمارت تعمیر کی ہے اس لیے امید نہیں کہ مسلمانوں کے ایجی ٹیشن کو کامیابی نصیب ہو۔

ساڑھے دس بجے کے قریب شیخ سردار علی آئے اور ہم دونوں حسبِ قرارداد فوراً جامع مسجد اور مٹیا محل سے ہوتے ہوئے اکرم صاحب کے مکان پر پہنچے۔ بارہ بجے کے قریب ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور پھر ہم تینوں شہر کی فصیل دیکھتے ہوئے اجمیری دروازے پہنچے جہاں قطب اور مہرولی جانے والی لاریوں کا اڈا ہے۔ اجمیری دروازے کے سامنے غازی الدین خاں کا مقبرہ ہے۔ اس عمارت میں اب اینگلو عربک کالج ہے۔ تھوڑی دیر اس کو پھر کر دیکھا اور پھر مہرولی روانہ ہوئے۔ برسات کے دنوں میں دلّی کے بہت سے لوگ مہرولی چلے جاتے ہیں اور خود بادشاہ بھی دو مہینے کے لیے مہرولی جایا کرتے تھے۔ ڈیڑھ بجے ہم وہاں پہنچے اور مینا بازار میں سے گزرتے ہوئے (جو وزیر آباد کے بازار کی طرح مہرولی کا ایک ہی بازار ہے) ایک بڑے سے مکان میں داخل ہوئے۔ اس مکان کے ایک حصے میں نواب خضر خاں جن سے ہم ملنے آئے تھے بطور کرایہ دار کے رہتے ہیں۔ ان کے حصے کا ایک دروازہ مکان کی مشترک ڈیوڑھی کی طرف کھلا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک پیر مرد چارپائی پر لیٹے نظر آئے۔ گلے میں کرتا نہیں تھا' صرف ایک تہمد بندھا ہوا تھا۔ ہم مکان میں داخل ہوئے اور بڑی خاموشی سے جا کر دالان میں بیٹھ گئے تاکہ وہ ہمارے شور سے بیزار نہ ہوں۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکیے نے آکر "نواب صاحب نواب صاحب" کہہ کر انھیں آوازیں دینی شروع کیں اور ایک خط انھیں دے گیا۔ اب وہ جاگ اٹھے تھے۔ نوکر نے ہمارے آنے کی اطلاع کی اور انھوں نے ہمیں فوراً بلا لیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے رہے۔ ہم تینوں سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنے کالج کے لائبریرین صاحب سے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ غالب کے خاندان کے ساتھ خضر صاحب (ان کا اصلی نام مرزا محمد حسین ہے مگر بچپن سے خضر کہلاتے ہیں) کا

کیا تعلق ہے۔ جب میرا تعارف ہوا تو غالب کا نام سن کر کہنے لگے "ہاں میرے دادا تھے۔" پھر اُمراؤ بیگم (اہلیۂ مرزا غالب) اور ان کی بہن بنیادی بیگم کے نام انھوں نے بتائے اور بنیادی بیگم کے متعلق کہا کہ میری دادی تھیں۔ بنیادی بیگم' عارف (جن کا مرثیہ "کوئی دن اَور" غالب نے لکھا تھا) کی ماں تھیں۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ عارف کے علاوہ بھی بنیادی بیگم کے کوئی بیٹے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ عارف کے ایک حقیقی چھوٹے بھائی تھے جن کا نام مرزا حیدر حسن خاں تھا۔ خضر صاحب انھی حیدر حسن خاں کے بیٹے ہیں ۔ اپنے متعلق کہا کہ میں ۱۸۵۲ میں پیدا ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سعید الدین احمد خاں (طالب) مجھ سے چھ دن بعد پیدا ہوئے تھے۔ میں نے سعید الدین احمد خاں کے متعلق کہا کہ وہ ۱۸۵۳ میں پیدا ہوئے تھے۔ کہنے لگے پھر میں بھی ۱۸۵۳ میں پیدا ہوا ہوں گا۔ اس حساب سے ان کی عمر ۸۶-۸۵ برس کی ہے۔ جب غالب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر سولہ برس کی ہوگی۔ غالب کے تین مکانوں کا پتہ انھوں نے بتایا اور ذاتی تجربے کی بنا پر بھی غالب کی بہت سی باتیں بتائیں۔ شراب کس طرح اور کس وقت پیتے تھے' مشاعرے میں غزل کس طرح پڑھتے تھے' داد کا شکریہ کس طرح ادا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ عارف کے دونوں بیٹوں کی باتیں سنائیں۔ یہ دونوں خضر صاحب کے ہم عمر تھے' اگرچہ جوانی میں انتقال کر گئے۔

خضر صاحب کا حافظہ بلا کا تیز ہے۔ باتوں کی پوری پوری تفصیل ان کو یاد ہے اور ان کے بیانات زیادہ تر بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ میں نے مرزا یوسف بیگ کی دیوانگی کے متعلق پوچھا تو کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں' اور یہ تھا بھی صحیح کیونکہ غدر میں جب مرزا یوسف کا انتقال ہوا تو خضر صاحب کی عمر چار پانچ برس کی تھی۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے' اور میں ساتھ ساتھ نوٹ لیتا رہا۔ لوہارو کے نواب صاحب کے نام مجھے خط

دینے کا وعدہ کیا اور میرا اسی سلسلے میں دوبارہ آنا بخوشی منظور کیا۔ میرا ارادہ ہے کہ ان کی تصویر لے لوں اور ان کے سوانح حیات پر ایک مختصر سا نوٹ بھی تیار کر لوں۔ جو یادداشتیں میں نے ان کی گفتگو کی لی تھیں ان کو پھیلا کر ابھی لکھنا چاہتا ہوں تاکہ ایک دفعہ پھر ان کے ہاں جا کر وہی باتیں سنوں اور اپنی تحریر میں ضروری لفظی ترمیمیں کر لوں۔ آج کچھ فراغت کا دن آیا تھا مگر وہ تمام کا تمام آپ کو یہ مفصل خط لکھنے میں صرف ہوگیا۔ اسی لیے میں نے ارادہ کیاہے کہ آیندہ خط لکھنے کے معاملے میں احتیاط کروں۔ اگر میں اسی قسم کے خط لکھتا رہا تو پھر غالب پر کتاب لکھنے کے بجائے یہ تمام دورہ خط و کتابت کی نذر کر دوں گا۔ اب اس کے بعد آپ کو بالعموم میرے مختصر خط یا کارڈ ملا کریں گے، کیونکہ اس سے زیادہ لکھنا میری کتاب کے لیے مہلک نتائج پیدا کرے گا۔ اس خط سے آپ کو یہ اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ میری سفر کی زندگی کیسی ہے اور کام کس طریقے پر ہو رہا ہے۔

مغرب کے قریب خضر صاحب ہمیں خود لوہارو والوں کی قبریں دکھانے کے لیے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں لے گئے۔ ان کے مکان کے ساتھ وہ محل دیکھا جس میں بہادر شاہ (اور ان کے والد اکبر ثانی) برسات کے دنوں میں آکر مہرولی ٹھہرا کرتے تھے۔ عارف جان اور قاسم جان (لوہارو کے خاندان کے بزرگوں) کی قبریں دیکھیں۔ نواب احمد بخش ابن عارف جان جو غالب کی بیوی کے چچا اور لوہارو کے پہلے نواب تھے، ان کی قبر دیکھی۔ ان کے دونوں بیٹے (امین الدین اور ضیاء الدین) جو غالب کے دوست تھے، ان کی قبریں بھی دیکھیں۔ پھر شاہ عالم، اکبر ثانی اور مرزا فخرو کی قبریں دیکھنے گئے۔ اکبر ثانی اور مرزا فخرو کے درمیان ایک خالی سرواوا (قبر کے لیے رکھی ہوئی جگہ) ہے۔ یہ جگہ بچارے بہادر شاہ نے اپنے لیے رکھی تھی مگر اسے دلی کی خاک میں



مرزا غالب کا مزار اور ملحقہ قبریں (تصویر : ۱۹۳۶)
دور پس منظر میں مصنف بھی

سونا نصیب نہ ہوا۔

اس احاطے سے نکل کر ساتھ ہی شاہی خاندان کی ایک قبر کو ہم دیکھ رہے تھے کہ اکرم صاحب نے کہا "دیکھیے سانپ ہیں (ہے)" ۔ ان کے اطمینان آمیز لہجے سے میں یہ سمجھا کہ اس جگہ عام طور پر سانپ پائے جاتے ہیں مگر تھوڑی ہی دیر بعد ایک چھوٹا سا سانپ قبر کے دوسری طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔

اب چونکہ گہرا جھٹپٹا ہو چلا تھا اس لیے ہم واپس آئے۔ میں نے نواب صاحب کے ہاں ایک رات رہنے کی خواہش ظاہر کی جو انھوں نے بخوشی منظور کی۔ مطلب یہ تھا کہ ذرا اور زیادہ کھل کر وہ باتیں کریں تو شاید کوئی نیا نکتہ ہاتھ آئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ ضمیر مرزا سے ملیے۔ وہ آپ کو مفید مشورہ دیں گے۔ ضمیر مرزا (ضمیرالدین احمد خاں) نواب صاحب کے داماد ہیں اور لوہارو کے سابق نواب سر امیرالدین احمد خاں کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ کل شام نواب صاحب سے رخصت ہو کر پونے دس بجے لاری میں دلّی پہنچے۔ شیخ سردار علی صاحب نے حسبِ معمول پھر اپنے ساتھ اسی ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ ساڑھے دس بجے میں اپنے ہوٹل میں پہنچا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک نواب صاحب کی کچھ اَور باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا اور ان کی یادداشتیں پہلی یادداشتوں کے ساتھ شامل کیں۔ اس کے بعد چھت پر جاکر سو گیا۔ ٹھنڈی ہوا حسبِ معمول خوب چل رہی تھی۔

یہ تو کل کی روئداد ختم ہوئی۔ آج صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھا۔ شیو کے بعد غسل کیا۔ دودھ اور توس مکھن کا ناشتہ جلدی سے کیا اور کپڑے بدل کر ہندوستانی دواخانے گیا۔ (ہندوستانی دواخانہ بلیماراں کے جس مکان میں ہے وہ غالب کا آخری مکان تھا۔) یہاں اکرم صاحب حسبِ قرارداد میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان کو ساتھ لے کر گلی

قاسم جان سے ہوتا ہوا ضمیر مرزا کے پاس پہنچا۔ ان کا مکان پرانا اور شکستہ ہے۔ خود بھی کچھ ایسے مرفہ الحال نہیں۔ ڈیوڑھی میں آئے اور ملے۔ عمر ستر پچھتر برس کی ہوگی۔ اب یاد آیا کہ انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش ۱۹ دسمبر ۱۸۶۷ بتائی تھی۔ اپنے خسر کے مقابلے میں مجھے خشک سے معلوم ہوئے۔ بہرحال ان سے پون گھنٹہ تک باتیں ہوئیں۔ پھر حاضر ہونے کی اجازت ان سے بھی لے لی۔ مگر دراصل ان سے کچھ حاصل نہ ہوا ۔ ہاں یہ تصدیق ہو گئی کہ جو مکان میں نے پرسوں دوپہر دیکھا تھا وہ نواب شمس الدین ہی کا تھا۔ انھوں نے ایک تو یہ کہا کہ اس مکان کا نمبر نو یا سات ہے (میں نے جو مکان دیکھا اس کا نمبر سات ہی تھا) اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کا مکان "زینت المساجد" سے بالکل ملا ہوا ہے۔ اور یہی کیفیت اس مکان کی تھی جو میں نے دیکھا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب شمس الدین لاولد نہیں مرے تھے' بلکہ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ انھی کی بیٹی نے یہ مکان کسی کے پاس بیچ دیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جہانگیرہ بیگم (ہمشیرۂ شمس الدین خاں) کی شادی آگرے کے کسی ایرانی سے ہوئی تھی۔ اس کے برعکس نواب خضر مرزانے (کسی قدر رکتے ہوئے) یہ کہا تھا کہ جہانگیرہ بیگم کی شادی قلعے کے کسی شہزادے سے ہوئی تھی۔ ضمیر مرزا کا بیان غالباً صحیح ہوگا۔ کہتے ہیں کہ فریزر کے ساتھ شمس الدین کا فساد جہانگیرہ بیگم کے متعلق ہی ہوا تھا۔ مگر لوہارو والے اس کی تردید کرتے ہیں۔

آٹھ بجے کے قریب ضمیر مرزا سے مل کر میں حوض قاضی سے ہوتا ہوا فتحپوری کو آ رہا تھا کہ چوک کے پاس پہنچ کر کسی کی آواز سنائی دی "حمید صاحب !" دیکھا تو حفیظ ہوشیارپوری ایک ہوٹل کے نیچے کھڑے اپنا سامان اوپر بھجوا رہے تھے۔ ان کو دلّی پہنچے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے کہ میں انھیں دکھائی دیا۔ دیوان سنگھ



بیگم سمرو (عجائب گھر، دہلی)

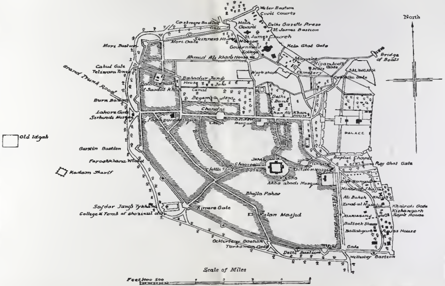


نواب شمس الدین خاں (عجائب گھر، دہلی)



ولیم فریزر (عجائب گھر، دہلی)

— DELHI IN 1857. —



By D. Ghulam Nabi

No. 503-L-2000

مہتمم ریاست نے انھیں سو روپے ماہوار پر دلّی بلا لیا ہے۔ میں دس بجے تک ان کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد یہ نہا دھو کر فارغ ہوئے تو میرا ہوٹل دیکھنے آئے۔ اس کمرے میں دو منٹ بیٹھ کر یہ تو دیوان سنگھ کے پاس گئے اور میں نے کچھ دیر اکرام کا "غالب نامہ" دیکھنے کے بعد گیارہ بجے یہ خط لکھنا شروع کیا۔ ایک بجے کے قریب کھانا کھایا۔ اس (ہندو) ہوٹل میں کھانا کھانے کا یہ میرا پہلا اتفاق ہے۔ صرف سبزی اور دال پر قناعت کی۔ کیونکہ یہاں کا حرام گوشت کھانا مجھے منظور نہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر "غالب نامہ" پڑھا اور پھر ڈھائی بجے تک سوتا رہا۔ تین بجے پھر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اب چھ بجنے کو ہیں' خط بند کروں گا۔ حفیظ صاحب حسب قرارداد پونے سات بجے آئیں گے۔ ان کو لے کر شیخ سردار علی کے ہاں جاؤں گا جہاں اکرم صاحب بھی سوا سات بجے آئیں گے۔ پھر ممکن ہوا تو چاروں مل کر صادق الخیری سے ملنے جائیں گے۔

کرم آباد میرا خط اگر کوئی آئے' تو ۲۰ جولائی کے دن تک' بلا تأمل "معرفت شیخ سردار علی صاحب' بی۔اے۔' اینگلو عربک ہائی سکول' دریا گنج' دہلی" بھیجتی رہیے۔ اس کے بعد بھی میں چند روز تک شاید یہیں ٹھہروں لیکن پھر میری مزید ہدایات کا انتظار کیجیے۔

بھائی حامد علی خاں کو بتا دیجیے کہ میں نے پرسوں شام شاہد احمد صاحب سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر معلوم ہوا کہ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔

۲

امپرس ہوٹل، فتحپوری، دہلی

۱۵ جولائی ۱۹۳۸ء، ۱۱ بجے شب

ایک خط جو بہت مفصّل تھا کل ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ اب اس نئے خط کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پھر اُسی قسم کی چیز آپ کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس خط میں کل شام اور آج دن بھر کی باتیں لکھوں گا۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھوں گا۔ جب دو چار صفحے ہوگئے تو آپ کو بھیج دوں گا۔ اس عرصے میں خیریت کی اطلاع کے لیے دوسرے تیسرے دن ایک کارڈ آپ کو لکھ دیا کروں گا۔

کل صبح تک کی روئداد اپنے گزشتہ مفصّل خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔ بعد میں حفیظ ہوشیارپوری آئے۔ ان کو ساتھ لے کر شیخ سردار علی صاحب کے پاس گیا۔ اکرم صاحب بھی آگئے اور ہم چاروں صادق الخیری سے ملنے کوچہ چیلاں گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ آغا طاہر نبیرۂ آزاد کا مکان قریب تھا۔ ہم ان کے پاس چلے گئے۔ وہ اخلاق سے پیش آئے، اگرچہ وقتاً فوقتاً دہلوی رواج کے مطابق پنجابیوں پر چوٹ بھی کر جاتے تھے۔ حفیظ نے میرے تعارف کے سلسلے میں بھائی حامد علی خاں کا نام لیا تو کہنے لگے کہ وہ تو بعض دفعہ ایسے ایسے شعر کہہ جاتے ہیں کہ بس بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ پھر کہنے لگے وہ بہت ذہین آدمی تھے لیکن عدم تعاون نے ان کو نقصان پہنچایا۔ ذوق، مومن، امام بخش صہبائی کے مکانوں کا موقع دکھانے کا وعدہ انھوں نے کیا۔ اپنا آبائی مکان (یعنی آزاد اور ان کے والد مولوی محمد باقر کا مکان) بھی دکھائیں گے۔ سرسید کے خاندان کے ایک بزرگ نواب مصلح الدین سے ملانے کا وعدہ کیا۔ نواب صاحب آنکھوں سے معذور ہیں مگر بقول

آغا صاحب کے پرانی دلّی سے جتنی واقفیت ان کو ہے اور کسی کو نہ ہوگی۔ واپسی پر سرسید کا مکان دیکھا جہاں وہ "غدر" سے پہلے رہا کرتے تھے۔ سید محمود شراب سے مخمور ہوکر جس کمرے میں بیٹھتے تھے، وہ بھی دیکھا۔ آغا صاحب نے دوسرے دن یعنی آج سہ پہر ساڑھے پانچ بجے چائے پر بھی بلایا ہے۔ مجھ سے کہا ہے کہ حسن نظامی سے بھی ملیے۔ سات بجے کے نکلے ہوئے، ہم رات کے دس بجے آغا صاحب کے مکان سے لوٹے۔ کھانا کھانے کے بعد ساڑھے گیارہ بجے کے قریب سونے کا موقع ملا۔

رات کو تھوڑی سی بارش ہوگئی۔ اس لیے اٹھ کر نیچے آنا پڑا اور اسی وجہ سے میں دیر سے اٹھا۔ بہت سے کام کرکے میں ساڑھے گیارہ بجے کے قریب باہر نکلا۔ فریزر کا مکان، فریزر کی قبر اور وہ جگہ جہاں فریزر قتل ہوا تھا ان سب کو دیکھنے کا ارادہ تھا۔ پہلے ٹریم میں بیٹھ کر "برف خانے" گیا۔ "برف خانے" کے سامنے جو سڑک Ridge Road (رج روڈ) کہلاتی ہے اس کے شروع میں موڑ پر نواب شمس الدین کے داروغہ کریم خاں نے فریزر کو گولی مار دی تھی۔ اس سے آگے انگریزوں کا بنایا ہوا مینار ہے جو "غدر" میں کام آنے والے انگریزی سپاہیوں کی یادگار کے طور پر قائم ہے۔ اس سے اور آگے بڑھ جائیں تو "ہندوراؤ سول ہسپتال" آتا ہے۔ یہی فریزر کا مکان ہے جو اس نے اپنے رہنے کے لیے شہر سے باہر بنوایا تھا۔ اس میں اب بہت اضافہ ہو چکا ہے، مگر ایک شخص نے بتایا ہے کہ پتھر کا حصہ پرانا مکان ہے۔ چنانچہ میں نے اندر جاکر اسے دیکھا۔ سامنے مشرقی وضع کی ایک شاندار ڈیوڑھی ہے جس کی چھت ایک نہایت عمدہ فراخ اور ہوادار نشست کا کام دے سکتی ہے۔ فریزر شام کو اکثر اس پر بیٹھتا ہوگا۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی محراب والا کمرہ ہے۔

جہاں انگریزوں کا یادگار "غدر والا" مینار ہے، وہاں بھی میں گیا۔ اس جگہ "غدر" کے دنوں میں انگریزی فوج کی چھاؤنی تھی۔ یہاں سے دلی کا شہر، جامع مسجد، لال قلعہ، سب ایک

نظر میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ آج سے ۸۱ برس پہلے یہاں انگریز افسر بے بسی کے عالم میں کھڑے ہو کر ہندوستان کے پائے تخت کو دیکھا کرتے تھے۔ یہ جگہ ایک پہاڑی پر ہے جو کچھ ایسی اونچی نہیں۔ اس کے چاروں طرف اس وقت جنگل ہوگا۔ اب بھی اتنے ہی درخت ہیں جیسے جنگل ہو۔ ان درختوں کے درمیان پہاڑی کے سب سے بلند مقام پر فریزر نے اپنا مکان بنایا تھا۔

فریزر کے مکان کے پیچھے قریب ہی شمال مشرق کی طرف ایک اونچی سی بارہ دری کی شکل کی عمارت نیم منہدم حالت میں کھڑی ہے۔ اسے "پیرغیب" کہتے ہیں۔ سنا ہے کہ "غدر" کے دنوں میں اسے بہت نقصان پہنچا تھا۔ میں اس کے اوپر بھی گیا۔ یہاں ہوا لطیف تھی۔ جنگل کی ابابیلیں ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھیں اور شہر کے علاوہ جمنا کا پانی بھی دور کہیں کہیں جھلکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جنگل میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد موروں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ مغرب کی طرف جو باؤلی ہے' ("ہندوؤں کی باؤلی") وہ بھی میں نے اتر کر دیکھی۔

اس کے بعد میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ فریزر کے مکان سے موجودہ برف خانے کے چوراہے تک' جہاں وہ قتل ہوا تھا (اس کے مکان کی طرف آنے والی) سڑک کے پیچ و خم کا بھدا سا نقشہ میں نے بنایا۔ یہاں سے چل کر میں موری دروازے پہنچا۔ اپنی زندگی کی آخری شام کو فریزر شہر میں دعوت کھا کر اسی دروازے سے باہر نکلا تھا اور اپنے پہاڑی والے مکان کو روانہ ہوا تھا۔ موری دروازے سے بڑھ کر میں کشمیری دروازے پہنچا۔ کرنیل سکنر کا گرجا دیکھا جو ۱۸۲۴ میں تعمیر ہوا تھا۔ سکنر ایک مشہور اینگلو انڈین خاندان کا مورث ہے جس کے اکثر ارکان نے ہندو اور مسلمان عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ اس خاندان کے لوگوں کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ۱۹۲۷ یا ۱۹۲۸ میں مرے ہیں وہ بھی یہاں دفن ہیں۔ اس خاندان کے بعض افراد انگلستان میں مرے۔ ان کی لاشیں بھی وہاں سے

ہندوستان پہنچا لر یہیں سپرد خاک کی گئیں' جیسا ان کی قبروں کی لوحوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک سکنر کا انتقال ۱۹۱۸ کے انفلوئنزا میں ہوا۔ اس کی بیوی نے اپنی الفت کا اظہار اس کی قبر کے کتبے پر بڑے اثر اور خلوص سے کیا ہے۔ شوہر (جون جیمز سکنر) کی عمر ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۸ کو جب وہ مرا' تیس برس اور ایک مہینے کی تھی۔ اس کی بیوی ونفرڈ نے علاوہ اور باتوں کے کچھ شعر بھی قبر پر کندہ کرائے ہیں۔ یہ شعر بہت اچھے نہیں ہیں لیکن ان میں خلوص ہے اور قبرستان میں کھڑے ہو کر انھیں پڑھیں تو طبیعت میں ایک درد ضرور پیدا ہوتا ہے . . .

اسی گرجے کے احاطے میں سرٹامس مٹکاف کی قبر ہے جو ۱۸۵۳ میں مرا تھا۔ یہ قبر مشرقی طرز پر بنی ہے۔ گرجے کے بالکل سامنے فریزر کی قبر ہے جو خوشنما معلوم نہیں ہوتی۔ اس پر فریزر کا نام اور تاریخ قتل (۲۲ مارچ ۱۸۳۵) لکھی ہے۔ ساتھ ہی کرنیل جیمز سکنر نے اپنے رنج و غم کے اظہار کے طور پر چند فقرے کندہ کرائے ہیں۔

یہاں سے میں جامع مسجد گیا تاکہ سیڑھیوں پر جو دکانیں جمعے کے دن لگتی ہیں (آج جمعہ تھا) ان کی بہار دیکھ سکوں۔ مسجد فتحپوری کی ہڑتال کی وجہ سے شاید آج ان کی بہار زیادہ نہ تھی۔ بادشاہی زمانے میں یہاں ہر جمعے کو بڑا میلہ لگتا تھا۔

چار بجے کے بعد میں اپنے ہوٹل پہنچا۔ بہت تھک گیا تھا مگر جلدی سے تیار ہو کر اور حفیظ ہوشیارپوری کو ساتھ لے کر شیخ سردار علی کے گھر پہنچا۔ وہاں سے اکرم صاحب بھی ساتھ ہوئے اور چھ بجے آغا طاہر کے گھر گئے۔ انھوں نے فوراً چائے پیش کی اور حسب معمول بہت سی باتیں کرتے رہے۔ آج ان سے کچھ حاصل نہ ہوا بلکہ ابھی تک سوائے پُرلطف گفتگو کے اور کچھ نہیں ملا جو میرفی کتاب کے لیے مفید ہو۔ نو بجے ان کے گھر سے نکلے۔ اتنے گھنٹے اس طرح بیکار کھونا میرے لیے اچھا نہیں۔ مگر اب انھوں نے پیر (۱۸ جولائی) کی صبح کو مختلف مقامات دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ ان سے رخصت ہو کر میں دس بجے کے قریب

ہوٹل پہنچا اور اس وقت (رات کے بارہ بجے تک) یہ تین صفحے خط کے لکھے ہیں۔ اب سوؤں گا۔ آج چونکہ بارش کا خطرہ ہے اس لیے کمرے کے اندر ہی سو جاؤں گا۔ ضرورت ہوئی تو بجلی کا پنکھا چلتا رہے گا۔ ہاں آج ڈاکٹر بھٹناگر کا خط میرے خط کے جواب میں آیا ہے کہ وہ مجھے اپنے ماموں کے گھر (سکندر آباد) نہیں لے جا سکتے۔

۱۷ جولائی، ۹ بجے شام

کل اور آج کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا۔

کل صبح شیو وغیرہ سے فارغ ہوکر میں اکرم صاحب کے مکان پر آٹھ بجے کے قریب پہنچا۔ ان کے خسر فیض احمد صاحب (ملازم میونسپل کمیٹی) سے ملاقات کی تاکہ شہر دہلی کا کوئی نقشہ کمیٹی کے دفتر سے حاصل ہو سکے۔ انھوں نے دو بجے دفتر آنے کے لیے کہا۔ اکرم صاحب اس سلسلے میں کمیٹی کے ایک اوورسیر کے مکان پر بھی گئے مگر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اپنے ایک بوڑھے ماموں سے جو پرانی دہلی کے حالات جانتے ہیں، ملنے کے لیے گئے، مگر وہ بھی گھر پر نہ تھے۔ اس کے بعد ساڑھے دس بجے کے قریب میں شوراج بہادر سے ملنے گیا۔ یہ کسی انشورنس کمپنی کے مینجر ہیں اور دلّی کے ہندو رؤسا کے خاندان سے ہیں۔ ان کے نام عبدالواحد نے خط دیا تھا۔ یہ بہت اخلاق سے ملے۔ معلوم ہوا کہ جیون لال کے پڑپوتے ہیں۔ جیون لال "غدر" میں انگریزی مخبر تھا اور اس کا روزنامہ "غدر" مشہور ہے۔ شوراج بہادر نے کہا کہ مرزا ہرگوپال تفتہ کی اولاد کے نام سکندر آباد جانے کے لیے تعارفی رقعہ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری سے کہوں گا کہ نقشۂ شہر کہیں سے مہیا کر دے۔ تم پرسوں مجھ سے دریافت کرنا۔

ان سے مل چکنے کے بعد بارہ بجے کے قریب کھانا کھایا۔ ایک گھنٹے تک آرام کیا اور پھر تیار ہوکر دو بجے کے قریب میونسپل کمیٹی کے دفتر گیا۔ فیض احمد صاحب نے بہت کوشش کی

مگر کوئی مناسب نقشہ نہ مل سکا۔ یہاں سے میں شیخ سردار علی صاحب کے گھر گیا۔ ان کے ایک دوست اعجازالدین صاحب اینگلو عربیک سکول میں مدرّس ہیں۔ اعجازالدین صاحب کے ایک عزیز اشفاق صاحب لال قلعے کے عجائب گھر کے نگراں ہیں۔ چار بجے ہم ان کے پاس گئے۔ وہ بہت اچھی طرح ملے۔ چائے سے تواضع کی۔ کہنے لگے کہ "پنج آہنگ" کا پہلا مطبوعہ نسخہ، جس کی تصحیح خود غالب نے اپنے ہاتھ سے کی تھی، میرے پاس فروخت کے لیے آیا تھا اور مالک صرف آٹھ روپے قیمت مانگتا تھا۔ اگر آپ آٹھ دس دن پہلے آجاتے تو یہ کتاب آپ کو مل جاتی۔ اب ڈاکٹر ذاکر حسین مجھ سے لے جا چکے ہیں۔ بہرحال ان سے مدد کی بہت امید ہے۔ نواب شمس الدین کی تصویر دیں گے۔ پرانی دلّی کا نقشہ بھی ان سے مل جائے گا۔ زمانہ غدر کے انگریزی اور اردو اخبارات بھی دیکھنے کو دیں گے۔ ان سے پرسوں منگل کے دن قلعے میں ملنا ہے۔

چھ بجے ان سے رخصت ہوکر مُلّا واحدی صاحب سے ملے۔ یہ بھی خوشی سے ملے اور جب میں نے انھیں اپنا "اسوۂ حسنہ" والا مضمون یاد دلایا جس کو انھوں نے بارہ سال پہلے بہت پسند کیا تھا، تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے اور مجھے بھی خوشی ہوئی کہ انھیں وہ مضمون اب تک یاد ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ شاہ ولی اللہ کے خاندان کی قبروں اور مومن کی قبر کا پتا انھوں نے بتایا۔ سوا سات بجے ان سے رخصت ہوکر مولانا راشدالخیری کے گھر آئے۔ رازق الخیری ملے۔ کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ اس کے بعد شیخ سردار علی صاحب کے گھر آکر شام کا کھانا کھایا اور نو بجے کے قریب پھر باہر نکلے تاکہ دوسرے دن (یعنی آج) کے لیے ان کے ایک دوست سے بائیسکل لیں۔ ان دوست کے گھر پہنچے ہی تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ گھنٹہ بھر وہاں بیٹھے رہے۔ آخر ان سے بائیسکل لے کر اور اسے ایک تانگے پر رکھوا کر گیارہ بجے شب کے قریب ہوٹل پہنچا۔

آج صبح پونے پانچ بجے اٹھ کر جلدی سے تیار ہوا۔ بائیسکل پر سوار ہوکر سوا چھ بجے

اکرم صاحب کے مکان پر پہنچا کیونکہ آج اتوار کی وجہ سے ان کو اور سردار علی صاحب کو چھٹی تھی اور آج چند گھنٹے ہم شہر کی سیر میں صرف کرنا چاہتے تھے۔ اکرم صاحب بیمار تھے۔ اس لیے وہ میرے ساتھ نہ آسکے۔ جو جگہ سردار علی صاحب سے ملنے کے لیے مقرر کی تھی اس تک مجھے اکرم صاحب کی مدد سے پہنچنا تھا۔ اس لیے اب بڑی جدوجہد کے بعد میں سات بجے کے قریب ان کے پاس پہنچ سکا۔ وہ مجھے ارون ہسپتال کے پاس ایک قبرستان تک پہنچا کر خود اسٹیشن چلے گئے جہاں انھیں کچھ کام تھا اور میں قبروں کی چھان بین کرتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد کسی خاص دقّت کے بغیر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی قبریں مل گئیں۔ ان کی قبروں کے احاطے کے باہر دیوار کے ساتھ بچارے مومن کی بے نام و نشان قبر ہے۔ خود قبر بھی مٹ چکی ہے لیکن مجاور نے بھی واحدی صاحب کے بیان کی تصدیق کی کہ حکیم مومن خاں کی قبر یہیں تھی۔ گلے سڑے پتوں کا ڈھیر خودبخود جمع ہوگیا تھا اور اس کے ذریعے سے قدرت نے اس قبر کی نشاندہی کی تھی۔ قبر کے سرہانے کی طرف پیڑی (؟) کا ایک فضول پودا اگ رہا تھا اور اسی قسم کے بے شمار جنگلی پودے قبرستان کے دوسرے اطراف میں بھی اگے ہوئے تھے۔ یہ اردو کے اُس شاعر کا حال تھا جس کا پایہ بعض لوگوں کے نزدیک غالب سے بھی بلند ہے۔

میں نے بیدل کی قبر (جو اسی نواح میں ہے) ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کچھ پتا نہ چلا۔ میر درد کے نام سے قریب ہی ایک سڑک موسوم تھی مگر دھوپ میں ایک گھنٹے کی کدوکاوش کے باوجود مجھے ان کی قبر بھی نہ مل سکی۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ پورے شہر کے گرد بائیسکل کا ایک چکر لگاؤں تاکہ شہر کے دروازوں اور عام شکل و صورت کا کوئی اندازہ ذہن میں قائم ہو سکے۔ چنانچہ گیارہ بجے سے لے کر ساڑھے چار بجے سہ پہر تک اس کام میں مصروف رہا۔ عیدگاہ بھی دیکھی اور قدم شریف کا قبرستان بھی۔ یہاں نواب شمس الدین دفن ہے، جسے پھانسی ہوئی تھی۔ فریزر کے قتل کے مقام کا غلط نقشہ میں نے تیار کرلیا تھا۔ اس کی تصحیح

بھی پھر فریزر کے مکان تک جا کر کی۔ فریزر جس رستے سے گھر کو جایا کرتا تھا وہ خوب ہے۔ جب میں پہاڑی والی سڑک پر چڑھا تو جنگل میں چہکتی ہوئی بلبلوں کی آوازیں ہر طرف سے آ رہی تھیں۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ کی شام کو وہ بڑی سڑک سے اس طرف مڑا ہی تھا کہ نواب شمس الدین کے آدمی نے اسے گولی مار دی۔

اس عرصے میں مَیں نے واپس شہر آکر کھانا کھایا اور پھر باہر نکلا۔ "غدر" کے زمانے کے چند آثار دیکھے اور پھر لال قلعے کے پچھلی طرف گیا جدھر دریا بہتا ہے۔ یہ علاقہ یہاں بھی (دریا کا) بیلا کہلاتا ہے۔ بیلے کی طرف سے دیوانِ عام وغیرہ کو دیکھنا عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ آج سے اکاسی برس پہلے اِسی بیلے کی طرف سے میرٹھ کی فوج قلعے کے نیچے آکر جمع ہوئی تھی اور بادشاہ نے انگریز کپتان ڈگلس کو ان سے بات کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اکاسی برس میں دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ اس وقت شہر پر ہندوستانیوں کی حکومت تھی اور چند مہینوں تک بہادر شاہ نے ایسی حکومت دیکھی جیسی نہ اس کے باپ اور نہ اس کے دادا کو نصیب ہوئی تھی۔ اکاسی برس پہلے اسی جولائی کے مہینے میں انگریزی فوج کو شکستوں پر شکستیں ہو رہی تھیں اور اسے شہر میں گھسنا نصیب نہیں ہوتا تھا اور اب اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ آج بھی وہی گھٹا تھی اور ہوا بیلے میں اسی طرح چل رہی تھی جیسے بہادر شاہ کے وقت میں چلتی ہوگی۔ درختوں میں بلبلوں کا چہچہانا ہر طرف سے سنائی دیتا تھا اور ہریاول پر ادھر ادھر مینائیں پُھدکتی پھرتی تھیں۔ کبھی کبھی پپیہے (؟) کی آواز بھی آتی تھی۔ اتفاق سے بیلے کی سنسان سڑک پر کسی راہ گیر نے غالب کی یہ غزل پڑھنی شروع کر دی ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

اِتنے میں دور سے گڑگڑاہٹ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں شیطان کا چرخا بھک بھک دُھواں اُڑاتا اور پیچھے تھرڈ کلاس کی گاڑیاں کھینچتا ہوا عین قلعۂ معلّٰی کے بیچ میں گھستا ہوا نظر آیا۔

قلعہ معلّٰی سے تھوڑے ہی فاصلے پر نواب شمس الدین کا مکان ہے جو اب بیشتر منہدم ہو چکا ہے۔ تھوڑا سا حصہ جو بچا ہوا ہے اس پر آج ایک سفید گدھ بیٹھا تھا۔ زینت المساجد سے آگے بڑھ کر وہ جگہ ہے جہاں راجہ کشن گڑھ کا مکان تھا۔ یہ بھی اب مسمار ہو چکا ہے۔ خالی احاطہ اور مکان کا ایک گوشہ باقی ہے۔ اپنی زندگی کی آخری شام فریزر اِسی مکان سے دعوت کھا کر نکلا تھا۔

ہاں قدم شریف میں طوائفوں کی قبریں بھی بڑے ناز سے بنی ہوئی ہیں اور ان پر "اللہ اکبر" وغیرہ اُسی شان سے لکھا ہوا ہے جس طرح شرفا کی قبروں پر۔ قدم شریف سے ذرا ہٹ کر باہر بھی کچھ قبریں تھیں، میں ان پر بھی نظر ڈالنے گیا۔ اس وقت دھوپ خوب چمک رہی تھی اور بارہ بجے کا وقت تھا (بادل تین بجے کے قریب آیا تھا)۔ ایک غریبانہ سی قبر پر ایک بدنما پتھر لگا تھا جس پر نہایت بدخط (غالباً کوئلے سے) لکھا تھا:

"والدہ عبدالماجد

فاتحہ پڑھتے جاؤ"

قبرستان میں اُس وقت میرے اور دھوپ اور مُحتنوں کے سوا اور کوئی نہ تھا لیکن یہاں پہنچ کر میں رکا اور عبدالماجد کی ماں کی قبر پر فاتحہ کہی۔

سارے شہر کا چکر کاٹ کر میں چار بجے پھر دہلی دروازے پہنچا۔ بیدل کی قبر دوبارہ تلاش کی مگر پھر بھی نہ ملی۔ پانچ بجے شیخ سردار علی کے گھر آیا اور اپنی ڈاک وصول کی۔ سات بجے شام (صبح کا نکلا ہوا) ہوٹل پہنچا۔ آج میں خوب تھکا۔

واقعات کی موجودہ رفتار کے اندازے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ ۲۵ جولائی تک بلکہ اس کے بعد بھی ایک آدھ دن تک شیخ سردار علی صاحب اینگلو عربک ہائی سکول، دریا گنج دہلی کے پتے سے مجھے خط لکھتی رہیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔

۳

معرفت شیخ سردار علی صاحب، بی۔اے۔
اینگلو عربک ہائی سکول، دریا گنج، دہلی
۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء

کل ایک مفصل خط ڈاک میں ڈال چکا ہوں۔ اس میں میرے ۱۷ جولائی تک کے حالات درج تھے۔ اب کل کا اور آج کا حال لکھتا ہوں۔

کل صبح اٹھ کر آغا طاہر سے ملنے گیا۔ میں ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ان کے پاس پہنچا اور انہوں نے باتوں باتوں میں دہیں دس بجا دیے۔ اس کے بعد مجھے تانگے پر ساتھ لے کر اندرون کشمیری دروازہ گئے۔ یہاں چھوٹا بازار، کھڑکی ابراہیم علی خاں میں مولوی محمد باقر کا مکان اب تک موجود ہے۔ مولوی محمد باقر، آغا طاہر کے پردادا، محمد حسین آزاد کے والد، ذوق کے دوست اور دہلی میں شاید سب سے پہلا چھاپہ خانہ لانے والے تھے۔ انہیں "غدر" میں (فریزر والی) پہاڑی پر گولی مار دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے اس میں مولوی رجب علی خاں "ارسطو جاہ" کا ہاتھ تھا۔ یہ رجب علی خاں وہی ہیں جن کے خاندان سے ملنے کے لیے میں لدھیانے سے جگراؤں گیا تھا۔ غدر میں مولوی رجب علی خاں نے انگریزوں کی بڑی خدمات سرانجام دیں۔ مولوی محمد باقر ان کے استاد تھے مگر (بقول آغا طاہر کے) انھوں نے مولوی صاحب کو بلا تکلف گولی کا نشانہ ہو جانے دیا۔ اس پرانے مکان پر ذوق کی کہی ہوئی تاریخ جس سے ۱۲۶۰ھ کا سال نکلتا ہے ایک لوح پر درج ہے مگر یہ لوح حال ہی میں لگائی گئی ہے۔ اس کے ایک حصے میں آغا طاہر کے چھوٹے بھائی آغا باقر رہتے ہیں اور دوسرے میں جہاں پرانا دالان بھی ہے میونسپل بورڈ گرل سکول ہے۔ لڑکیاں ڈولی میں گھر جاتی ہیں اس لیے اگرچہ گیارہ بجے سے پہلے مدرسے میں چھٹی ہوگئی تھی، ہم کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب

مدرسہ یعنی مولوی محمد باقر کا مکان دیکھنے کا موقع مل سکا۔ یہاں سے واپس ہو کر جامع مسجد کے قریب کی ایک دکان سے قدیم دہلی کے نام کی ایک کتاب میں نے آغا طاہر کے مشورے سے خریدی۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے۔

کھانا کھا کر دو بجے کے بعد ہوٹل پہنچا۔ کچھ آرام کیا اور کچھ کام۔ پانچ بجے کے قریب حفیظ ہوشیارپوری آگئے۔ ان کے ساتھ چائے پی اور پھر چھ بجے شیخ سردار علی کے گھر پہنچے۔

اکرم صاحب چونکہ بیمار ہیں اس لیے خیال تھا کہ وہ شام ان کی عیادت کے لیے مخصوص رکھی جائے۔ وہاں پہنچے تو شیخ سردار علی صاحب گھر سے جا چکے تھے کیونکہ انھیں ایک ضروری کام تھا۔ سات بجے کے بعد وہ آئے مگر اب اکرم صاحب کے ہاں جانے کا وقت نہ تھا' اس لیے آٹھ بجے وہاں سے اٹھ کر اور رستے میں (حفیظ صاحب کے ساتھ) کھانا کھا کر نو بجے ہوٹل پہنچا۔ یہاں پہنچ کر رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک میں اُن باتوں کی ایک بڑی لمبی فہرست تیار کرتا رہا جو دلّی اور غالب کے متعلق صبح مجھے نواب مصلح الدین سے پوچھنی تھیں۔ مگر یہ شام باہر کے کام کے لحاظ سے بے کار گئی۔ اس کا مجھے افسوس ہوا۔ کل سردار علی صاحب کے مکان پر مجھے آپ کا ۱۶ جولائی کا نوازش نامہ ملا تھا۔

گزشتہ رات (یعنی ۱۸ اور ۱۹ جولائی کی درمیانی رات کو) یہاں خوب بارش ہوئی۔ صبح تک ہوتی رہی۔ میں تو خیر اب یوں بھی تین چار دن سے اندر ہی سوتا ہوں۔ آج صبح سات بجے کے قریب میں یہاں سے نکل سکا۔ آغا طاہر کے پاس گیا۔ وہ آٹھ بجے نواب مصلح الدین کے پاس لے گئے۔ نواب صاحب ستّر برس کے لگ بھگ ہوں گے۔ آنکھوں سے معذور ہوگئے ہیں۔ دلّی کی پرانی شرافت کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ سر راس مسعود مرحوم کے ماموں ہیں۔ دس بجے تک ان سے مختلف قسم کی باتیں پوچھیں اور ساتھ ساتھ کاغذ پر یادداشتیں لیتا رہا۔

دس بجے نواب صاحب کے مکان سے نکلتے ہی تانگا لے کر میں قلعے پہنچا تاکہ اشفاق علی صاحب

سے ملوں۔ معلوم ہوا کہ دس بجے کے بعد قلعے میں داخلے کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ ناچار یہاں سے ہارڈنگ لائبریری گیا۔ وہاں کے لوگ بڑی آؤ بھگت سے ملے۔ کہتے تھے کہ غالب اور دہلی کے متعلق جتنی کتابیں ہیں' سب نکال کر آپ کو دکھائیں گے۔ "دستنبو" کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۸۶۲ کا لکھا ہوا تھا' میں نے وہاں دیکھا۔ گیارہ بجے لائبریری چونکہ بند ہو جاتی ہے اس لیے دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے لائبریری کے خوش خلق کاؤنٹر کلارک رفیق الدین صاحب سے رخصت ہوا۔

بارہ بجے دوپہر کے بعد میں کھانے سے فارغ ہوکر گھر یعنی ہوٹل آگیا تھا۔ پانچ بجے کپڑے پہن کر تیار ہوا تو یاد آیا کہ آج کی اور کل کی روئیداد ہی آپ کو جانے سے پہلے لکھ ڈالوں چنانچہ چھ بجے کے قریب اب یہ خط ختم ہورہا ہے۔ اب شیخ سردار علی صاحب کے مکان پر اور وہاں سے اکرم صاحب کے گھر جاؤں گا۔ ان سے کام بھی ہے اور ویسے بھی ان کی عیادت ضروری ہے۔ جب تک وہ تندرست تھے بچارے بہت جگہ میرے ساتھ پھرتے رہے۔ رات کو نو بجے گھر آکر کچھ ضروری خط لکھوں گا۔(عبدالواحد' ممتاز حسن' آغا محمد طاہر فاروقی' آگرہ' پرنسپل اسلامیہ کالج کو) کل صبح شیو وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی اشفاق علی صاحب سے ملنے قلعے کو چلا جاؤں گا کیونکہ دراصل ان سے آج صبح ملنے کا وعدہ تھا۔

آج ٹیلی فون پر شوراج بہادر سے بھی بات ہوئی۔ وہ بچارے بہت اچھے آدمی ثابت ہوئے ہیں۔ سکندر آباد (مرزا گوپال تفتہ کا وطن) کے لیے تعارف کا کوئی خط لے دیں گے۔ اس کے علاوہ سیکرٹری میونسپل کمیٹی سے بھی بات کر چکے ہیں۔ کل قلعے اور ہسپتال سے فارغ ہوکر میونسپلٹی کے سیکرٹری قزلباش صاحب سے ملوں گا۔

امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے۔ . . . میرا خیال ہے کہ آپ ۲۹ جولائی کے دن اپنا آخری خط دہلی کے پتے سے لکھیے۔ اس کے بعد اول تو میں ہی دہلی سے جا چکا ہوں گا' دوسرے شیخ سردار علی صاحب کا مدرسہ بھی یکم اگست سے دو مہینے کے لیے بند ہورہا ہے . . .

۴

دہلی

۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء

میرا آج کا پروگرام خاصا بھرا ہوا ہے۔ صبح پونے چھ بجے اٹھ کر ناشتہ، شیو، غسل وغیرہ کرکے کپڑے بدلے۔ آٹھ بجے قلعے گیا۔ بارہ بجے تک وہاں کتابیں دیکھیں اور اپنی کتاب کے لیے بعض تصویروں کا انتخاب کیا۔

شیخ سردار علی کے گھر سے ڈاک پوچھی، مگر کوئی خط نہ تھا۔ پھر جامع مسجد کے پاس ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ دو بجے اپنے ہوٹل آیا۔ پتلون پر سیاہی کے دو دھبے لگ گئے تھے، ان کو ٹاٹری دودھ وغیرہ سے صاف کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرہ صاف کرا کے ہاتھ منہ دھویا اور آپ کو خط لکھنے بیٹھا۔ دن کے باقی حصے کا پروگرام یہ ہے۔

ساڑھے تین بجے سے چار بجے تک: سیکرٹری میونسپل کمیٹی سے ملاقات

چار سے ساڑھے پانچ بجے تک: قلعے میں مزید تصویروں کا انتخاب

ابھی مجھے چار پانچ دن اور قلعے میں جانا پڑے گا کیونکہ وہاں بہت سی چیزیں مثلاً پرانی دلی کا نقشہ، غدر کے متعلق کتابیں، غالب کی تصویر، نواب شمس الدین کی تصویر وغیرہ چیزیں ملی ہیں اور پرانی دلی کے اخبارات اور کتابوں کو وہاں بیٹھ کر پڑھنا ہے۔

ساڑھے پانچ بجے سے سات بجے تک: ہارڈنگ لائبریری میں پرانی کتابوں کی چھان بین

سوا سات بجے سے آٹھ ساڑھے آٹھ تک: جامع مسجد کے سامنے ایک کتب فروش سے ملاقات جو میرے دکھانے کے لیے پرانی قلمی کتابیں وہاں لائے گا

اس کے بعد کھانا کھا کے گھر (ہوٹل) آؤں گا اور اگر ممکن ہوسکا تو کچھ اور لکھنے پڑھنے کا کام کروں گا۔

۵

رائے سینا ہوٹل، کوئینز روڈ، دہلی

۲۲ جولائی ۱۹۳۸ء

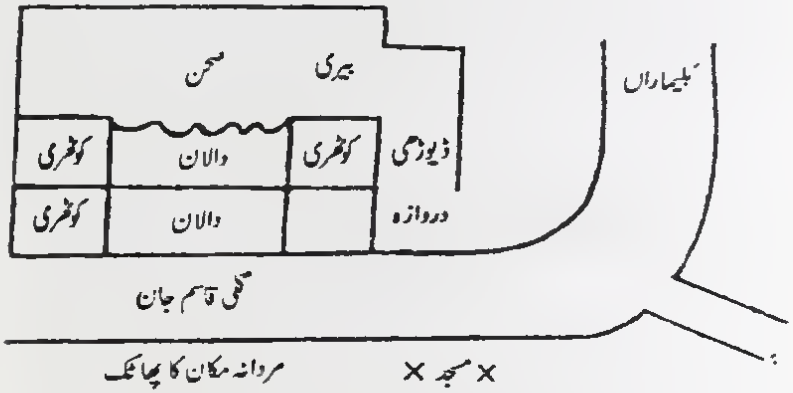
میں نے اپنا گزشتہ خط شاید پرسوں آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ پرسوں ہی سے میرا گلا کچھ خراب ہونے لگا تھا جو کل صبح اٹھنے پر زیادہ "جکڑ بند" معلوم ہوا۔ کل شام خیال ہوا کہ کسی ڈاکٹر سے گلے کی خرابی کی دوا لوں لیکن کام سے فراغت دیر سے ہوئی اور جب بازار گیا تو دیکھا کہ ڈاکٹروں کی سب دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اس پر میں نے "فروٹ سالٹ" کی چھوٹی شیشی خرید لی۔ کھانا شام کو نہ کھایا کیونکہ بھوک ہی نہیں تھی۔ اس کے بجائے "فروٹ سالٹ" پیا۔ آج صبح اٹھ کر پھر "فروٹ سالٹ" ہی پیا اور بعد میں چائے کی ایک پیالی پی۔ اس سے کچھ افاقہ ہوا۔ پھر قریب ہی ایک ڈاکٹر کے پاس جاکر گلے کے لیے دوا لی اور پاؤں پر مرہم پٹی کرائی۔ پاؤں کے چھپر پر جو خراش تھی وہ اب مندمل ہو رہی ہے۔ ہسپتال کا علاج چھوڑ دیا ہے کیونکہ ہسپتال ایک تو دور تھا دوسرے مفت کے علاج سے کچھ تشفی بھی نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں کہ یہ "فروٹ سالٹ" کا اثر ہے یا ڈاکٹر کی دوا کا کہ طبیعت بہت صاف ہوگئی ہے اور دوپہر کو بھوک بھی خوب لگی تھی۔ آج دوپہر کے بعد میں نے کام بھی کوئی نہیں کیا۔ ایک بجے سے پانچ بجے تک آرام ہی کیا ہے۔ ایک گھنٹے تک یعنی چھ بجے پھر پاؤں کی مرہم پٹی کرانے اس ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔

اب اپنی کارکردگی کی تھوڑی سی تفصیل آپ کو سناتا ہوں :

پرسوں شام "جامع مسجد" کی سیڑھیوں سے میں نے پانچ کتابیں دو روپے میں خریدی تھیں۔ ایک تو غالب کے فارسی کلیات کا پرانا ایڈیشن (مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۲) جو خوش قسمتی

سے مل گیا اور اس کے ساتھ چار اور کتابیں۔ میں نے اس کتب فروش سے کہا تھا کہ غالب کی کچھ اور پرانی کتابیں ہوں تو مجھے دکھائے۔ اب وہ پیر کی شام کو اور کتابیں میرے دکھانے کے لیے لائے گا۔

کل صبح سات بجے پہلے "بڑے دواخانے" گیا جو "لال کنوئیں" میں ہے۔ یہاں ایک صاحب سے ملنا تھا جو مجھے نواب سراج الدین احمد خان سائل کے پاس لے جاتے۔ معلوم ہوا کہ وہ دہلی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر بَلیماراں آکر حکیم عمر کامل خاں سے ملا۔ یہ عبدالواحد کے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ گلی قاسم جان میں وہ مکان دیکھا جس میں غالب اپنی زندگی کے آخری زمانے میں رہا۔ "ہندوستانی دواخانے" کی دوائیں جہاں بنتی ہیں اور جس جگہ سے اب گودام کا کام لیا جاتا ہے' وہ غالب کا زنانہ تھا اور اس کے صحن میں پہلے ایک بیری کا درخت ہوا کرتا تھا۔ مکان کی صورت تقریباً یہ تھی :



اس زنانہ مکان کے سامنے گلی کے دوسری طرف غالب کا دیوان خانہ تھا' جہاں وہ خود بیٹھتا تھا۔ اس دیوان خانے کا پھاٹک وغیرہ ایک تبدیل شدہ صورت میں اب بھی موجود ہے۔ اس دیوان خانے سے ملی ہوئی وہ مسجد ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ غالب نے یہ شعر لکھا :

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

یہ مسجد حکیم شریف خاں کی بنائی ہوئی ہے اور اس کی تاریخ تعمیر "خانہ خدا" کے اعداد سے نکلتی ہے۔ حکیم صاحب نے غالب کے متعلق کچھ روایات بھی سنائیں جو چنداں اہم نہ تھیں۔ اس کے بعد میں قلعے پہنچا اور اشفاق علی صاحب سے ملا۔ جن تصویروں کی کاپیاں مجھے لینی تھیں، ان کے نمبر وغیرہ نوٹ کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا تاکہ نقلیں حاصل کرنے کے لیے آگرے درخواست بھیجی جا سکے۔ ہاؤسن کے جولائی ۱۸۵۷ کے لکھے ہوئے ایک خط کی نقل کی جس میں اس نے ایک بہادر بوڑھی مسلمان خاتون کا ذکر کیا تھا جو فوج لے کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑتی رہی۔ ایک اور خط نقل کیا جو بے چارے مولوی رجب علی کی غداریوں اور انگریز پرستیوں کی داستان سناتا تھا۔

اتنے میں ساڑھے گیارہ بج گئے۔ میں قلعے سے نکل کر "ارون ہسپتال" گیا۔ پاؤں کی پٹی کرائی۔ پھر شیخ سردار علی کے گھر آیا۔ میری کوئی ڈاک نہیں آئی تھی۔ شیخ صاحب کے ساتھ کھانا کھا کر دو بجے کے قریب میں اپنے ہوٹل پہنچا۔ کچھ کام کیے، کچھ سویا، دو خط لکھے اور ساڑھے پانچ بجے "ہارڈنگ لائبریری" گیا۔ وہاں پونے نو بجے تک پرانی کتابیں دیکھتا رہا۔ ۱۸۴۹ کی چھپی ہوئی "پنج آہنگ" دیکھی۔ اس کی جلد کے کاغذ پر پانچ شعر لکھے ہوئے دیکھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غالب نے خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ ایک شعر ان میں سے یہ تھا:

آتی نہیں ہے نیند، طبیعت پہ کیا بنی؟
ہوتی نہیں ہے صبح، زمانے کو کیا ہوا؟

اسی چھان بین میں کہ یہ غالب کی اپنی تحریر ہے یا نہیں، مجھے وہاں رات کے پونے

نو بج گئے۔ (یہی وجہ ہے کہ کل رات کوئی ڈاکٹر بھی نہیں مل سکا تھا) لائبریری سے اٹھ کر میں سیدھا حفیظ (ہوشیارپوری) کے پاس اُس ہوٹل میں آیا جس کا پتا اوپر درج ہے۔ آج صبح میں بھی اس میں منتقل ہوگیا ہوں۔ میرے پہلے ہوٹل کا غسل خانہ وغیرہ بہت تنگ و تاریک تھا۔ یوں بھی فتح پوری کے چوک میں ہونے کی وجہ سے شور بہت تھا۔ اس پر کرایہ بھی ایک روپیہ یومیہ۔ رائے سینما ہوٹل کی عمارت بالکل نئی ہے اور ہر جگہ پتھر اور سیمنٹ کا فرش ہے۔ فتح پوری والے ہوٹل کی دری سے اس کا خالی سیمنٹ کا فرش بدرجہا زیادہ صاف ستھرا ہے۔ بجلی کا پنکھا یہاں نہیں، مگر اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔ کمرے میں البتہ صرف ایک دروازہ اور دو روشن دان ہیں مگر ایک تو کمرہ بہت صاف، بالکل نیا بنا ہوا اور ذرا بڑا ہے، دوسرے کمرے کے سامنے کھلا صحن ہے جس میں نکل کر آدمی ہر وقت بیٹھ سکتا ہے۔ پہلا ہوٹل گھُٹا گھُٹا اور بغیر صحن کے تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں کمرے کا کرایہ صرف آٹھ آنے یومیہ ہے۔ اس کے علاوہ کمرے کے ساتھ الگ غسل خانہ ہے اور فلش سسٹم۔ غسل خانے میں پانی ہر وقت چلتا ہے۔ اب آپ اسی ہوٹل کے پتے سے مجھے ۳۱ جولائی تک خط لکھ سکتی ہیں۔ اس سے پہلے مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کس وقت گندے ہوٹل سے نکل جاؤں۔ اسی لیے شیخ سردار علی صاحب کی معرفت خط منگواتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سردیوں میں اگر آپ دہلی آئیں تو اسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ کیونکہ یہاں کنبے والوں کے لیے بھی الگ انتظام ہے۔

آج صبح اٹھتے ہی پہلے تو میں نے سامان باندھا اور پھر آٹھ بجے اس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ نو بجے ڈاکٹر کے پاس گیا اور جیسا اوپر لکھ چکا ہوں دس بجے قلعے گیا جہاں سے بارہ بجے واپس ہوٹل پہنچا۔ آج میں نے اور کچھ نہیں کیا۔ اب چھ بجنے کو ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر اور شیخ سردار علی کے پاس جاؤں گا۔

چونکہ ابھی دلی کے بہت سے کام باقی ہیں' اس کے علاوہ ایک ایک دن کے لیے الور' لوہارو' فیروز پور جھرکا اور اسکندر آباد جانا ہے (جو سب دلی کے قریب ہیں) اس لیے یہ ظاہر ہے کہ ۲ اگست سے پہلے میں یہاں سے روانہ نہیں ہو سکوں گا۔ مندرجہ بالا مقامات پر جاتے ہوئے اپنا کمرہ خالی کر کے سامان حفیظ کے کمرے میں رکھ جاؤں گا جو میرے کمرے کے برابر میں ہے۔ ان سب باتوں سے فارغ ہو کر علی گڑھ جاؤں گا اور وہاں سے رام پور۔

میں دلی سے تنگ آگیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جلد یہاں سے نکلوں مگر یہاں کے کام کسی طرح ختم نہیں ہوتے۔ عجب نہیں کہ بعض چیزیں چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے بھاگ نکلوں لیکن آپ بہرحال اس ہوٹل کے پتے سے ۳۱ جولائی تک خط لکھ سکتی ہیں کیونکہ اگر میں الور وغیرہ کے سلسلے میں یہاں سے غیر حاضر بھی ہوا تو امید ہے کہ میرے خط حفیظ کے پاس محفوظ پڑے رہیں گے۔

۶

رائے سینما ہوٹل، کوئینز روڈ، دہلی

۲۴ جولائی ۱۹۳۸ء

پرسوں ایک خط لکھ چکا ہوں، امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ اس کے بعد شام کو ساڑھے سات بجے کے قریب شیخ سردار علی کے مکان سے آپ کے دو خط اکٹھے ملے، ایک ۱۹ جولائی کا اور دوسرا ۲۰ جولائی کا۔ ان خطوں کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی بالخصوص اس لیے کہ ان سے صرف اچھی باتیں معلوم ہوئیں یعنی آپ کی طبیعت کا نسبتاً صاف ہونا اور جامن کے درخت کے نیچے بیٹھنا۔ چونکہ اس دن یعنی پرسوں میری طبیعت ذرا زیادہ خراب تھی اور کچھ میں اس وجہ سے بھی گھبرایا ہوا تھا کہ دلی کے دیدار کا زمانہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا، پھر کرم آباد کا خط بھی دو تین دن سے نہیں آیا تھا، اس لیے جب دو خط اکٹھے ملے تو زیادہ خوشی ہوئی۔ . . .

اسی وقت فیصلہ کیا کہ ریڈیو پر بھائی حامد علی خاں کی تقریر سننے کی کوشش کروں گا تاکہ گھر والوں سے اور تعلق پیدا ہونے کا موقع ملے۔ . . . اسی طرح کل مہرولی کی ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے کھیلتے بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک لڑکی کی آواز تو ایسی تھی کہ اس کی اور زاہدہ کی آواز میں ذرّے کے برابر فرق نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں شکل صورت بھی زاہدہ سے کچھ ملتی تھی یا نہیں۔ آج ٹریم میں مسعود کی عمر کا ایک لڑکا اخبار بیچ رہا تھا۔ میں نے دلی آکر نہ کبھی اخبار خریدا ہے، نہ پڑھا ہے۔ چنانچہ لڑکے کے اصرار کے باوجود میں نے اخبار نہ لیا مگر مسعود کے ساتھ اس کی مشابہت کا خیال آیا تو میں نے فوراً مسعود کے نام پر اس سے اخبار خرید لیا اور بعد میں اسے پڑھا بھی۔

آج میری طبیعت صاف ہے۔ کل صبح کے بعد سے پاؤں کی پٹی ابھی تک نہیں کھولی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی آرام ہو رہا ہے۔ اب چھ بجنے کو ہیں۔ ساڑھے چھ یا سات بجے کے قریب میں اور حفیظ ہوشیار پوری بھائی حامد علی خاں کی تقریر سننے کی تلاش میں نکلیں گے تو جاتے ہوئے ڈاکٹر سے پاؤں کی مرہم پٹی بھی کراؤں گا۔ میری تھرماس کی پیالی ٹوٹ گئی ہے۔ اگر ہو سکا تو وہ بھی کہیں سے خریدوں گا۔ وقت ملا تو خواجہ محبوب علی صاحب سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے نام ممتاز صاحب کے والد نے خط دیا ہے۔ یہ مجھے نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے پاس لے جائیں گے۔

کل صبح شیو، غسل، تبدیلیٔ لباس وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے کچھ اور کام بھی کیے جن میں ڈاکٹر سے پاؤں کی مرہم پٹی کرانا بھی شامل تھا۔ گیارہ بجے مہرولی جانے کے ارادے سے بیگ اور واٹر پروف کوٹ لے کر ہوٹل سے نکلا۔ پہلے بلیماراں میں حکیم محمد کامل خاں سے یہ کہنے گیا کہ میں شاید اتوار کی صبح کو ان کے پاس آنے کا وعدہ پورا نہ کر سکوں گا۔ حکیم صاحب "جامع مسجد" تک میرے ساتھ آئے اور کہنے لگے دلی کی حلیم کھائے بغیر نہ جایئے۔ میں نے کہا کہ اتوار کی شام کو ریڈیو کی تقریر کی وجہ سے فرصت نہ ہوگی البتہ پیر کی شام کو آپ کے پاس حلیم کھانے آجاؤں گا۔ حکیم صاحب بہت خوش خلق ہیں اور بار بار کھانے کی دعوت پر بلانا چاہتے ہیں لیکن اتفاق سے میرے پروگرام میں وقت نہیں ہوتا۔

ان سے رخصت ہو کر میں شیخ سردار علی کے پاس گیا۔ ان کے ساتھ کھانا کھا کر اجمیری دروازے گئے۔ یہاں سے تانگے میں بیٹھ کر مہرولی روانہ ہوئے۔ شیخ صاحب آبِ زمزم کی دو بوتلوں پر خضر مرزا سے دم کرانا چاہتے تھے۔ بہت خوش عقیدہ ہیں اور بزرگوں کی قبروں کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجھے کبھی کبھی ان کے ساتھ کے وفدوں میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔

ڈھائی بجے کے قریب خضر مرزا کے پاس پہنچے۔ ان سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور معلوم ہوئیں۔ شام کو میں شیخ سردار علی کے ساتھ "شمسی تالاب" اور "اولیا مسجد" دیکھنے گیا۔ "شمسی تالاب" کے آس پاس "پھول والوں کی سیر" کا مشہور میلا برسات میں لگا کرتا تھا۔ (اس سے پہلے شیخ صاحب درگاہ خواجہ قطب الدین پر سلام کرنے گئے تھے اور میں دوسری قبریں بھی دیکھتا رہا۔) شام کو ہم واپس آئے تو نواب خضر مرزا صاحب کے ساتھ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کا موقع ملا۔

اس کے بعد شیخ سردار علی تو دہلی چلے آئے اور میں رات کو وہیں رہا۔ صبح سویرے اٹھ کر مسجد "قوۃ الاسلام" اور "قطب مینار۔"

یہ دونوں چیزیں واقعی اسلام کے سیاسی عروج کی شاندار یادگاریں ہیں اور ان میں ایک خاص ہیبت اور دبدبہ ہے۔ مسجدِ قوۃ الاسلام کو وہی لوگ تعمیر کرسکتے تھے جن کے ہاتھ میں تلوار اور بازو میں قوت تھی اور جن کے جوشِ ایمانی کے سامنے ہندوستان کی طاقت دھوئیں کی طرح اڑ گئی۔ اس نیم منہدم مسجد اور مینار کو دیکھ کر طبیعت پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب لوگ اس مسجد میں جوتیاں پہن کر چلتے پھرتے ہیں۔

اس کے بعد خضر مرزا کے ہاں واپس آکر چائے پی، کچھ اور باتیں پوچھیں۔ بیدل کی قبر کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ بعض لوگ ان کی قبر اس جگہ بتاتے ہیں جہاں بیرم خاں کے تراہے کے پاس آجکل صنعت و حرفت کا مدرسہ ہے۔ وہاں ایک بھڑبھونجے کی دکان ہے جس میں قبر بیان کی جاتی ہے۔ میں نے کہا کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ ان کی قبر دہلی دروازے کے باہر بنی تھی۔ کہنے لگے ہاں سنو تو، ایک اور بیان بھی بتاتا ہوں۔ ایک بزرگ شاہ وارث علی گزرے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے پرانے قلعے کے سامنے سے گزرتے ہوئے سڑک کے کنارے کی ایک اونچی قبر کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے یہ کہا تھا کہ یہ دیکھو! یہ بیدل شاعر

کی قبر ہے۔ انھیں "کشفِ قبور" کا علم تھا۔ مجھے خضر مرزا کی یہ بات زیادہ قرین صحت معلوم ہوئی کیونکہ پرانا قلعہ (یا فیروز شاہ کا کوٹلہ) دہلی دروازے سے تھوڑی ہی دور واقع ہے۔

اس عرصے میں دوسرے لوگ آنے لگے۔ خضر مرزا بھی میرے پیہم ابرام سے کچھ بیزار ہونے لگے تھے۔ اس لیے میں نو بجے کے قریب ان سے رخصت ہوا۔ پہلے پیدل قطب مینار تک گیا۔ قطب کے نیچے عاشق علی فوٹوگرافر سے اکبر ثانی کے دربار اور جلوس کی دو تصویریں خریدیں۔ مسجد قوۃ الاسلام کو ایک بار پھر جی بھر کر دیکھا اور باہر سڑک پر آکر تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ دس بجے تانگے کی سواریاں پوری ہوئیں۔ (تین آنے سواری) اور ہم دہلی روانہ ہوئے۔ رستے میں اتر کر صفدر جنگ کا مقبرہ دیکھا اور یہاں سے دہلی کی پرانی گاڑیوں کی دو تصویریں چھ آنے میں خریدیں۔ ساڑھے گیارہ بجے تانگے والے نے مجھے اجمیری دروازے کے قریب اتار دیا۔ میں پیدل دہلی دروازے کی طرف آیا اور یہاں سے پرانے قلعے کی طرف مڑا۔ قلعے کے سامنے ہی جیل ہے۔ غالباً اس جیل میں آج سے اکانوے برس پہلے غالب قید رہا تھا۔ جیل کے ایک سپاہی سے پوچھا کہ یہاں کوئی قبر بھی ہے۔ اس نے چند مستطیل جھاڑیوں کی طرف (جو قلعے کے دروازے سے ڈیڑھ سو قدم بجانبِ غرب ہوں گی) اشارہ کرکے کہا کہ وہ ایک قبر ہے۔ خضر صاحب نے بیدل کی قبر کے متعلق جو کچھ کہا تھا کہ قلعے کے پاس سڑک کے ساتھ اونچی سی جگہ ہے اور صاف نظر آجاتی ہے' وہ سب کیفیت جھاڑیوں میں چھپی ہوئی قبر پر صادق آتی تھی اور چونکہ دہلی دروازے سے تھوڑی ہی دور باہر ہے' اس لیے عجب نہیں کہ یہی بیدل کی قبر ہو۔ میں تھوڑی دیر یہاں درخت کے ہوا دار سائے میں بیٹھا رہا۔ پھر ایک تانگا جامع مسجد تک کے لیے چھ پیسے کرائے کو لیا۔ جامع مسجد کے پاس ایک ہوٹل میں (ساڑھے بارہ بجے کے قریب) کھانا کھایا۔ پھر ٹریم میں بیٹھا اور یہیں اس بارہ تیرہ برس کے اخبار فروش کا واقعہ پیش آیا جس کا اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ٹریم کو

ر دیے اور فتح پوری پہنچا۔ یہاں سے میرا ہوٹل قریب ہی ہے۔ کمرے میں آکر دو بجے سے چار بجے تک خوب سویا۔ اٹھ کر کچھ کام کیے اور یہ خط لکھا۔ ساڑھے چھ بجے ہیں۔ اب نہاؤں گا۔ پھر حفیظ کے ساتھ گھر جاؤں گا۔...

ممکن ہے میں پرسوں سکندر آباد جاؤں۔ کوشش کروں گا کہ دوسرے دن واپس دہلی پہنچ جاؤں۔

۷

رائے سینما ہوٹل، کوئینز روڈ، دہلی

۲۷ جولائی ۱۹۳۸ء

اُس دن (۲۴ جولائی کو) میں نے ایک ہوٹل کے فضول سے ریڈیو پر تقریر سننے کی کوشش کی۔ ریڈیو سٹ بہت بے ہودہ تھا۔ کبھی کبھی بھائی حامد علی خاں کی مدھم سی آواز آتی تھی۔ کبھی کبھی ان کے بعض فقرے اور پنجابی گیت سمجھ میں آجاتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ بات تھی کہ جب بھی کوئی فقرہ سنائی دیتا تھا، اُس وقت صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ بھائی حامد علی خاں بول رہے ہیں۔ تقریر کے مضمون کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کچھ سنا ہی نہیں گیا مگر طریقِ ادا بہت صاف اور اچھا تھا۔

پرسوں ۲۵ جولائی کو بڑے دواخانے جانے اور خواجہ حسن نظامی سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی ناکام کوشش کے بعد قلعے گیا۔ وہاں غدر سے پہلے کے کاغذات دیکھے۔ سردار علی صاحب سے ایک بجے مل کر پھر بڑے دواخانے خواجہ محبوب علی کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ نواب سراج الدین احمد خاں سائل مجھ سے ناآشنا ہیں۔ کسی اور سے چٹھی لے دوں گا۔ ساڑھے چار بجے شوراج بہادر کے پاس جاکر سکندر آباد کے لیے ایک خط لیا۔ پانچ سے سات بجے تک ہارڈنگ لائبریری کی کتابیں دیکھیں۔ پھر وہیں حکیم محمد کامل خاں کا ٹیلی فون آیا کہ جلد آؤ۔ جامع مسجد پہنچا اور وہاں آٹھ نو بجے مسجد کی سیڑھیوں پر دلی کی مختلف مضر چیزیں "حلیم شریف" "چڑیا کباب" دہی بڑے، قلفی وغیرہ کھائیں۔

تعجب ہے کہ دوسرے دن گلے پر ان چیزوں کا برا اثر نہ پڑا۔ کل صبح اٹھ کر پھر حکیم صاحب کے پاس گیا۔ وہ سائل کے پاس لے گئے۔ (سائل غالب کے دوست

نواب ضیاء الدین نیّر رخشاں کے پوتے ہیں)۔ وہاں بیخود دہلوی اور سیماب اکبر آبادی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد نئی دلی سیکرٹریٹ کی لائبریری میں بعض چیزیں دیکھنی تھیں۔ حکیم صاحب بھی ساتھ تھے۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے وہیں کھلایا۔ چار بجے کے قریب وہاں سے نکلے۔ لائبریری میں شاکر حسین صاحب بیرسٹر (ابنِ خضر مرزا ساکن مہرولی) کے بیٹے بھی ملے۔ یہ کسی قدر لفنگے ہیں۔ ہمیں زبردستی ایک پنجابی وکیل باوا ہردیال سنگھ کی کوٹھی پر لے گئے۔ وہاں چائے پی۔ میں دھوپ میں چل چل کر بہت تھک گیا تھا۔ ہوٹل آنے سے پہلے پاؤں کی مرہم پٹی کرائی۔ شام کو سات بجے ہوٹل پہنچا۔ اس وقت طبیعت اتنی خراب اور بیزار تھی کہ نہ کوئی کام کرنے کی ہمت تھی اور نہ خط لکھنے کی۔

آج صبح شیو اور مرہم پٹی کے بعد پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ بِگّا بیگم صاحبہ (معظّم زمانی بیگم) دخترِ نواب ضیاء الدین نیّر رخشاں کے پاس لے گئے۔ یہ عارف کی بہو ہیں۔ نوّے برس کی عمر ہے۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں۔ بار بار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں۔ مگر حکیم صاحب روک دیتے تھے۔ انہیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دور سے آئے ہیں تو ان کی کچھ تواضع ضرور ہونی چاہیے۔ پونے گیارہ بجے ان کے پاس سے آکر ہم جامعۂ ملّیہ گئے جہاں مجھے کتبَ خانہ دیکھنا تھا۔ مگر کتب خانہ اُس وقت بند تھا۔ ایک بجے واپس آئے۔ حکیم صاحب نے پھر زبردستی ایک ہوٹل میں پُرتکلف کھانا کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد دو بجے میرے ساتھ ہوٹل آئے۔ تین بجے کے قریب میں جامعہ روانہ ہوا تو یہ رخصت ہوئے۔ پانچ سوا پانچ بجے وہاں سے واپس آکر آپ کو یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں۔

اب چند روز سے یہاں غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ ہاں میں اوپر یہ بات لکھنی بھول گیا کہ کل نئی دہلی جانے سے پہلے خواجہ عبدالمجید کے گھر مٹیا محل گئے۔ یہ مسٹن کالج میں پروفیسر تھے۔ بوڑھے آدمی ہیں۔ ان سے پرانی دلی کے متعلق کچھ پوچھنا ہے۔ انہوں نے آج رات

ساڑھے نو بجے کا وقت دیا ہے۔ غالباً گیارہ بارہ بجے تک بیٹھیں گے۔ اب سات بجنے کو ہیں۔ یہ خط سٹیشن پر ڈاک میں ڈالوں گا۔ پھر شیخ سردار علی کے پاس جاؤں گا کیونکہ پرسوں کے بعد ان سے نہیں مل سکا۔ اگر ہو سکا تو اکرم صاحب سے بھی ملوں گا۔ کسی ہوٹل سے کھانا کھاتے کھاتے ساڑھے نو تو ضرور بج جائیں گے۔ وہیں سے خواجہ مجید کے مکان پر چلا جاؤں گا۔

کل خواجہ مجید کی ملاقات کے سلسلے میں مفتی صدرالدین آزردہ کا مکان بھی دیکھا تھا۔ مفتی صاحب غالب کے مشہور معاصرین اور احباب میں سے تھے۔

میرا ارادہ ہے کہ کل بِگّا بیگم صاحبہ کا پان تبرکاً" قبول کرلوں تاکہ یہ کہنے والا تو بنوں کہ میں نے عارف کی بہو کے ہاتھ کا پان کھایا ہے۔

۸

رائے سینما ہوٹل، کوئینز روڈ، دہلی

۲۹ جولائی ۱۹۳۸ء

میں پرسوں ایک خط لکھ چکا ہوں۔ کل آپ کا ۲۷ جولائی کا لکھا ہوا مفصل نوازش نامہ موصول ہوا۔ پرسوں شام سوا نو بجے سے سوا گیارہ بجے تک خواجہ عبدالمجید صاحب سے ملاقات رہی۔ یہ دلی کے پرانے لوگوں میں سے ہیں۔ ۶۵ یا ۶۸ برس کے قریب عمر ہے۔ کسی زمانے میں دلی کے مشن کالج میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے مفتی صدرالدین خان آزردہ کے حالات لکھوائے جو ان کے دادا کے بہنوئی اور غالب کے معاصر تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنی دو کتابیں مجھے ہدیۃً پیش کیں اور بتایا کہ "میرے پاس غالب کا قلمی دیوان تھا، جسے مولوی عبدالرحمان لے گئے اور پھر ان کے پاس ہی رہا۔"

کل صبح ڈاکٹر کے پاس سے ہوکر میں بگا بیگم صاحبہ کے مکان پر پہنچا۔ یہ مکان دراصل نواب احمد بخش خاں کا ہے، جو بگا بیگم کے دادا تھے اور غالب کے خسر الٰہی بخش خاں کے بڑے بھائی تھے۔ میں نے گزشتہ ملاقات کے موقع پر بگا بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ شادی کے بعد مرزا غالب آگرے سے دلی آئے تھے تو کہاں ٹھہرے تھے؟ اس کے جواب میں انھوں نے اسی موجودہ مکان کے متعلق بتایا کہ یہیں ٹھہرے ہوں گے۔ میرا اصل سوال یہ تھا کہ الٰہی بخش خاں کہاں رہتے تھے؟ اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا: "یہیں رہتے ہوں گے اور کہاں رہتے ہوں گے۔" غالب کی عمر شادی کے وقت صرف تیرہ برس کی تھی اور ان کی بیوی کی گیارہ برس کی۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ الٰہی بخش خاں نے ان کو اپنے ہی پاس رکھا ہوگا۔ چنانچہ میں نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اس مکان کے صدر دالان کی تصویر لے لوں گا۔ کل بگا بیگم کے نوکر نے سب سے پہلے یہی پوچھا کہ فوٹوگرافر کو لائے ہو؟ میں نے کہا کہ

اکتیس تاریخ کو خضر صاحب مہولی سے آرہے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ ان کو یہاں بٹھا کر تصویر لی جائے۔ نوکر نے یہ بات اندر جاکر کہی اور پھر مجھ سے آکر کہا کہ آج ان کی بیٹی (جندو بیگم؟) ملنے کے لیے آرہی ہیں' اس لیے آج آپ سے نہیں مل سکیں گی۔ جب خضر صاحب آئیں تو آپ بھی ان کے ہمراہ آئیں اور باتیں پوچھ لیں۔

غرض یہاں سے ناکام ہوکر جامع مسجد آیا۔ یہاں ایک پرانے بزرگ نواب فیض احمد خاں رہتے ہیں مگر انھوں نے بھی اپنی بیماری کے عذر پر ملنے سے انکار کر دیا۔ ناچار آغا طاہر کے مکان پر کوچہ چیلاں میں گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ لاہور گئے ہوئے ہیں اور ۳ اگست کو واپس آئیں گے۔ اس کے بعد آغا طاہر کے ماموں میر محمد حسین سے ملا۔ ان سے کچھ باتیں ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک سن رسیدہ بزرگ پنڈت امرناتھ ساحر گلی چوڑی والاں' بازار سیتا رام میں رہتے ہیں۔ ان سے دلّی کی پرانی باتیں پوچھیے۔ چنانچہ بارہ بجے ان سے جاکر ملا۔ پچھتر برس کی عمر ہے' بہت خلیق آدمی ہیں۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کے دوست ہیں۔ کیفی صاحب کے متعلق کہتے تھے "اس چوٹّے کو پکڑیے نہ! اس چوٹّے سے پوچھیے۔" انھوں نے اپنے فارسی اور اردو دیوان ہدیۂ عنایت فرمائے مگر اور کوئی چیز ان سے حاصل نہ ہوئی۔ ایک بجے یہاں سے اٹھا اور رستے میں (حوض قاضی سے) ایک جگہ سے سنگترے خریدتا اور ایک جگہ سے چائے پیتا ہوا اپنے ہوٹل پہنچا۔ فتح پوری سے حفیظ ہوشیارپوری کو ٹیلی فون کر دیا کہ ذرا جلد ہوٹل آجائیں کیونکہ انہیں اشفاق علی صاحب سے ملنے کے لیے ساتھ لے جانا تھا۔ (اشفاق علی صاحب کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ کسی دن حفیظ صاحب کو' ملنے کے لیے چائے پر' یہاں لائیے) چنانچہ کل کی شام میں نے ملاقاتوں کے لیے رکھی۔ اسی لیے حفیظ صاحب کو بھی جلد بلا لیا۔ چار بجے ہم دونوں شیخ سردار علی صاحب کے گھر پہنچے۔ پانچ بجے ان کے ساتھ اشفاق علی صاحب کے گھر گئے۔ اتفاق سے وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ یہاں سے چل کر اکرم صاحب کے گھر گئے۔ بدقسمتی سے وہ بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ اس پر مجھے خیال ہوا

کہ مولوی عبدالرحمان خاں صاحب سے مل آئیں چنانچہ ہم تینوں ادھر روانہ ہوئے۔ یہ سکنر ہاؤس' اندرون موری دروازہ میں رہتے ہیں۔ یہ بھی باہر گئے ہوئے تھے مگر ہم بیٹھ کر انتظار کرتے رہے۔ جب آئے تو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بہت خلیق بزرگ ہیں۔ افسوس ہے کہ قلمی دیوانِ غالب کے متعلق انھوں نے بھی یہی کہا کہ کوئی صاحب مجھ سے لے گئے ہیں مگر وعدہ کیا کہ میں اسے تلاش کروں گا اور جو غیر مطبوعہ غزلیں اس میں ہیں وہ نقل کرکے آپ کو بھیج دوں گا۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ جس کا پچھلا جلسہ لاہور میں ہوا تھا اس کے آئندہ اجلاس میں مقالہ پڑھنے کے لیے انھوں نے مجھ سے کہا۔ یہ اجلاس دسمبر کے دنوں میں دہلی میں ہوگا۔ چونکہ دسمبر میں آپ کو سیر کے لیے دہلی لانے کا ارادہ ہے ہی' اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی کتاب کا ایک باب ادارۂ معارف کے اجلاس میں پڑھنے کا وعدہ کرلوں۔

آج صبح میں قلعے گیا تھا۔ آج قلعے کا پروگرام ختم کر آیا ہوں۔ شام کو "ہارڈنگ لائبریری" جاؤں گا اور اسے بھی ختم کر آؤں گا۔ آج ایک فوٹوگرافر سے بھی بات کرلی ہے کہ ضروری چیزوں کی تصاویر مجھے بنا دے۔ کل صبح انشاء اللہ سکندر آباد جاؤں گا اور شام کو واپس آجاؤں گا۔ سکندر آباد یہاں سے تیس پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یعنی دہلی سے علی گڑھ جائیں تو رستے کے تقریباً درمیان میں اسی لائن پر سکندر آباد ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں ۳ اگست کی صبح کو علی گڑھ چلا جاؤں گا اور وہاں سے چار یا پانچ اگست کو رام پور۔ ان دنوں میں آپ مجھے خط نہیں لکھ سکیں گی لیکن رام پور سے لکھنؤ پہنچ کر میں آپ کو اپنے قیامِ لکھنؤ کا پتا لکھوں گا۔

آپ ۳۱ جولائی (حد یکم اگست) کے بعد میرے نام کوئی خط رائے سینا ہوٹل کے پتے سے ڈاک میں نہ ڈالیے۔

۹

دہلی

۳۱ جولائی ۱۹۳۸ء

امید ہے کہ میرا پرسوں کا خط مل گیا ہوگا' میں کل صبح سکندر آباد جاکر شام کو واپس آگیا تھا۔ وہاں سے کچھ نہیں ملا بلکہ جہاں تک سنا' یہی سنا کہ ڈاکٹر بھٹناگر کا ہرگوپال تفتہ سے کوئی خاص قریبی رشتہ نہیں ہے۔ "راکے" میں پہلی مرتبہ بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ رستے میں سارسوں کی جوڑیاں دیکھیں۔

آج دن کا بیشتر حصہ اقبال کی کتاب کا دیباچہ لکھنے میں صرف ہوا۔ کچھ لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ اسی ہفتے کے اندر ختم ہو جائے گا۔ اب ساڑھے چار بجے شیو کرکے باہر کام کو جارہا ہوں۔

کرم آباد سے آپ کے خط کے ساتھ متعدد دوسرے عزیزوں کے خطوط بھی مل گئے۔ مگر مجھے جواب لکھنے کی فرصت نہیں۔ کیونکہ کل اور پرسوں میں بہت سے کام ختم کرنے ہیں۔ ہاں آپ کی ایک بات کا جواب لکھنا ہے کہ روپے کی کوئی خاص قلت نہیں۔ اب تو جولائی کی تنخواہ بھی دو تین دن تک ادا ہو جائے گی۔

جو چوٹ کرم آباد میں پاؤں پر آئی تھی' اس کا زخم اب تقریباً مندمل ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے کہ رہی سہی کسر بغیر دوا کے پوری ہو جائے گی۔

۳ اگست کو علی گڑھ جاکر ۵ اگست کو رام پور جاؤں گا اور وہاں ایک یا دو دن ٹھہر کر لکھنؤ روانہ ہوں گا۔

۱۰

رائے سینا ہوٹل، دہلی

۲ اگست ۱۹۳۸ء، ۴ بجے سہ پہر

میں کل صبح آٹھ یا نو بجے کی گاڑی سے علی گڑھ روانہ ہوں گا اور دس یا گیارہ بجے انشاء اللہ علی گڑھ پہنچ جاؤں گا۔ وہاں میں صرف دو دن قیام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے علی گڑھ میرے نام خط نہیں آسکتا۔ یہی حال رام پور کا ہوگا۔ کیونکہ وہاں بھی ایک دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا۔ اس کے بعد لکھنؤ پہنچوں گا تو خط کے متعلق شاید کوئی اطلاع دے سکوں۔

مفصل خط لکھنے کی فرصت نہیں ہے، اس لیے ان چند سطور پر اکتفا کیا ہے۔

۱۱

علی گڑھ

۴ اگست ۱۹۳۸ء

کل صبح نو بجے دہلی سے روانہ ہوکر میں یہاں ساڑھے گیارہ بجے پہنچا۔ یہاں شیخ فضل حسین صاحب لکچرار فزکس کے ساتھ قیام کیا ہے۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ کل تین بجے سہ پہر ہم دونوں سیر کو نکلے۔ فضل حسین صاحب نے یونیورسٹی کی عمارتیں دکھائیں۔ یونیورسٹی کیا ہے' ایک اچھا خاصا شہر ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں (منٹو سرکل کے پیچھے) یہ یونیورسٹی کی انتہائی حد ہے۔ یہاں جمال پور نام کا ایک گاؤں بالکل سامنے ہے اور اس کے کھیت گھر کے دروازے کے پاس ہیں۔ مرہٹوں کے زمانے کا ایک پرانا قلعہ یہاں سے نظر آتا ہے۔ کچی بارک میں نے خاص جستجو سے پوچھی جہاں بھائی صاحب رہا کرتے تھے۔ یہ اب پختہ ہو چکی ہے لیکن چونکہ موقع وہی ہے اس لیے اس میں بھی ایک خاص دلچسپی ہے۔ (یہ بات میں نے آج بھائی صاحب کو بذریعہ کارڈ لکھی ہے' اس لیے آپ لکھنے کی زحمت نہ کیجئے)۔ افسوس کہ بھائی صاحب کے کمرے کا نمبر مجھے یاد نہیں ہے ورنہ اس نمبر کے موجودہ کمرے کو دیکھتا۔ کچھ دھندلا سا نمبر یاد آیا تھا مگر اس نمبر کا کوئی کمرہ مجھے اب وہاں نظر نہیں آیا۔ سرسید کے زمانے کا حصّہ دیکھا جہاں برادرِ معظّم مولانا ظفر علی خاں اور بھائی اکبر خاں مرحوم پڑھ چکے ہیں۔ مسجد بھی اُسی زمانے کی ہے اور بہت شاندار ہے۔ اس کے پہلو میں سرسید اور نواب محسن الملک وغیرہ کی قبریں ہیں۔ "سٹریچی ہال" اور سٹوڈنٹس یونین ہال (جس کے مولانا ظفر علی خاں صاحب سیکرٹری تھے) ان کو بھی میں نے بہت دلچسپی سے دیکھا۔

عثمانیہ ہوسٹل میں صدیق انصاری صاحب (باٹنی) شمس الاسلام صاحب (وارڈن)' عمرالدین صاحب (فلسفہ) اور جمیل صاحب (انگریزی) جو یونیورسٹی کے سٹاف کے ممبر ہیں' ان

سب سے ملاقات ہوئی۔ پھر مولوی ضیاء احمد صاحب لیکچرار فارسی سے جاکر ملے۔ آج صبح بشیرالدین صاحب لائبریرین سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے (جن کا نام میں بھولتا ہوں) غالب کے متعلق سب کتابیں مجھے دکھانے کے لیے کہا۔ یہ اسسٹنٹ بہت شریف آدمی ہیں اور بڑی کاوش سے کتابیں تلاش کرکے مجھے دیتے ہیں۔ میں صبح سے لے کر ڈیڑھ بجے تک لائبریری میں رہا لیکن آج دراصل تین گھنٹے کے قریب وقت ضائع ہی ہوا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بے چارے مولوی ضیا احمد صاحب ازراہِ اخلاق (اور حسبِ قرارداد) لائبریری میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ ایک دوسرے کمرے میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے تاکہ بہادر شاہ کے متعلق امیر احمد علوی کی کتاب مجھے دکھائیں۔ برآمدے میں دو تین حضرات کھڑے تھے۔ ان میں ایک مولانا احسن مارہروی تھے جو حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ بھائی حامد علی خاں نے ان کے نام مجھے ایک خط بھی دیا تھا۔ ایک اور صاحب آلِ احمد سرور لیکچرار اردو بھی وہاں موجود تھے۔ ان سے تعارف ہوا تو میرا نام سن کر کہنے لگے: "اچھا غالب اور بیدل والے" پھر مجھے ساتھ کی چق اٹھا کر رشید احمد صدیقی کے پاس لے گئے اور کہنے لگے کہ لیجیے صاحب آپ "غالب اور بیدل" کے متعلق ذکر کررہے تھے، مصنف خود یہاں موجود ہیں۔ مجھے قدرتی خودپسندی کی وجہ سے یہ آرزو تھی کہ کہیں کوئی ایسا شخص بھی ملے جس نے کوئی میرا مضمون بھی کہیں پڑھا ہو لیکن دہلی میں ہمیشہ مایوسی ہی ہوتی رہی، غالباً اس لیے کہ وہاں میں صرف بوڑھے آدمیوں سے ملتا تھا۔ اب قدرتی طور پر مجھے کچھ خوشی تو ہوئی لیکن ان دونوں حضرات نے بہ اصرار میرا بہت سا وقت لیا۔ شاید دو گھنٹے میں ان کے پاس بیٹھا رہا۔ آل احمد سرور "اقبال کے ہاں ایک شام" کا ذکر بھی کرتے تھے۔ دونوں نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں یونیورسٹی میں غالب کے متعلق کوئی تقریر کروں۔ تقریر کا کام مجھے "طبعاً" غیر مرغوب ہے لیکن اگر انھوں نے اصرار کیا تو غالب کے متعلق اپنا انگریزی مضمون پڑھ کر سنا دوں گا۔

دو بجے گھر آکر کھانا کھایا اور کچھ آرام کرنے کے بعد پہلے تو کل کا حساب لکھا' پھر بھائی صاحب کے نام ایک کارڈ اور اب آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ چھ بجے نہا کر فضل حسین صاحب کے ساتھ باہر گھومنے جاؤں گا۔ یہاں میرا پتا تو یہی ہے : معرفت شیخ فضل حسین صاحب ایم ایس سی' فزکس ڈیپارٹمنٹ' مسلم یونیورسٹی مگر آپ یہاں خط نہ لکھیے۔ کیونکہ غالباً ۷ یا ۸ اگست کو میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ ارادہ تو یہاں سے جلد روانہ ہونے کا تھا یعنی ۵ اگست کو مگر چونکہ یہاں کی لائبریری سے کچھ ملنے کی امید ہے اس لیے میں نے خیال کیا ہے کہ یہاں دو دن اور ٹھہر جاؤں۔ کوشش یہ ہے کہ رام پور میں کم سے کم مدت ٹھہروں اور زیادہ سے زیادہ ۱۰ اگست تک لکھنؤ پہنچ جاؤں۔ اس تاریخ کے قریب اگر آپ چاہیں تو معرفت پوسٹ ماسٹر لکھنؤ خط لکھ سکتی ہیں۔

کل صبح آٹھ بجے مولانا احسن مارہروی سے ملنا ہے۔ اس کے بعد لائبریری جاؤں گا۔ گیارہ بجے وہاں سے نکلنا پڑے گا۔ لیکن اس کے بعد انشاء اللہ یہ موقع مل جائے گا کہ اقبال کی کتاب کے لیے اپنا دیباچہ مکمل کرلوں جو نصف سے زیادہ لکھا جا چکا ہے اور اب فوراً قومی کتب خانے کو پہنچنا چاہیے۔

دہلی کے آخری چار دنوں کی روئیداد میں نے آپ کو نہیں لکھی تھی۔ وہ اب زبانی ہی بتاؤں گا۔ اس میں سکندر آباد کے سفر کی تفصیلات' خضر مرزا کی تصویر کھچوانا ' غالب کے آخری مکان کے صحن اور پھاٹک کی تصویر کھچوانا' دہلی کے داروغۂ جیل اور خواجہ حسن نظامی سے ملنا' آغا شاعر سے ملاقات' قلمی دیوانِ غالب کی تلاش میں آوارہ پھرنا' غالب کی تحریر کا عکس وغیرہ شامل ہیں۔ حسن نظامی کو یہ کسی طرح باور نہیں آتا تھا کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ پھر میں نے انھیں تذکرۃ" یہ جتا دینا بھی مناسب سمجھا کہ میں آپ کے مشہور "دشمن" مولانا ظفر علی خاں کا بھائی ہوں۔

۱۲

چھترہ نزد بھیکم پور، علی گڑھ
۷ اگست ۱۹۳۸ء، ۶ بجے شام

میں نے شاید ۳ یا ۴ اگست کو علی گڑھ پہنچ کر ایک خط آپ کو لکھا تھا۔ اس کے بعد شبانہ روز مصروفیت کی وجہ سے خط لکھنے کا موقع نہ ملا۔ یہ خط بھی علی گڑھ سے ۲۴ میل دور ایک قصبے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ آج صبح میں پانچ بجے اٹھ کر شیو وغیرہ کرکے سات بجے مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے پاس پہنچا تھا۔ یہ بھیکم پور کے رئیس ہیں اور ان کا کتب خانہ بہت بڑا ہے۔ ان سے خط لے کر آج صبح میں ان کے مکان حبیب گنج پر پہنچا۔ لاری چھرّے تک آتی ہے۔ اس کے بعد تین میل کا سفر اِکّے پر ہے۔ واپسی پر ساڑھے پانچ بجے حبیب گنج سے روانہ ہوکر چھ بجے یہاں پہنچا۔ لاری ساڑھے چھ بجے علی گڑھ روانہ ہوگی اور انشاء اللہ ساڑھے سات بجے پہنچ جائے گی۔ میں لاری میں بیٹھا ہوں، پسینہ پونچھتا ہوں اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ علی گڑھ پہنچ کر دو ایک آدمیوں سے تھوڑی دیر کے لیے ملنا ہے۔ آج ہی رات ایک بجے کی گاڑی سے روانہ ہوکر صبح ساڑھے پانچ بجے بریلی پہنچوں گا۔ وہاں ایک شخص (قاضی محمد خلیل رئیسِ اعظم بریلی و دیوانِ ریاست چرکھاری) سے غالب کے غیر مطبوعہ خطوط ملنے کی امید دلائی گئی ہے۔ اگرچہ امید ہے کہ یہ باطل ثابت ہوگی۔ پھر بھی میں نے یہ مناسب سمجھا کہ دو تین گھنٹے کے لیے بریلی ٹھہر جاؤں۔ ممکن ہے کوئی چیز مل جائے۔ بریلی سے رام پور دو گھنٹے کا رستہ ہے۔ انشاء اللہ کل ہی رام پور پہنچ جاؤں گا۔ خدا کرے کہ رام پور سے جلد خلاصی ہو جائے کیونکہ میں اب اس دورے کو جلد ختم کرکے حیدر آباد پہنچنا چاہتا ہوں۔

حبیب گنج میں کوئی خاص چیز نہیں ملی۔ علی گڑھ میں غالب کے پیدا ہونے کا وقت اور چند غیر مطبوعہ اشعار ملے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ معلوم ہوا ہے کہ وکٹوریا کا مشہور فارسی قصیدہ دراصل بہادر شاہ کے لیے لکھا گیا تھا۔

یہاں جموں والے اسحاق صاحب سے بھی ملاقات ہوئی ہے جو پہل گام میں میرے ساتھ رہتے تھے۔ اب وہ یہاں ایم اے میں پڑھتے ہیں۔ کل انھوں نے میری دعوت کی اور مجھے رائے دی کہ ہو سکے تو میں اپنی صحت پر بھی کچھ توجہ کروں۔ ایک اس وجہ سے بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ دورہ ختم ہو کیونکہ جب تک مصروفیات کی یہ کیفیت رہے گی صحت ٹھیک نہیں ہو سکتی۔

میں شاید ۱۱ اگست کو لکھنؤ پہنچوں۔ دو دن وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ جو خط ۱۰ یا ۱۱ اگست کو معرفت پوسٹ ماسٹر' لکھنؤ مجھے لکھا جائے گا' وہ غالباً مجھے وصول ہو جائے گا۔ پسینہ بہت آرہا ہے اس لیے ختم کرتا ہوں۔

بریلی' ۸ اگست' ساڑھے چھ بجے صبح

میں یہ خط رات کو علی گڑھ ڈاک میں نہیں ڈال سکا تھا۔ لاری رستے میں ٹھہرتی ہوئی آئی اس لیے ساڑھے سات بجے کے بجائے ساڑھے آٹھ بجے علی گڑھ' اور نو بجے کے قریب اپنی جائے قیام پر پہنچا۔ جن دو آدمیوں سے ملنا تھا ان سے ملنے کا ارادہ فسخ کیا اور کھانا کھا کر اور سامان باندھ کر ساڑھے دس بجے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ یہاں بارہ بجے تک اپنے بستر اور ٹرنک کو ایک سیدھ میں رکھ کر سوتا رہا۔ اس کے بعد بارہ بجے اٹھ کر بریلی کا ٹکٹ خریدا۔ ایک بجے گاڑی آگئی اور میں بریلی روانہ ہوا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے گاڑی بریلی پہنچ گئی۔ گاڑی میں چار گھنٹے کے قریب سونے کا موقع مل گیا اور غنیمت ہے کہ کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔

سٹیشن سے اتر کر میں ایک سرائے میں آیا ہوں جو قریب ہی ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس کے بعد باہر جاکر چائے پیوں گا اور پھر قاضی محمد خلیل سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ گیارہ بجے کی گاڑی سے رام پور روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔

بریلی پہنچنے سے ذرا پہلے ایک بڑا دریا آیا تھا۔ ہندوؤں نے ہاتھ جوڑ کر اسے "جے مہاراج" کہا اور نام "رام گنگا" بتایا۔ ممکن ہے کہ یہ گنگا ہی ہو۔ بہرحال اس کی عظمت واقعی ایسی تھی کہ میں نے بھی معنوی طور پر اسے نمسکار کیا اور "جے مہاراج" کہا۔

اگر میں چاہوں تو سرائے میں خوب آرام کرکے رام پور جاؤں لیکن میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے رام پور سے فارغ ہوکر لکھنؤ پہنچ جاؤں۔ آج سہ پہر رام پور پہنچ جانے سے بھی وقت کی کچھ نہ کچھ بچت ہو جائے گی۔

بریلی سٹیشن، ۱۱ بجے

جن صاحب سے میں ملنے گیا تھا وہ لکھنؤ گئے ہوئے ہیں۔ اب وہاں ان سے مل لوں گا۔ معلوم ہوا ہے کہ غالب کے خطوط ان کے پاس واقعی ہیں۔ اگرچہ (حسبِ معمول) مہیش پرشاد مجھ سے پہلے ان کی نقول لے جا چکے ہیں، تاہم ان خطوں کا دیکھنا میرے لیے مفید ہوگا، اس لیے لکھنؤ میں قاضی محمد خلیل صاحب سے مل کر کہوں گا کہ جتنے خطوط ان کے پاس ہیں ان کی نقلیں براہِ کرم مجھے بھجوا دیں۔

میں ساڑھے ۸ بجے سرائے سے نکل کر شہر جا سکا تھا۔ پہلے لوگوں نے غلط پتا بتا کر مجھے خان بہادر شیخ خلیل الدین احمد کے ہاں بھیج دیا۔ وہاں سے صحیح پتا دریافت کرکے میں قاضی محمد خلیل کے مکان پر پہنچا۔ اب رام پور جانے والی گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ پندرہ منٹ میں یہ روانہ ہو جائے گی۔ انشاء اللہ ایک بجے رام پور پہنچوں گا۔ خدا کرے کل رات وہاں سے لکھنؤ روانہ ہو سکوں۔ اب یہ خط ڈاک میں ڈال رہا ہوں۔

۱۳

رام پور
۱۰ اگست ۱۹۳۸ء، ۷ بجے شام

پرسوں میں نے بریلی کے سٹیشن پر ایک خط ڈاک میں ڈالا تھا جو آپ کو مل گیا ہوگا۔ ڈیڑھ بجے میں رام پور پہنچا۔ ٹانگا لے کر سیدھا رام پور سٹیٹ ہوٹل گیا۔ کمرے کا کرایہ ۷؍ یومیہ تھا جو بہت زیادہ معلوم ہوا۔ سامان رکھتے ہی میں اسی ٹانگے پر محلہ کھنڈ سار آیا اور شاد عارفی سے ملا۔ یہ بہت اچھے اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ انہوں نے بڑے اصرار سے مجھے اپنے مکان پر ٹھہرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ اس وقت ان سے بات کرکے میں ہوٹل واپس آگیا۔ چند منٹ سویا، پھر اٹھ کر نہایا اور کپڑے بدلے۔ اتنے میں پانچ بجے کے قریب شاد عارفی صاحب حسبِ قرارداد میرا سامان لینے آگئے۔ ہوٹل والوں کو بِگ واکر کے میں شاد صاحب کے مکان پر آگیا۔ شام ہورہی تھی اس لیے کوئی کام نہ ہوسکا۔

کل صبح جاکر امتیاز علی عرشی سے ملا۔ اس کے بعد ایک صاحب قاضی علی الدین سے ملا جن کے متعلق مجھے یہ غلط اطلاع ملی تھی کہ غالب کی کچھ چیزیں ان سے ملیں گی۔ پھر مولوی فضل حق پرنسپل مدرسۂ عالیہ سے ملا تاکہ غالب کے ایک دوست (مولوی فضل حق خیرآبادی) کے حالات پوچھوں مگر انھیں کچھ معلوم نہ تھا۔ پچھلے پہر عبدالجلیل خاں ہوم منسٹر سے ملا۔ اخلاق سے پیش آئے۔ کتب خانہ دیکھنے کے لیے اجازت نامہ لکھ دیا۔ یہ دن اِسی طرح صرف ہوگیا۔ آج صبح عرشی صاحب نے پہلے تو وہ مکان دکھایا جس میں غالب نے یہاں (سفرِ رام پور میں) قیام کیا تھا۔ پھر چار بجے تک رام پور کی لائبریری میں کام کیا (ہاں کل بھی پانچ سے سات بجے تک "صولت پبلک لائبریری" رام پور میں کام کیا تھا)۔ اب یہاں سے فارغ ہوگیا ہوں اور رات کو بارہ بجے کی گاڑی سے لکھنؤ جارہا ہوں۔ صبح پانچ چھ بجے وہاں پہنچے گی . . .
بریلی کے سفر میں رات بھر جاگنے کی وجہ سے طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔

شاد عارفی صاحب کے مکان میں آرام بہت ملا ہے۔ بھائی حامد علی خاں انھیں خط لکھیں تو اپنی طرف سے اس بات کا شکریہ ادا کر دیں۔ یہ خط ان کے گھر کی لالٹین کی روشنی میں لکھ رہا ہوں۔ گاڑی اگرچہ پونے بارہ بجے جاتی ہے لیکن میں کھانا کھا کر جلد رخصت ہو جاؤں گا تاکہ انہیں خواہ مخواہ تکلیف نہ ہو۔

لاہور کے ڈاکٹر اقبال بھی یہاں کی لائبریری میں ایک کتاب دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ کل شام جب میں عرشی صاحب کی تلاش میں جگہ جگہ پھر رہا تھا تو اچھن صاحب کے گھر ان سے ملاقات ہوئی۔ آج لائبریری میں ساتھ ہی بیٹھے رہے۔

غالب کے مکان کی تصویروں کے لیے تین روپے شاد عارفی صاحب کو دیے جا رہا ہوں۔ یہ بذریعہ رجسٹری بھائی حامد علی خاں کے نام کرم آباد یا لاہور بھیج دیں گے۔ ان تصویروں کو سنبھال کر رکھ لیجیے۔ اگر علی گڑھ سے اسحاق کی بھیجی ہوئی غالب کی تصویر آئے تو اس کی رجسٹری وصول نہ کیجیے بلکہ پتا بدل کر بھائی صاحب کی معرفت حیدر آباد بھیج دیجیے کیونکہ اس تصویر کی مجھے ضرورت ہوگی۔ اگر رجسٹری اس خط کے پہنچنے سے پہلے وصول ہو چکی ہو تو پھر (بشرطِ امکان) احتیاط سے نئی رجسٹری کرکے حیدر آباد بھیج دیجیے تاکہ وہاں پہنچنے پر مجھے مل جائے۔

شاد عارفی صاحب کے مکان پر سب سے مفید کام یہ ہوا کہ اقبال والی کتاب کا دیباچہ ختم ہوگیا ہے اور آج میں نے اسے صاف بھی کرلیا ہے۔ کل لکھنؤ سے بذریعہ رجسٹری قومی کتب خانے کو بھیج دوں گا۔ دو تین دن تک مالک رام کی "ذکر غالب" پر ایک مختصر سی تنقید بھی بھیجوں گا۔ بھائی حامد علی خاں سے کہئے کہ اسے ستمبر کے "ہمایوں" کے تبصروں میں ضرور شائع کردیں۔

سب دوستوں کو سلام پہنچے۔ امید ہے کہ صبح لکھنؤ پہنچ کر کچھ خطوط ملیں گے۔ کوشش یہ ہے کہ دو دن سے زیادہ لکھنؤ نہ ٹھہروں۔ حفیظ اللہ سے کہہ دیجیے کہ اس کی فرمائش کی ٹوپی میں نے یہاں سے خرید لی ہے کیونکہ یہیں اچھی ملتی ہے۔

۱۴

پرنس ہوٹل، امین آباد پارک، لکھنؤ

۱۳ اگست ۱۹۳۸ء

۱۰ اگست کو رام پور سے روانہ ہوتے ہوئے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ رام پور کے سٹیشن پر انٹر کلاس کا ویٹنگ روم ہے۔ وہاں جاکر سو گیا۔ بارہ بجے جب اٹھا تو بارش ہو رہی تھی۔ ایک بجے کے بعد لکھنؤ کی گاڑی آئی۔ انٹر کے جس ڈبے میں سوار ہوا، اس میں میرے علاوہ صرف ایک اور شخص تھا۔ باقی رات بھی خوب سوتا رہا۔ صبح ۶ بجے کے قریب گاڑی لکھنؤ پہنچی تو بارش موسلادھار ہو رہی تھی۔ یہ بارش کل اور پرسوں دن بھر ہوتی رہی۔ کل شام سے بند ہے۔ ایک تو بارش مسلسل، دوسرے یہاں کسی سے تعارف بھی نہ تھا، اس لیے میں حیران تھا کہ لکھنؤ میں کام کس طرح ہو سکے گا:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

اپنی برساتی پہن کر پہلے تو ڈاک خانے گیا۔ آپ کا ۹ اگست کا لکھا ہوا نوازش نامہ ملا۔ پھر یونیورسٹی گیا تاکہ سید مسعود حسن صاحب لکچرار فارسی سے ملوں۔ رستے میں قیصر باغ آیا جس کا ذکر "فسانۂ آزاد" میں ہے۔ گومتی کا برساتی زور و شور بھی دیکھا۔ مگر یونیورسٹی میں تعطیل تھی۔ ناچار گھر آیا اور کمرے میں بیٹھ کر بہت سے کاروباری خطوط لکھے۔

کل مسعود حسن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ شریف آدمی ہیں، شیعہ ہیں۔ یہ مجھے اپنی موٹر کار میں مرزا محمد عسکری کے پاس لے گئے۔ ان سے غالب کی بہن کی اولاد کے حالات معلوم ہوئے۔ شام کو مسعود حسن صاحب کے مکان پر گیا۔ غالب کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

اور ایک غیر مطبوعہ فارسی خط کی نقل کی۔ ان کے پاس، بقول ان کے، پچاس کے قریب اور غیر مطبوعہ خط ہیں جن کی نقلیں بھیجنے کا انہوں نے وعدہ کیا ہے۔

آج لکھنؤ کی پبلک لائبریری اور عجائب گھر نہایت جلدی میں دیکھا۔ نول کشور کی ایک دکان پر ایک کتاب کے لیے گیا۔ وہ دستیاب نہ ہوئی۔ خان بہادر سید ابو محمد ممبر "پبلک سروس کمیشن" سے ملنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ الہ آباد میں ملیں گے۔ ان کے پاس ۱۸۴۲ کا چھپا ہوا دیوانِ غالب ہے۔ اب الہ آباد بھی چند گھنٹے ٹھہرنا پڑے گا حالانکہ پہلے براہ راست بنارس جانے کا ارادہ تھا۔

آج ڈاک خانے گیا تو آپ کا دوسرا خط بھی، جو ۱۱ اگست کا لکھا ہوا ہے، مل گیا۔ اب میرے حیدر آباد پہنچنے سے پہلے آپ مجھے کوئی خط نہیں لکھ سکیں گی...

کل بہت دنوں کے بعد میں نے اخبار خریدا تو بچارے میاں شاہ نواز کے انتقال کی خبر پڑھی۔ اس سے چند گھنٹے پہلے میں میاں بشیر احمد کو خط لکھ چکا تھا...

اب پانچ بجے ہیں۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت سے ملنے جاؤں گا اور ان کے ذریعے سے غالب کے دو لکھنوی دوستوں کی اولاد سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد سٹیشن جاکر الہ آباد اور بنارس کے لیے ٹرین کا وقت دریافت کروں گا۔ اس وقت کا ٹائم ٹیبل بظاہر یہ ہے۔

۱۵ اگست : الہ آباد

۱۶، ۱۷ اگست : بنارس

۱۸، ۱۹ اگست : بانکی پور

۲۰ اگست کو کلکتے پہنچوں گا۔ وہاں شاید چار پانچ دن رہنا پڑے۔ اس لحاظ سے ۲۷ اگست کے قریب حیدر آباد پہنچ سکوں گا۔

کل صبح یا شام کو یہاں سے الہ آباد روانہ ہو جاؤں گا...

۱۵

الہ آباد

۱۵ اگست ۱۹۳۸ء

نفس بہ لرزہ ز یادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الٰہ آباد

میں کل رات سوا نو بجے کے قریب الہ آباد پہنچ گیا تھا اور اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں شب باش ہوا۔ لکھنؤ سے ساڑھے تین بجے کے قریب گاڑی روانہ ہوئی اور چھ بجے کے قریب کانپور سے دوسری گاڑی ملی۔ کانپور میں پہلی مرتبہ ایک قلی نے میرا پورا سامان اکیلے اٹھایا ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ دو قلی لگتے تھے۔ الہ آباد میں بھی ایک دیوث نے کل شام یہی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری ٹفن باسکٹ اس سے گر گئی اور تیل کی شیشی ٹوٹ کر تمام تیل بہہ گیا۔ دیوث میں نے اس کو اس لیے کہا کہ وہ اس پر ذرہ بھر شرمندہ نہ ہوا بلکہ اس حادثے کو "میرا" قصور بتاتا رہا۔ اس کے بعد بڑے جھگڑے سے اس نے چار آنے قبول کیے اور باقی فاصلہ میں نے دوسرے قلی کو چار آنے دے کر طے کیا۔ غالب کا جو شعر اوپر درج ہے اس کے مصرعِ ثانی کی تشریح یہی ہے۔ اب دیکھیے کلکتے میں کیا پیش آتا ہے۔

میں کل کا دن لکھنؤ میں خاصا مصروف رہا۔ پہلے اٹھ کر سامان باندھا، پھر غسل سے فارغ ہوتے ہی اپنا سامان تو ہوٹل والوں کے ایک کباڑخانے میں رکھا تاکہ تین بجے تک سامان پڑا رہنے سے ایک روپیہ اور نہ دینا پڑے اور پھر ہوٹل کا بل ادا کرکے ۹ بجے کے قریب اپنے کاموں پر نکلا۔ سب سے پہلے تو گزشتہ شب (یعنی ۱۳ اگست) کا لکھا ہوا آپ کے

نام کا خط ڈاک میں ڈالا جو امید ہے کہ آپ کو مل گیا ہوگا۔ پھر تانگہ لے کر "فرنگی محل" کے پُل کے قریب "الناظر" کے دفتر گیا۔ جہاں تک پہنچنے کی ناکام کوشش میں اس سے پہلی شام کو بھی ایک گھنٹہ ضائع کر چکا تھا۔ "الناظر" کے دسمبر ۱۹۳۴ کے پرچے میں غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ہیں جو میرے لیے اشد ضروری ہیں۔ اسحاق علی (ایڈیٹر) گھر پر نہیں تھے اس لیے رکاب گنج کے پاس "احاطہ خان ماں متصل تکیہ شیر علی شاہ" گیا۔ یہ پچھلی صدی میں غالب کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کا پتا تھا۔ اس سے پہلی شام کو بھی یہاں آنے کی کوشش میں (قریب ہی) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے مل چکا تھا۔ خواجہ صاحب بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان کا دماغ بھی بیکار ہو گیا ہے۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لیے ان کے بھانجے خواجہ محمد حفیظ ترجمانی کرتے رہے۔ خواجہ صاحب کی اطلاع یہی تھی کہ مولوی سراج الدین احمد کا خاندان نابود ہو چکا ہے۔

تاہم جیسا میں نے ابھی اوپر لکھا میں کل صبح "الناظر" کے دفتر سے ہو کر پھر احاطہ خان ماں گیا اور عین اس موقع پر رہنے والے گھر والوں کے پاس خود بخود چلا گیا۔ یہ ایک خلیق نوجوان آدمی شیخ ثروت علی وکیل تھے۔ اچھی طرح ملے۔ کہنے لگے کہ تکیہ شیر علی شاہ ہمارے مکان کے متصل ہے۔ میں بعد میں تحقیقات کر کے آپ کو اطلاع دوں گا کہ مولوی سراج الدین احمد کے خاندان میں سے کوئی شخص باقی ہے یا نہیں۔ کہتے تھے کہ سچ پوچھیے تو ہمیں یہ معلوم بھی نہ تھا کہ یہاں غالب کے دوستوں میں سے کوئی صاحب رہتے تھے۔ آپ کے آنے سے یہ معلوم ہوا۔ میں نے غالب کے ایک اور لکھنوی دوست کا پتا (یعنی سکونت وغیرہ کا پتا) انھیں دیا اور کہا کہ ان کی اولاد کے متعلق بھی تفتیش کریں۔ اب بذریعہ خط انھیں مرزا میتا بیگ کوتوالِ لکھنؤ کا نام بھی لکھوں گا جن کی وفات پر ایک فارسی قطعہ غالب کے کلیات میں ہے۔ ثروت علی صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ آپ کی کتاب تو دیکھنے کے

قابل ہوگی۔ یورپ کے لوگ اس قسم کی تحقیق سے کتابیں لکھتے ہیں ورنہ ہندوستان میں تو یہ بات بہت کم ملتی ہے۔ مگر میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ میری کتاب کا اصل مقصد تنقید ہے۔ سوانحی مواد کو اس میں چنداں اہمیت نہ دی جائے گی۔ یہ پہلے لکھنؤی آدمی تھے جنھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو دو تین دن اور ٹھہرنا ہوتا تو میرے پاس آکر ٹھہرتے تاکہ ہم بھی کچھ وقت آپ کے شریکِ صحبت رہ سکتے مگر آپ کہتے ہیں کہ آپ کو آج ہی شام الہ آباد جانا ہے۔

ان کی اس دعوت پر مجھے تعجب ہوا کیونکہ دہلی اور لکھنؤ میں پان تو ضرور متواتر پیش کیا جاتا ہے مگر گرم سے گرم موسم میں بھی پانی کا گلاس کوئی نہیں پوچھتا۔ میں علی گڑھ میں اسحاق کے ساتھ ... کے گھر گیا تو واپسی پر اسحاق نے اس بیچارے کو بہت برا بھلا کہا کہ لاہور سے کوئی شخص چل کر ملنے آئے تو اتنی انسانیت تو ہونی چاہئے کہ اسے پانی یا شربت کا گلاس پوچھ لیا جائے۔ لکھنؤ میں ایک چھوڑ دو دو پان بھی بعض مرتبہ پیش ہو جاتے ہیں یعنی ایک تو گھر میں، دوسرا تشتری ہاتھ میں لیے ہوئے تانگے تک ساتھ آکر (اس دوسرے پان کو پنجابی مہمان چند قدم چل کر سڑک کے کسی اندھیرے کونے میں پھینک دیتا ہے)۔ میں عام طور پر انکار کر دیتا ہوں کہ میں پان نہیں کھاتا لیکن کبھی کبھی جب صحت کمزور ہو تو مجبوراً قبول کر لیتا ہوں اور طبیعت کو اور خراب کرتا ہوں۔ چنانچہ کل ثروت علی صاحب کے مکان پر میں صحت کی کمزوری کی وجہ سے پان سے انکار نہ کر سکا۔ اس کی وجہ سے مجھے شام تک سر میں خوب درد ہوتا رہا۔ دہلی میں ایسے موقعوں پر یہ کیفیت نہیں ہوتی تھی مگر لکھنؤ کا پان زیادہ کڑوا اور تیز ہے۔

ثروت علی صاحب سے رخصت ہو کر میں پھر "الناظر" کی تنگ اور پیچ در پیچ گلی میں پہنچا۔ اسحاق علی کھانا کھا رہے تھے۔ انھوں نے اندر سے پیغام بھیجا کہ دسمبر ۱۹۳۴ کا پرچہ

نہیں ہے۔ یہاں سے نکل کر میں نخاس کا بازار دیکھنے گیا۔ جس طرح جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر جمعے کے جمعے بازار لگتا ہے اسی طرح لکھنؤ کے نخاس میں اتوار کے اتوار ہنگامہ بپا ہوتا ہے اور ہر قسم کی چیز فروخت ہوتی ہے۔ یہاں سے میں نے ایک کتاب "سفرِ کلکتہ" دو آنے میں اور دو اور کتابیں ("انشائے بے خزاں" اور لکھنؤ کا پچھلی صدی کا ایک اردو ریڈر) دو دو پیسے میں خریدیں۔ پھر ایک بجے ہوٹل آکر کھانا کھایا اور سامان لے کر سٹیشن آیا۔ معلوم ہوا کہ اڑھائی بجے کی گاڑی آج اتوار کی وجہ سے نہیں جائے گی۔ پریشانی ہوئی کیونکہ میں غلطی سے صرف یہی گاڑی ٹائم ٹیبل سے دیکھ کر آیا تھا' مگر ساتھ ہی معلوم ہوا کہ تین بج کر بیس منٹ پر ایک اور گاڑی کانپور کے راستے سے الہ آباد جائے گی۔ چنانچہ اسی میں سوار ہو گیا۔

اگر سید ابو محمد مجھے لکھنؤ میں مل جاتے تو نہ مجھے الہ آباد جانے کا موقع میسر آتا اور نہ براہِ کانپور جانے کا اتفاق ہوتا' لیکن چونکہ غالب کانپور اور الہٰ آباد کے رستے سے کلکتے گیا تھا اس لیے مجھے بھی قدرت نے خواہی نخواہی اسی رستے پر چلایا۔ کانپور کے قریب گنگا کو پہلی مرتبہ دیکھا مگر میں اس سے خاص طور پر مرعوب نہ ہوا۔ نو بجے کے بعد گاڑی الہٰ آباد پہنچی تو بارش خوب زور کی ہو رہی تھی۔ کچھ بارش اور کچھ قلی کے ہنگامے کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ تاہم کھانا کھاکر میں ساڑھے دس بجے بہ آرام بستر پر لیٹ گیا۔ کمرہ خوب ہوادار تھا۔ نیند ٹھیک آئی۔ صبح ۵ بجے اٹھا۔ پھر وہی شیو اور غسل اور چائے کے مراحل طے کرکے اور ذرا صاف ستھرے کپڑے پہن کر آٹھ بجے ہوٹل سے نکلا۔

سٹیشن پر جاکر پریاگ جانے کے لیے ایک تانگہ لیا جہاں خان بہادر سید ابو محمد رہتے ہیں۔ یہ "پبلک سروس کمیشن" کے ممبر ہیں۔ اخلاق سے پیش آئے۔ ان سے تمام گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ انھوں نے گھر میں میرے کھانے کے لیے بھی کہہ دیا تھا مگر میں گیارہ بجے

ہی ان کے دیوان غالب (مطبوعہ ۱۸۴۲) کے نوٹ لے کر فارغ ہو گیا۔ اس لیے ان کے ہاں کھانا کھانے سے بہ شکریہ انکار کر دیا۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو اور آنے سے پہلے مجھے خط کیوں نہ لکھا؟ غالباً" مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے ہاں ٹھہرا لیتا۔ کہتے تھے کہ پنجاب کو غالب کا جنون ہے حالانکہ انیس (اور میر) اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ با ایں ہمہ میری روانگی سے پہلے انھوں نے کہا کہ جب تمھاری کتاب شائع ہو جائے تو اس کی ایک جلد بذریعہ وی پی مجھے ضرور بھیجنا۔ اس کو بطور یادواشت کہیں لکھ لو۔ میری "ہنوز نازائیدہ کتاب" کی پہلی درخواست یہی آئی ہے' مگر میں ان کو ایک نسخہ ہدیۃً بھیج دوں گا۔

بنارس کی گاڑی چونکہ پونے پانچ بجے روانہ ہونے والی تھی اور میں گیارہ بجے ہی فارغ ہو گیا تھا اس لیے میں الہٰ آباد یونیورسٹی لائبریری کے قلمی نسخے دیکھنے چلا گیا۔ لائبریرین نے بڑے اخلاق سے فارسی مخطوطات کی الماری کھول کر مجھے اس کمرے میں تنہا چھوڑ دیا۔ اس ذخیرے میں بیش قیمت تاریخی کتابیں تھیں مگر میرے کام کی کوئی چیز نہ ملی۔ ایک بجے یہاں سے نکلا اور موتی لال نہرو کا محل (آنند بھون) دیکھتا ہوا ہوٹل آیا۔ دو بجے کھانا کھاکر فارغ ہوا تو سامان درست کیا۔ شریفانہ کپڑے اتار کر قلیوں والے کپڑے پہن لیے اور تین بجے بالکل تیار ہو گیا۔ پہلے خیال کیا کہ چار بجے تک خط لکھ لوں لیکن پھر سوچا کہ الہ آباد کب روز روز آنا ہو گا۔ اس ایک گھنٹے میں شہر کی شکل صورت دیکھ لینی چاہئے چنانچہ پانچ آنے پر ایک اِکّہ لے کر ایک گھنٹے تک بازاروں میں گھومتا رہا۔ واپس پہنچ کر سٹیشن آیا اور یہ خط گاڑی میں بیٹھ کر لکھنا شروع کیا۔ یہ بھی اچھا ہو گیا' کیونکہ ہوٹل میں لکھا ہوا خط ذرا مختصر ہوتا۔ اس قدر تفصیل سے لکھنے کا جو موقع ملا ہے یہ صرف گاڑی میں بیٹھ کر لکھنے کی وجہ سے ہے۔ ای۔ آئی۔ آر۔ کی گاڑیاں ایسی اچھی ہیں کہ چلتی گاڑی میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں

مگر دیکھ لیجیے کہ کس طرح صاف لکھا جا رہا ہے۔ ایک کارڈ عبدالواحد کے نام الہ آباد اور پریاگ کے درمیان ختم کرکے پریاگ کے سٹیشن پر ڈاک میں بھی ڈال دیا تھا۔ پریاگ سے آگے بڑھ کر پھر گنگا آئی مگر پھر وہی بے اثر نظارہ۔ پانی بھی برسات کی وجہ سے بہت گدلا تھا۔ رام پور کے بعد گرمی ختم ہو گئی ہے۔ رام پور سے لکھنؤ کا اور لکھنؤ سے الہ آباد کا موسم بہتر ثابت ہوا۔ اب ساڑھے چھ بجے ہیں اور سورج غروب ہو رہا ہے۔ ٹھنڈی ہوا گاڑی میں فرفر آرہی ہے۔ ہر طرف ہریادل اور درخت اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھے نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ کے بعد دھان کے کھیت بھی شروع ہو گئے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے درمیان چاول کی پیداوار شاید نہیں ہوتی۔

دال منڈی، بنارس
۱۷ اگست ۱۹۳۸ء، ۶ بجے صبح

مغلوبِ سطوتِ غمِ دل غالبِ حزیں — کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است — "مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود"

مَیں پرسوں رات بنارس پہنچ گیا تھا۔ کل کام ختم کرکے، کل ہی رات کی گاڑی سے روانہ ہونا چاہتا تھا تاکہ ایک دن بچ جائے لیکن صبح سے شام، بلکہ رات تک کی کدو کاوش کے باوجود کام ختم نہ ہو سکا۔ اب ارادہ ہے کہ صبح دس بجے کی گاڑی سے روانہ ہو جاؤں۔ ہندو یونیورسٹی میں سری رام کے کتب خانے کا معائنہ اور پنڈت مہیش پرشاد سے تین گھنٹے کی ملاقات، یہ دونوں باتیں تو کل ہو گئی تھیں مگر مرزا قمرالدین کی تلاش انجام کو نہ پہنچ سکی۔ مرزا قمرالدین علی گڑھ میں غالب کی بہن کے پوتے یا نواسے بتائے گئے تھے۔ دو گھنٹے مختلف "مرزاؤں" کی تلاش میں ضائع کیے۔ اگر مرزا نظرالدین (وکیل و رئیسِ بنارس) کل شام

۹ بجے مل جاتے تو میں رات کو گیارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہو کر آج صبح چھ بجے پٹنے پہنچ گیا ہوتا مگر مرزا صاحب بہت جلد سو جاتے ہیں۔ اس لیے صبح ان سے ملنے کے لیے خواہ مخواہ ایک دن اور ٹھہرنا پڑا۔

منسلکہ پرچہ بھائی حامد علی خاں کو دے دیجئے کہ "ہمایوں" کے تبصروں میں شائع کر دیں۔ میں مالک رام صاحب کو لکھ چکا ہوں کہ آپ کی کتاب کا ریویو میں نے لکھ کر "ہمایوں" کو بھیج دیا ہے اور ہمایوں کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔ مہیش پرشاد کے نام اگر "ہمایوں" جاری ہو جائے تو ان سے شاید کوئی مضمون مل جایا کرے۔ (دوسرے رسالوں کو وہ غالب کے متعلق اپنے مضمون بھیجتے رہتے ہیں)۔

۱۶

سنٹرل ہندو ہوٹل، نزد بو بازار جنکشن، کلکتہ

۱۹ اگست ۱۹۳۸ء

تارکاپتا Centroid Calcutta یہ اس لیے لکھ دیا ہے کہ خط تو میری روانگی سے پہلے آ ہی نہیں سکتا۔ تار کا پتہ ہوٹل والوں نے بتایا تو میں نے کہا کہ چلو یہی لکھ دو۔

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ "چائے"[1]

از سینہ داغِ دوریِ احباب شستہ ایم!

مطلب یہ ہے کہ آج صبح کلکتے پہنچا ہوں اور اب ہوٹل میں سامان رکھ کر اور چائے پی کر باہر جا رہا ہوں۔ پرسوں بنارس میں جو مفصّل خط حوالۂ ڈاک کیا تھا امید ہے وصول ہو گیا ہو گا۔

پرسوں ہی شام میں پٹنے پہنچ گیا تھا۔ ایک برا سا ہوٹل رہنے کے لیے ملا مگر خیر خدا بخش لائبریری کے قریب تھا۔ میں نے ایک دن بچانے کے لیے صبح سے لے کر شام ۸ بجے تک لائبریری میں کام کیا اور اسی رات دس بجے پنجاب میل سے روانہ ہوکر آج صبح ساڑھے سات بجے یہاں پہنچ گیا۔ مسٹر ولی الدین خدا بخش (لائبریرین) نے پٹنے میں یہ بڑی مہربانی کی کہ لائبریری کے وقت کے علاوہ بھی میرے لیے لائبریری اَور چار گھنٹے کھلی رکھی۔ پھر بھی کام ختم نہ ہو سکا اور غالب کی بعض غیر مطبوعہ چیزیں (مثلاً" گل کپورے کی تعریف میں فارسی مثنوی وغیرہ) نقل نہ ہو سکیں۔ میں نے ان کو نوٹ کرلیا ہے اور اب کسی اور شخص کے

---

۱ غالب: "ے"

ذریعے سے ان کی نقل منگوا لوں گا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ ایک ہی دن میں پٹنے سے نکل سکا۔ اگرچہ اس کے لیے دن بھر میز پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لائبریری سے نکلتے ہی ہوٹل میں آکر کھانا کھایا اور سٹیشن کی طرف بھاگا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آئی اور سوار ہوا۔ صبح ۸ بجے کے قریب اس ہوٹل میں پہنچا۔ اب ساڑھے دس بجے کے قریب باہر جا رہا ہوں۔ اب آپ حیدر آباد ہی خط لکھیے کیونکہ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے ۲۳، ۲۴ یا ۲۵ کو جس دن بھی ہو سکے، سیدھا حیدر آباد روانہ ہو جاؤں۔

۱۷

سنٹرل ہندو ہوٹل، نمبر ۹ چترنجن ایونیو، ساؤتھ، کلکتہ

۲۱ اگست ۱۹۳۸ء

پرسوں پٹنے سے یہاں پہنچنے پر جو کارڈ میں نے لکھا تھا مل گیا ہوگا۔ اس کے بعد ساڑھے دس بجے کے بجائے ساڑے گیارہ بجے کے قریب میں ہوٹل سے نکل سکا۔ کلکتہ ایک انگریزی شہر کا نمونہ ہے۔ بند گاڑی اور فٹن کے سوا کوئی اور گھوڑا گاڑی یہاں نہیں ہے۔ تھوڑا سٹیشن سے ہوٹل تک بند گاڑی والے نے پرسوں مجھ سے ایک روپیہ لیا۔ موٹر کاروں اور ٹریموں کی کثرت ہے۔ ٹریم تو اس کثرت سے چلتی ہے کہ ہر وقت ایک تانتا لگا رہتا ہے۔ ہزاروں لوگ اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موٹر اور ٹریم کے متواتر گزرنے کی وجہ سے سڑک کو عبور کرکے دوسری طرف جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ عام ہندوؤں سے راستہ پوچھو تو نہیں بتاتے (یا غلط بتاتے ہیں)۔ مسلمان بتا دیتے ہیں۔

بارہ بجے کے قریب میں امپیریل لائبریری پہنچا۔ خان بہادر اسد اللہ لائبریرین موجود نہیں تھے۔ تین بجے تک لائبریری میں بیٹھ کر کلکتے کا حال پڑھتا رہا تاکہ اس شہرِ غدّار میں اِدھر اُدھر حرکت کرنے کی کوئی گنجائش پیدا ہو۔ ایک انگریز خاتون مسز حسن علی کی کتاب مسلمانانِ ہند کی معاشرت کے متعلق بھی اسی عرصے میں دیکھی۔ تین بجے لائبریرین سے ملنے اوپر گیا۔ وہ مصروف تھے۔ آدھ گھنٹے کے قریب انتظار کرنا پڑا۔ ان کے ملاقاتی باہر نکلے تو میرا کارڈ اندر گیا۔ بھائی حامد علی خاں کا دیا ہوا خط انھوں نے پڑھا۔ اخلاق سے پیش آئے۔ میری تحقیق کے سلسلے میں بہت سی چیزوں کا وعدہ اپنی لائبریری سے کیا۔ پھر فون اٹھاکر مسٹر عبدالعلی "کیپر آف امپیریل ریکارڈز" سے میرے متعلق بات کی۔ انھوں نے دوسرے دن گیارہ بجے آنے

کو کہا۔ ساتھ ہی یہ رائے دی کہ رضا علی وحشت سے ملنا چاہیے۔ اس کے بعد اسد اللہ صاحب نے میرے کہنے پر نیاز محمد خاں آئی۔سی۔ایس۔ (ممتاز حسن کے دوست) سے فون پر بات کی۔ وہ میرے منتظر تھے۔ یہاں سے اٹھ کر میں سوا چار بجے ان کے دفتر واقع "رائیٹرز بلڈنگز" میں پہنچا۔ بڑی کاوش سے اجازت نامہ لے کر ان کے پاس پہنچا۔ بہت اچھی طرح ملے۔ اپنے مکان پر ٹھہرنے کی دعوت دی مگر چونکہ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی بیوی کے رشتہ دار ان کے پاس آئے ہوئے ہیں' میں نے ہوٹل میں ٹھہرنا ہی مناسب سمجھا۔ انھوں نے غالب کے متعلق پرانے ریکارڈز دکھانے میں مدد کا وعدہ کیا۔ مولانا ابوالکلام اور بعض شرفائے شہر سے ملاقات کرانے کو بھی کہا۔

آدھے گھنٹے کے بعد یعنی ۵ بجے کے قریب ان سے رخصت ہوکر اس دفتر کے ٹفن روم میں آیا کیونکہ صبح ۸ بجے کی چائے کے بعد کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ یہاں صرف ایک مکھن لگا ڈبل روٹی کا ٹکڑا ملا۔ یہاں سے نکل کر رضا علی وحشت کے مکان کو روانہ ہوا۔ رستے میں ٹریم سے اتر کر ایک چینی ریسٹوران بنام "ایشیاٹک ریسٹوران" (چینیوں کی یہاں بہت کثرت ہے۔ بہت سی دکانوں پر لی ہنگ چنگ کی قسم کے نام لکھے نظر آتے ہیں) میں میں نے چائے طلب کی۔ اس نے چار سینڈوچ کے چھ آنے (چائے کی قیمت کے علاوہ) لیے جو مجھے بہت گراں گزرے۔ خیر میں نے شکر کیا کہ بھوک کا کچھ چارہ تو ہوا۔ اس کے بعد رضا علی وحشت کے مکان پر پہنچا جس کا پتا خان بہادر اسداللہ نے تفصیل سے سمجھا دیا تھا۔ نوکر نے کہا "گھر پر نہیں ہیں" (بعد میں معلوم ہوا ہے کہ اتوار کے سوا وہ کسی دن ملاقاتیوں سے نہیں ملتے۔ عجب نہیں کہ نوکر نے محض ہدایات کی پابندی میں جھوٹ کہہ دیا ہو)۔

یہاں سے نکل کر میں بہت سی "ٹکریں مارتا" ہوا شملہ بازار چیت پور پہنچا جہاں غالب ۱۱۰ برس پہلے قیام کلکتہ کے دنوں میں ٹھہرا تھا۔ مکان تو اس گلی میں پرانے سے ہیں۔ ممکن

ہے غالب والا مکان اب تک موجود ہو۔ خان بہادر اسد اللہ نے کہا تھا کہ عبدالعلی صاحب اس کے متعلق بتا سکیں گے۔ غالب کے مکان کی تلاش سے پہلے یا بعد (ٹھیک یاد نہیں رہا) میں مدن دیکھنے گیا۔ پاس ہی ہوگلی میں کچھ جہاز کھڑے تھے اور بے شمار کشتیاں تھیں۔ تھوڑی دیر گھاٹ پر بیٹھ کر میں ان کو دیکھتا رہا۔

ٹریم میں ایک بنگالی مسلمان سے کسی مسلمان ہوٹل کا پتا پوچھا۔ وہ بچارا مجھے خود ٹیپو سلطان کی مسجد کے پیچھے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ یہاں کھانا بہت سستا تھا لیکن گھی کے بجائے اس میں شاید تیل تھا' یا ممکن ہے گھی ہی ایسا ہو۔ اسی مسلمان سے زکریا سٹریٹ لوئر چیت پور روڈ کے "امجدیہ ہوٹل" کا پتا معلوم ہوا۔ رات کو دس بجے کے بعد میں اپنے ہوٹل میں پہنچا۔

۲۰ اگست کی روئیداد

صبح ۸ بجے اٹھ کر کسی نئے مسلمان ہوٹل کی تلاش میں نکلا کیونکہ اس ہوٹل کے سخت پلنگ پر مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ "امجدیہ ہوٹل" اور "امینیہ ہوٹل" مسجدِ زکریا یا مسجدِ ناخدا کے سامنے تھے مگر ان میں کرایہ دو روپے سے کم نہ تھا۔ آٹھ سوا آٹھ بج چکے تھے فاقہ کشیوں کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ کھانا یہیں انیسہ ہوٹل میں کھا لیا جائے۔ کھانا اچھا تھا اور مہنگا بھی نہ تھا۔

کھانا کھاکر آدھے گھنٹے تک اپنا پروگرام ایک صاف کاغذ پر نقل کرتا رہا۔ ساڑھے نو بجے نیاز محمد خاں کے پاس "رائیٹرز بلڈنگ" پہنچنا تھا' اس لیے خیال کیا کہ اتنی دیر میں "صداقت" کے دفتر کا مکان "سراج بلڈنگ" میں ڈھونڈ لیا جائے۔ "سراج بلڈنگ" آسانی سے مل گئی۔ اس کو میں تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا اور یہاں کے مختلف ہنگامے بھی چشمِ تصور سے دیکھتا رہا۔

پھر سامنے ایک مسلمان دکاندار سے ٹیلیفون کرنے کی اجازت مانگی۔ اس کنجوس نے کہا کہ دو آنے لگیں گے' حالانکہ لاہور میں کبھی اس بات کے لیے کسی شخص نے پیسے نہیں مانگے۔ خیر دو آنے دے کر نیاز محمد خاں کو ٹیلیفون کیا کہ میں آرہا ہوں۔ اپنا چپراسی نیچے بھیج دو۔ (یہ اس لیے کہا کہ گزشتہ ملاقات کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے کی جو زحمت کرنی پڑی تھی اس سے بچوں)۔ رکشا پر سوار ہو کر پہنچا۔ نیاز محمد خاں نے ایک انگریز جوائنٹ سیکرٹری (فنانس اور کامرس) مسٹر ہیوز سے بھی ملاقات کرائی۔ بہت شریف النفس آدمی ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ایک دن کے لیے لاہور بھی آرہا ہے۔ وہاں اس سے پھر ملاقات کا وعدہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے ریکارڈ روم میں جاکر پرانے کاغذات کی فہرست بنگالی ہندو ریکارڈ کیپر کی مدد سے دیکھنی شروع کی۔ جب اس میں "مرزا اسد اللہ خاں کی پنشن ۱۸۱۳" کے الفاظ نظر آئے تو مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جیسے کلکتے میں غیر متوقع طور پر اپنے کسی عزیز سے ملاقات ہو گئی۔ اب ریکارڈ دیکھنے کی اجازت لینے کے لیے افسران بالا کو ایک درخواست لکھی اور نیاز محمد خاں کے سپرد کرکے وہاں سے نکلا۔

امپیریل لائبریری میں ایک بجے کے قریب پہنچ کر خان بہادر اسد اللہ سے ملا۔ سات بجے تک فارسی مخطوطات کا معائنہ کیا۔ ان میں سے بعض چیزیں ملیں۔ اب اس کے بعد اردو اور انگریزی حصوں کی چھان بین باقی ہے۔ سات بجے یہاں سے نکل کر لائبریری اسسٹنٹ کی مدد سے (جو ایک دہلوی شخص ہے) عبدالعلی صاحب کے مکان پر پہنچا۔ (ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا کہ صبح گیارہ بجے نیاز محمد خاں نے عبدالعلی صاحب سے فون پر میرے نہ آنے کی معذرت کر دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ شام کو ساڑھے سات بجے آسکتے ہیں یا اتوار کی صبح یعنی آج صبح کو) ساڑھے سات بجے عبدالعلی صاحب کے گھر پہنچا۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت تو میں بہت مصروف ہوں۔ ہو سکے تو کل گیارہ بجے آیئے۔ قریب ہی رضا علی وحشت

کا گھر تھا مگر وہ بھی حسب معمول "باہر تھے"۔ چنانچہ "شاہجہاں محل ہوٹل" میں رات کا کھانا کھا کر ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اپنے ہوٹل پہنچا۔ صبح سات بجے سے لے کر شام کے ۸ بجے تک کی اس دوڑ دھوپ سے بہت تھک گیا تھا' اس لیے باوجود کوشش کے آپ کو اس وقت خط نہ لکھ سکا اور اسی لکڑی کے پلنگ پر بہت جلد سو گیا...

(۲۲ اگست صبح ۸ بجے)
۲۱ اگست کا حال' ساڑھے نو بجے شب

آج صبح اٹھ کر پھر ہڈیوں میں درد ہو رہا تھا مگر میرے کہنے پر آج دوسرے پلنگ کا انتظام ہو گیا ہے۔ صبح یہاں تک خط لکھ کر میں نو بجے نیاز محمد خاں کے مکان واقع نمبر ۱۵ بالی گنج سرکلر روڈ کی طرف روانہ ہوا۔ سنا ہے ابو الکلام آزاد اسی سڑک پر نمبر ۲۰ کے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کو بتایا کہ مجھے ۱۱ بجے عبدالعلی صاحب کے گھر پہنچنا ہے۔ چنانچہ یہاں سے گیارہ بجے عبدالعلی کے مکان (نمبر ۳ نواب عبدالرحمان سٹریٹ) پہنچا۔ بارہ بجے تک وہاں رہا۔ اس کے بعد اٹھ کر رضا علی وحشت کے گھر (سیکنڈ ولنرلی لین میں) پہنچا جو قریب ہی ہے۔ وہ حسبِ معمول موجود نہ تھے۔ میں ایک رقعہ چھوڑ آیا کہ مجھے بذریعۂ کارڈ اطلاع کریں کہ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد مدرسۂ کلکتہ جا کر دیکھا۔ غالب کے زمانے میں مدرسۂ کلکتہ میں مشاعرے ہوتے تھے اور یہیں مرزا قتیل اور مثنوی "بادِ مخالف" والا مشہور جھگڑا ہوا تھا' لیکن مجھے بعد میں ابوالکلام آزاد سے معلوم ہوا کہ مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں ۱۸۶۰ یا ۱۸۷۰ کے قریب منتقل ہوا۔ اس سے پہلے سیالدہ میں "بیٹھک خانہ روڈ" پر تھا۔

مدرسہ دیکھ کر ایک بجے کے قریب میں ایک ہندو معلم ایچ۔این۔بینرجی لیکچرر فزیالوجی'

پٹنہ میڈیکل کالج (پٹنہ) کے مکان پر پہنچا۔ یہ پٹنے سے کلکتے تک میرے ہم سفر تھے اور رستے میں انھوں نے کہا تھا کہ میں اپنے عزیزوں میں سے ایک نوجوان کو جو ایم۔اے۔اردو میں پڑھتا ہے تمھارے حوالے کر دوں گا۔ وہ کلکتے کے مختلف مقامات تک تمھاری رہنمائی کرے گا۔ چونکہ یہ صاحب آج رات واپس پٹنے جانے والے تھے اس لیے میں ایک بجے پہنچ گیا۔ ان کے پاس مجھے ڈیڑھ بجے سے بھی کچھ زیادہ وقت ہو گیا۔ دو بجے مجھے نیاز محمد خاں اپنی موٹر کار پر میرے ہوٹل سے لینے کے لیے آنے والے تھے۔ ہوٹل دو تین میل دور تھا۔ ناچار عجلت میں ایک ٹیکسی لی اور ہوٹل پہنچا۔ دو بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے' اس لیے پہلے تو میں نے کھانا منگوا کر کھایا۔ پھر ان کا انتظار کرنے میں ایف۔کے۔خاں درانی سے باتیں کرتا رہا (ایف۔کے۔خاں درانی سے کل ہوٹل میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ وہی سابق مرزائی ہیں جنھوں نے برلن کی مسجد گرو رکھی تھی)۔ تین بجے کے قریب نیاز محمد خاں آئے۔ یہ مجھے کلکتے کے مسلم سکول لے گئے۔ یہاں ابوالکلام آزاد چالیس پچاس اشخاص کے سامنے اردو اور ہندی کے مسئلے پر تقریر کر رہے تھے۔ ایک سیاسی آدمی سے پہلی دفعہ معقول اور مدلل بات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اگرچہ ابوالکلام آزاد کے بعض دلائل مجھے بالکل بودے معلوم ہوئے مگر وہ پھر بھی تھے دلائل ہی۔ تقریر میں کوئی غیر متعلق بات نہ تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر جاری رہی۔ بعد میں سب حاضرین چائے پر بیٹھے۔ میں اور نیاز محمد خاں ابوالکلام کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ وہیں میرا تعارف ہوا اور غالب کے مکان اور مدرسۂ کلکتہ کے متعلق باتیں بھی۔ بقول ابوالکلام کے غالب کا مکان "گینڈے کے تالاب" کے پاس تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سپریم کورٹ کے ریکارڈز دیکھنے سے شاید کچھ کاغذات مل جائیں۔

پانچ بجے یہاں سے نکل کر شملہ بازار گئے۔ ایک اور صاحب بھی جن کا نام غالباً" امین ہے' موٹر میں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی آوارہ گردی کے باوجود غالب کا مکان

نہ ملا۔ یہاں سے درگاہ روڈ پر محفوظ الحق صاحب پروفیسر فارسی پریذیڈنسی کالج کے پاس پہنچے۔ ان سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ ۷ بجے ناچار یہاں سے لوٹے۔ نیاز محمد خاں نے ہم دونوں کو ٹریم کے پاس چھوڑا اور خود موٹر لے کر چلے گئے۔ میں نے امین صاحب کے ساتھ "چینی بازار" اور "زکریا سٹریٹ" کا مسافر خانہ دیکھا۔ پھر کھانا کھا کر گھر آگیا۔

اب دراصل کلکتے میں مجھے تین چیزیں دیکھنی ہیں : "ایشیاٹک سوسائٹی" کا کتب خانہ' "امپیریل لائبریری" اور گورنمنٹ کے پرانے کاغذات۔ اس میں شاید تین یا چار دن لگیں گے۔ اس کے بعد حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ بھائی صاحب کو اس کے متعلق میں نے آج لکھ دیا ہے۔

۱۸

کلکتہ

۲۵ اگست ۱۹۳۸ء

میں نے شاید ۲۲ اگست کو یہاں سے اپنا گزشتہ خط آپ کو بھیجا تھا۔ جب سے میں کلکتے آیا ہوں سر کی کھوپڑی میں درد ہوتا رہتا تھا اور چکر آتے رہتے تھے۔ بالخصوص ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ تاریخ کو اس کی بہت زیادہ تکلیف رہی۔ فروٹ سالٹ بھی پیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پرسوں صبح رضا علی وحشت نے دوران ملاقات میں یہ رائے ظاہر کی کہ یہ تکلیف خون کا دباؤ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہے۔ ان کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط، مگر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے درست تسلیم کیا جائے۔ (یعنی ۱۱ جولائی سے لے کر اب تک میں تقریباً" تین آدمیوں کا کام کرتا رہا ہوں اور ایک دن بھی آرام نہیں کر سکا۔ جب میں ایک کام میں مصروف ہوتا ہوں تو باقی دو آدمی میرے دماغ میں دوسرے افکار میں مصروف ہوتے ہیں)۔ پھر غذا بھی کثرت سے چائے اور گوشت اور پان رہی۔ سبزی بہت کم ملتی تھی۔ عجب نہیں کہ خون کا دباؤ بڑھ گیا ہو۔ بہرحال جوں ہی رضا علی وحشت نے یہ وسوسہ میرے دل میں ڈالا، میں نے فوراً" ضروری احتیاطیں شروع کر دیں۔ پیدل چلنے کے بجائے ہر جگہ رکشا گاڑی سواری کے لیے لی۔ پرسوں صبح کے ناشتے کے بعد دن بھر صرف سنگترے ہی کھائے۔ چائے اور گوشت یک قلم موقوف کیا۔

کل میں نے ساڑھے دس بجے سے پانچ بجے تک "امپیریل لائبریری" میں پرانے کلکتے کے متعلق کچھ کتابیں دیکھی تھیں اور اس عرصے میں بھی ایک سے تین بجے تک باہر رہا تھا۔ نیاز محمد خاں نے بہ اصرار مجھے گرینڈ (؟) ہوٹل میں لنچ کی دعوت دے رکھی تھی۔ ساتھ اپنے

ایک جاہل آئی۔سی۔ایس۔ دوست کو بھی مدعو کیا تھا۔ خیر غنیمت ہے کہ یہ "پولٹیکل لنچ" جلد ختم ہو گیا اور میں اس ہوٹل سے نکل کر مدرسہ عالیہ کے پرنسپل خان بہادر موسیٰ خاں سے ملنے چلا گیا۔ ان سے چند منٹ بات کرکے پھر لائبریری پہنچا جہاں سے پانچ بجے کام ختم کرکے نکل آیا۔ شام کو یہاں ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا چلتی ہے۔ اس لیے رکشا لے کر اِدھر اُدھر کی سیر کی اور "فورٹ ولیم" دیکھا۔ ساڑھے سات بجے اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ آج "ایشیاٹک سوسائٹی" میں تھوڑی دیر کام کروں گا اور شام کو ۶ بجے انشاء اللہ بذریعہ بمبئی میل حیدر آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ گاڑی کل چار بجے سہ پہر ناگپور پہنچے گی۔ وہاں سے پانچ بجے گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں سوار ہوں گا جو دوسرے دن صبح سات بجے حیدر آباد پہنچا دے گی۔ گویا آج جمعرات کی شام کو یہاں سے روانہ ہوکر پرسوں ہفتے کی صبح کو انشاء اللہ حیدر آباد پہنچ جاؤں گا۔

۱۹

شیش محل، بھوپال

۶ ستمبر ۱۹۳۸ء

اِس وقت رات کے ساڑھے نو بجے ہیں۔ میں کل شام ۷ بجے حیدر آباد سے روانہ ہو کر آج ۷ بجے شام بھوپال پہنچ گیا۔ سامان ساتھ لے کر پہلے سیدھا مفتی انوار الحق صاحب کے مکان واقع "بارہ محل" پہنچا۔ سید ساجد علی صاحب نے جو ان کے داماد ہیں ان کو پہلے سے اطلاع کر رکھی تھی۔ مفتی صاحب پانچ منٹ کے لیے ملے۔ معلوم ہوا کہ شیش محل (سرکاری مہمان خانوں میں سے ایک) میں میرے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ آٹھ بجے میں تانگا لے کر یہاں پہنچا۔ مہتمم صاحب مہمان خانہ موجود نہ تھے۔ مفتی صاحب کا آدمی جو میرے ساتھ تھا، ان کو بلانے گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ آئے۔ کمرے کھولے گئے۔ کھانا دوسرے سرکاری مہمان خانے سے منگوایا گیا۔ ابھی میں کھانا کھا کر فارغ ہوا ہوں۔ اب یہ خط لکھ کر اور دانت صاف کر کے سو جاؤں گا۔

میں جس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں، یہ وہی ہے جس میں علامہ اقبال بھوپال آنے پر ٹھہرائے جاتے تھے۔ بہت کھلی خواب گاہ ہے۔ لوہے کا پلنگ جس پر مچھردانی لگی ہے مع بستر کے موجود ہے۔ بستر صاف ستھرا اور نرم ہے۔ کمبل تک اس میں موجود ہے۔ خواب گاہ سے ملحق ڈرائنگ روم ہے۔ دونوں طرف برآمدے ہیں۔ غسل خانہ، لباس بدلنے کا کمرہ سب موجود۔ صبح کے لیے مجھ سے ابھی پوچھ لیا گیا ہے کہ "غسل کس وقت لوں گا، اور چائے کس وقت پیوں گا"۔ غرض مجھ جیسا بے تکلف اور بے قاعدہ آدمی یہاں آ کر عجب مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ سنا ہے کہ ایک موٹر بھی صبح کتب خانے جانے اور وہاں سے واپس

"شیش محل" تک آمدو رفت کے لیے ملے گی۔ یہ کچھ ایسی تکلیف دہ بات نہیں۔

میری کوشش یہ ہوگی کہ کل ہی بھوپال کے کتب خانے سے فارغ ہو جاؤں اور اسی گرینڈ ٹرنک اکسپرس سے کل شام ساڑھے سات بجے روانہ ہو سکوں۔ صبح ۴ بجے آگرے پہنچا دے گی۔

بھابی صاحبہ نے کل شام مجھے ایک چھوٹی سی بٹی[1] میں کھانا دے دیا تھا۔ یہ میں نے حیدر آباد سے روانہ ہونے کے بعد کل رات کو بھی کھایا اور آج صبح ناگپور سے روانہ ہونے کے بعد بھی کھایا۔ چار بجے گاڑی میں چائے پی لی تھی۔

میں حیدر آباد میں مولوی عبدالحق صاحب سے ملنے کے لیے ایک دن اور ٹھہر گیا تھا کیونکہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ کل انھوں نے مجھے چائے کی دعوت بھی دی تھی۔ ان کی چائے سے فارغ ہوتے ہی میں اور بھائی صاحب گھر آئے۔ سامان عظیم الدین ملازم کے ساتھ تانگے پر سٹیشن بھیجا اور خود موٹر پر پندرہ منٹ بعد روانہ ہوئے۔ میری گاڑی کی روانگی تک بھائی صاحب ٹھہرے رہے۔ سات بجے میری گاڑی چلی تو وہ ایک کمیٹی میں شامل ہونے کے لیے چلے گئے۔

۱۔ حیدر آباد میں ایک خاص وضع کی چھوٹی سی ڈھکنے دار خوبصورت ٹوکری کو بٹی کہتے ہیں جو چنگیر یا دوسری ٹوکریوں کی طرح بنی ہوتی ہے۔

۲۰

رائے سینما ہوٹل، کوئینز روڈ، دہلی

۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء

۷ اور ۸ ستمبر کو میں نے بھوپال سے ایک خط اور ایک کارڈ ڈاک میں ڈالا تھا۔ ۹ ستمبر کو صبح چار بجے میں آگرے پہنچا۔ میں نے بھوپال سے لکھا تھا کہ آگرے میں صرف دو دن ٹھہروں گا مگر کوشش میں نے یہ کی کہ جس صبح آگرے پہنچا ہوں اسی سہ پہر کو دہلی روانہ ہو جاؤں۔ چنانچہ غالب کی جائے پیدائش دیکھی اور اس کی تصویر کا انتظام کیا۔ بعض تاریخی تصویروں کے لیے (جو بعد میں آئیں گی) محکمۂ آثار قدیمہ میں آٹھ روپے پانچ آنے جمع کرائے اور اس محکمے کے افسر خان بہادر ظفر حسن سے ملاقات کی۔ بعض ہندوؤں سے بھی ملاقاتیں کیں چنانچہ ڈاکٹر سرن شنکر نے غالب کی ننھیال کے حالات کی تفتیش کا وعدہ کیا۔ غالب کے مکان کی تصویر بھی انھی کے توسط سے بعد میں آئے گی (ہاں بھوپال سے بھی ایک فوٹوگرافر بنام محمد سراج الدین غالب کے پیالے کا فوٹو بھیجیں گے)۔ خیر اس قسم کے کام ختم کر کے میں نے چاہا کہ شام کو پانچ بجے روانہ ہو کر کل کی رات ساڑھے آٹھ بجے دہلی پہنچ جاؤں۔ لوگوں نے کہا بھی کہ ایک رات آگرے میں ٹھہر کر چاندنی میں "تاج محل" دیکھتے جاؤ مگر میں نے ہر شخص کو ٹال دیا۔ اس کوشش کے باوجود آغا محمد طاہر فاروقی پروفیسر "آگرہ کالج" نے میری دعوت کر دی اور مجھے ٹھہرنا ہی پڑا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم (یعنی اُس دن دہلی بھی روانہ نہ ہوا اور "تاج محل" بھی چاندنی میں نہ دیکھا)۔ خیر دعوت سے فارغ ہو کر ہوٹل پہنچا اور سامان وغیرہ باندھ کر ساڑھے گیارہ بجے سو گیا۔ ساڑھے تین بجے اٹھا اور ساڑھے چار بجے کی گاڑی سے روانہ ہو کر صبح ساڑھے آٹھ بجے دہلی پہنچ گیا۔ اس

لحاظ سے میں اپنے اندازے سے ایک دن پہلے دہلی پہنچ گیا ہوں اور اب یہ ممکن ہے کہ میں ۱۴ ستمبر کے بجائے ۱۳ ستمبر کو واپس گھر پہنچ جاؤں۔ لیکن قطعی طور پر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں ۱۳ ستمبر کو پہنچ رہا ہوں یا نہیں میرے کل کے کارڈ کا انتظار کیجئے۔ کل شام جو کارڈ میں ڈاک میں ڈالوں گا وہ پرسوں یعنی ۱۲ ستمبر (پیر) کو دو بجے کی ڈاک سے آپ کو مل جانا چاہیے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں دوسری صبح کو آ رہا ہوں یا نہیں۔ میں فرنٹیر میل یا بعد کی گاڑی سے پہنچوں گا۔

آج یہاں پہنچتے ہی میں نے اپنے کام ختم کرنے کی بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مہرولی روانہ ہوگیا تاکہ خضر مرزا صاحب سے ملوں۔ افسوس کہ اس تیرہ میل کے سفر کے بعد معلوم ہوا کہ خضر صاحب دہلی میں ہیں اور دو دن بعد حج کو روانہ ہوں گے۔ اب کل صبح صبح ان سے اور بقاؔ بیگم سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔

آگرے میں آپ کا خط اور کارڈ مل گیا تھا مگر اس وقت جواب لکھنے کی ذرا بھی فرصت نہیں۔

ضمیمہ ج

کتاب (مرقعِ غالب) کے لیے یادداشتیں[1]

۱۔	بادشاہ کی Autocracy۔ بادشاہ اور فنون و ادب	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۱۰
۲۔	بادشاہ صوفیہ سے مرعوب تھے	(لاہور، ۱۹۶۱)	۳۱۱
۳۔	بادشاہ کے سامنے نذر کا دستور۔ تفریحات (شکار، مرغ بازی، ...)۔ صابن یا بیسن	(کرم آباد، ۱۹۳۷)	۳۱۳
۴۔	بیسن اور کھلّی	(دہلی، ۱۹۴۷)	۳۱۵
۵۔	بٹیربازی	(لاہور، ۱۹۵۱)	۳۱۵
۶۔	لباس	(لاہور، ۱۹۵۱)	۳۱۶
۷۔	مسالک الابصار فی ممالک الامصار	(لاہور، ۱۹۵۱)	۳۱۸
۸۔	غالب کی زرپرستی۔ گنبد اور مینار کی بحث	(کرم آباد، ۱۹۳۷)	۳۲۰
۹۔	طوائفیں	(دہلی، ۱۹۳۸)	۳۲۱

۱۔ یہ ان یادداشتوں کا کچھ حصہ ہے جو اشارات کی شکل میں دو کاپیوں بعنوان "دہلی" اور "غالب" (جن کے اندراجات نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۷ سے شروع ہو کر ستمبر ۱۹۷۳ تک چلتے ہیں) کے علاوہ چند اور چھوٹی کاپیوں اور الگ الگ اوراق، تصاویر، نقشوں اور تراشوں پر مشتمل ہیں۔

۱۰۔	دورِ زوال اور فنونِ لطیفہ۔ طوائفیں	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۲۴
۱۱۔	منقول از قصۂ عشق افزا از فراسو	(لاہور، ۱۹۵۱)	۳۲۵
۱۲۔	شہر علی مردان خاں	(کیمبرج، ۱۹۵۲)	۳۲۹
۱۳۔	The Mind & Death of a Genius (اشارات)	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۳۰
۱۴۔	جوہر قابل۔ Otto Weininger on Genius	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۳۳
۱۵۔	کتاب "The Approach to Painting" سے اشارات	(باغ سر، ۱۹۵۰)	۳۳۵
۱۶۔	ماحول سے انفرادی جوہرِ قابل کا تعلق	(لاہور، ۱۹۵۵)	۳۳۶
۱۷۔	Genius (اشارات)	(لاہور، ۱۹۷۳)	۳۳۷
۱۸۔	تحقیق طلب امور	(کرم آباد، ۱۹۳۷)	۳۳۸
۱۹۔	Memoranda of pictures, maps etc.	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۴۰
۲۰۔	تصویروں، نقشوں وغیرہ کے متعلق یادداشتیں	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۴۱
۲۱۔	تصویروں، نقشوں وغیرہ کے متعلق یادداشتیں	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۴۲
۲۲۔	درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں لوہارو والوں کی قبریں	(دہلی، ۱۹۳۸)	۳۴۳
۲۳۔	Residents and Agents at Delhi	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۴۴
۲۴۔	The Metcalfes of Delhi	(دہلی، ۱۹۳۸)	۳۴۶
۲۵۔	British Vandalism	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۴۷
۲۶۔	Political Breaches of Faith	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۴۸

۲۷۔ مجاہدۂ دہلی	(دہلی، ۱۹۳۸)	۳۵۰
۲۸۔ مولوی رجب علی	(دہلی، ۱۹۳۸)	۳۵۲
۲۹۔ ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری	(دہلی، ۱۹۳۸)	۳۵۵
۳۰۔ مسلمانانِ دہلی کا قتلِ عام	(لاہور، ۱۹۷۳)	۳۵۶
۳۱۔ ۱۸۵۷ کی جنگ	(لاہور، ۱۹۷۳)	۳۵۸
۳۲۔ ۱۸۵۷ کی جنگ کے بعد شعر و سخن کی حالت	(لاہور، ۱۹۷۳)	۳۵۹
۳۳۔ Books to be consulted	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۶۰
۳۴۔ غالب کی مختلف غزلیات کی تاریخِ تحریر	(لاہور، ۱۹۳۷)	۳۶۱
۳۵۔ گلشنِ بے خار	(کیمبرج، ۱۹۵۲)	۳۶۳
۳۶۔ گلشنِ بے خار	(لندن، ۱۹۵۳)	۳۶۵
۳۷۔ نسخۂ شیرانی	(لاہور، ۱۹۶۹)	۳۶۶
۳۸۔ قلمی دیوان غالب۔ نسخۂ لاہور	(لاہور، ۱۹۶۹)	۳۷۱
۳۹۔ ۱۹۳۸ کی یادداشت	(لاہور، ۱۹۳۸)	۳۷۵
۴۰۔ احمد علی خاں اور ہاجرہ مسرور کے نام خط سے اقتباس	(لاہور ۱۹۶۹)	۳۷۸

لاہور ۔ ۱۹۳۷

بادشاہ کی Autocracy

۱۔ بادشاہ source of beneficial activities بھی تھا۔ مثلاً پبلک اگر شعرا کی سرپرستی (جدید حالات کے مطابق) کرنے سے محروم تھی تو بادشاہ خود شعرا کی دولت و ثروت کا کفیل تھا اور ہزاروں اشرفیاں لٹاتا تھا۔

بادشاہ اور فنون و ادب

۱۔ خود فردوسی کا پورا "شاہ نامہ" کسی نہ کسی طرح ۳۵ برس تک دربار سے متعلق رہا۔ پہلے ابو منصور اور پھر محمود اس کے سرپرست۔

اس کے علاوہ محمود کے دربار میں شاہ نامہ لکھنے کی تحریک موجود تھی۔ چنانچہ فردوسی کی آمد سے پہلے محمود نے سات شاعر اس کام پر مامور کر رکھے تھے۔
شعرا العجم، حصہ اول، ص ۹۱۔

کنوں عمر نزدیکِ ہشتاد شد　　امیدم بہ یکبارہ برباد شد

لاہور ۔ ۱۹ اگست ۱۹۶۱

بادشاہ صوفیہ سے مرعوب تھے

بادشاہوں پر صوفیہ کا اخلاقی دباؤ / اثر

حسب ذیل حوالہ جات مولوی عبدالحق صاحب مرحوم و مغفور[1] کی کتاب "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" سے ماخوذ ہیں:
(کتاب سرکاری ترقی اردو بورڈ' لاہور' سے بذریعہ سید امتیاز علی تاج مستعار لی۔)

۱۔ حضرت شیخ بوعلی قلندر پانی پتی۔ علاؤالدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کیا تو شیخ بوعلی کی ناراضی سے ڈرتا تھا۔ (ص ۱۰۔۹)۔

۲۔ سلطان الاولیا شیخ نظام الدین۔ کسی بادشاہ کے دربار میں حاضر نہ ہوتے تھے۔ (ص ۱۱)۔

۳۔ بادشاہ فقرا کی تکریم کرتے تھے :

فیروزشاہ بہمنی کو جب حضرت گیسودراز کے دہلی سے حسن آباد' گلبرگہ آنے کی اطلاع ہوئی تو تمام ارکان و امرائے دولت اور اپنی اولاد کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا۔ (ص ۱۵)۔

صوفیہ کی علاقہ وار Jurisdiction کی تنظیم

۱۔ شیخ سراج الدین عثمان کو خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی نے بنگالہ جانے کا حکم دیا۔ "تم اوپر' وہ تل" کا قصہ مذکورہ مولوی عبدالحق۔ (ص ۱۲۔۱۳)۔

۲۔ حضرت برہان الدین غریب کو سلطان المشائخ نے دکن جانے کا حکم دیا۔ (ص ۱۴)۔

۱۔ یہ صفحہ ۱۹ اگست ۱۹۶۱ کی شام کو شروع کیا۔ مولوی صاحب کا انتقال ۱۶ اگست کو کراچی میں ہوا۔



دربار اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۵ (عجائب گھر دہلی)

مجسمے میں انگریز Thomas Metclepe بھی

کرم آباد ۔ ۱۹۳۷

بادشاہ کے سامنے نذر کا دستور اور نذر کی اہمیت و مفہوم' Knighton's Eastern King and Queen pp. 13-14.

اسی کتاب میں تفریحات کے سلسلے میں دیکھو' Chapters III VII X XI شکار' عقاب' شیر اور گھوڑے کی لڑائی' مرغ بازی' بٹیربازی (مرغ بازی کا بیان ص ۱۳۸-۳۹ پر قابلِ ترجمہ ہے)۔

(اگر یہ تفریحات ذلیل ہیں تو شیکسپیئر کے انگلستان کی تفریحات bear-baiting - کتوں اور عقاب سے شکار وغیرہ بھی ذلیل تھیں)۔

(اگر اس سلسلے میں کلکتے کی تصویر Col. Mordaunt's cock-fighting party دے دی جائے تو دل چسپ معلوم ہوگی)۔

(ا) جس جس قسم کے جانور لڑائی کے لیے رکھے جاتے تھے' ان سب کی تفصیل دی جائے۔ (ص ۱۶۲-۱۶۱)۔

(ب) ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے برطانی کمانڈر ان چیف' ریذیڈنٹ وغیرہ بھی آتے تھے (ص ۱۶۷) اور پھر ان پر محویت کا عالم (ص ۱۶۹)۔

(ج) مزید تفریحات کی فہرست Appendix میں ص ۲۰۹ پر۔

(نیز اس خیال کی تشریح کہ یہ تفریحات کون سی نفسیاتی ضرورت پوری کرتی تھیں' اسی صفحے پر موجود ہے۔

نیز یہ کہ عورتیں بھی پتنگ اڑاتی تھیں ۔ ص ۲۱۰ بھی دیکھو)۔

(د) عقاب بازی ص ۲۱۱' ص ۲۱۲ (علی نقی خاں بہادر کے عقاب)۔

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .



سواری اکبر شاہ ثانی، دہلی

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

(ھ) صابن یا بیسن ص ۲۳۹۔
(د) ملکہ (امجد علی شاہ کی) کھانا کس طرح کھاتی تھی۔ (ص ۲۳۸، ۲۴۱)۔

دہلی۔ ۹ جنوری ۱۹۴۷

"ذکرِ میر" کے مشہور لطائف میں بھی بیسن اور کھلّی کا ذکر ہے۔ یہ لطائف سید مسعود حسن رضوی کے ایک مضمون کے مسودے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو عنقریب رسالہ "آج کل" میں چھپے گا۔

بٹیربازی

مسلم ایجوکیشنل کانگریس (بعد میں کانفرنس) کے اجلاس لکھنؤ منعقدہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷۔
شب کے کھانے کے بعد بارہ دری قیصر باغ میں سرسید نے اس موضوع پر تقریر کی "مسلمانوں کو من حیث القوم انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں؟"

"حاضرین میں سے متعدد نواب زادوں کے ہاتھوں میں تین خانے کی کابک لٹکی ہوئی تھی، جن پر سرخ ٹول منڈھی ہوئی تھی اور ہر خانے میں ایک بٹیر تھی اور ایک ایک بٹیر ہاتھ میں جس کو وہ لڑانے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اور اسی حالت میں جھوم جھوم کر نعرۂ تحسین بھی بلند کر رہے تھے"۔

یادِ ایام
مصنفہ مولوی عبدالرزاق کانپوری، ص ۴۰

لاہور ۔ ۱۹۵۱ (؟)

لباس

مولوی عبد الرزاق کانپوری' یادِ ایام (صفحہ ۶۶) میں ۲۷ دسمبر ۱۸۸۷ کے جلسہ ایجوکیشنل کانفرنس میں شامل ہونے والے حضرات کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں (یہ جلسہ بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں ہوا):

> "عموماً" مخمل یا جامہ وار کی زریں یا سادہ اچکنیں پہنے ہیں۔ سر پر گول چوگوشیہ یا دوپلّی ٹوپیاں ہیں۔ کاندھوں پر شالی رومال پڑے ہوئے ہیں۔ اور زرد مخمل کے جوتے پاؤں میں۔ بعض علما اور کہن سال بزرگ اونچی ایڑی کے کفش بھی پہنے ہیں۔"



دربار اکبر شاہ ثانی (عجائب گھر دہلی)



ماہی مراتب (عجائب گھر، دہلی)

لاہور ۔ ۱۹۵۱ (؟)

مسالک الابصار فی ممالک الامصار
(شہاب الدین العمری) کا انگریزی ترجمہ

(I. C. Lib. 910 SP 4M)
(Al Umari کا زمانہ ۱۳۰۱ سے ۱۳۴۸ تک کا ہے۔)

ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے عروج کا ایک سبب (ص ۷):

The Mongols by destroying the seats of Muslim culture, civilization and learning in Central Asia rendered an indirect service to India. Princes, soldiers, saints and philosophers dislodged from their homes found a refuge in India (لیکن ان لوگوں کے ناموں کی مثالیں ہونی چاہئیں) **which was comparatively immune from Mongol peril. Thus the cream of Muslim society was to be found in India in the thirteenth and fourteenth centuries.**

محمد تغلق کی سلطنت کے ۲۳ صوبے تھے۔ (ص ۹)۔
صاحب "مسالک الابصار" ہندوستان کے مال و دولت کی تعریف کرتا ہے۔ (ص ۱۰)۔
حاشیے میں بابر کا اسی قسم کا بیان نقل ہے۔ (ص ۱۱)۔
تحفتہ الالباب از محمد بن عبد الرحیم کی یہ عبارت ہندوستان کے متعلق نقل ہوئی ہے (ص ۱۱):
. . . constant convenience of life and security on account of which there is no fear in the country of India and China. (country کا یہ تصور قابل غور ہے۔)

نوٹ: دہلی شہر کا نقشہ دینے کے علاوہ یہ بتایا جائے کہ شہر کی تقسیم باشندوں میں کس طرح ہوتی تھی: مثلاً شرفا، امرا، بساطی، تنبولی وغیرہ، طوائفیں، یہ سب طبقے کہاں کہاں بستے

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

تھے۔ "مسالک الابصار" ص ۱۹ کے حاشیے پر نوٹ ۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ (دولت آباد کی طرح، ص ۱۸) شام کے شہر ایک خاص نقشے کے مطابق تعمیر ہوئے تھے۔

ہندوستان کے عام landscape کا نقشہ: On the banks of the rivers are villages and cities and dense trees and verdant meadows (p.20)

پھل: اُس زمانے کے ہندوستانی پھلوں کی تفصیل ص ۲۰ کے آخری پیراگراف میں ہے۔ سبزی، جلانے کا تیل ص ۲۱ پر۔

دلی شہر کی تاریخ: اندر پرست - سیری (علاء الدین) - تغلق آباد (غیاث الدین تغلق) - جہاں پناہ (محمد بن تغلق) - (ص ۲۳)۔

بادشاہ کی حیثیت داتا کی تھی۔ زر و جواہر، گھوڑے۔ خلعت ساز بیٹھے رہتے تھے۔ (ص ۲۹-۳۰)۔

محمد بن تغلق کے عہد میں بھی پان (سپاری چونا) تواضع کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ (ص ۵۲-۵۳)۔

گڑ اور قند کا الگ الگ ذکر ہے (اجناس کے بھاؤ کے سلسلے میں)۔ (ص ۵۸)۔

لباس کا حال ہے۔ (ص ۵۹)۔

کرم آباد ۔ ۱۹۳۷

غالب کی زر پرستی

اسی برس کا بوڑھا فردوسی اگر قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بھی ساٹھ ہزار روپے کو ناکافی سمجھ کر آہیں بھرتا تھا تو تیس برس کا غالب اپنی پنشن کی حریصانہ طلب میں کیوں ذلیل قرار دیا جائے۔ (ص ۹۸۔۹۹، شعرا العجم، جلد اول)۔

گنبد اور مینار کی بحث
کے متعلق جو کچھ نیچے لکھا گیا ہے اس کے لیے دیکھو فرگسن کی
History of Indian & Eastern Architecture Vol. I

بدھ مت کے دورِ تعمیرات (اشوک اور اس کے بعد) سے "مینار" اور "گنبد" کا رواج ہندوستانی تعمیرات میں چلا آتا ہے۔

(الف) مینار کا مقصد

۱۔ اشوک کی لاٹیں بدھ مت کے اصول اور نیکی کی تلقین کے کتبوں کے حامل تھے۔ (نیز stupas کے سامنے یا متصل ایک یا دو لاٹیں کھڑی کی جاتی تھیں، جیسے اب مسجدوں کے ساتھ مینار)۔

۲۔ سمدر گپت نے شاہانہ شان و شوکت کے اظہار کے لیے لاٹیں نصب کرائیں۔

(ب) گنبد کا مقصد

۱۔ stupas میں دراصل relics رکھے جاتے تھے۔ کچھ تورانی sepulchral tumulus سے اثر لیا گیا۔ اگرچہ وہ نوکیلے ہوتے تھے اور یہ گول (جیسے مثلاً سانچی کا مشہور stupa بھیلسا کے پاس)۔ چنانچہ مسلمانوں کے مقبروں کے بھی گنبد ہی بنے۔ بہرحال ہندوستان میں گنبد کا اولیں استعمال بطور کسی مقدس چیز کے receptacle کے ہے۔

۲۔ بعد میں relics ہوں نہ ہوں، خالی shrine ہی گنبد دار بنائے جاتے تھے۔

دہلی ۔ ۱۷ جولائی ۱۹۳۸

طوائفیں

۱۔ قدم شریف میں ایک قبر ہے جس کی لوح پر یہ عبارت کندہ ہے (آج ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ کو گیارہ بجے صبح دیکھی):

اللہ اکبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بتاریخ ۲۸ ذیقعدہ ۱۳۰۸ ہجری یوم سہ شنبہ کو

مناجان لکھنوی نے دنیا سے انتقال کیا اللہ بخشے

اسی طرح ایک اور تازہ قبر:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

حمیدا عرف مدوپانی پت والی عمر اکیس سال

بتاریخ (۲۳) رمضان ۱۳۴۶ھ جمعۃ الوداع وقت

نو بج کر پانچ منٹ پر اس دارِ فانی سے رخصت ہوئیں۔

ہفتہ کی صبح کو گیارہ بجے دفن ہوئیں۔ یہ لوح

برائے فاتحہ نصب کی گئی۔

۲۔ ہارڈنگ لائبریری

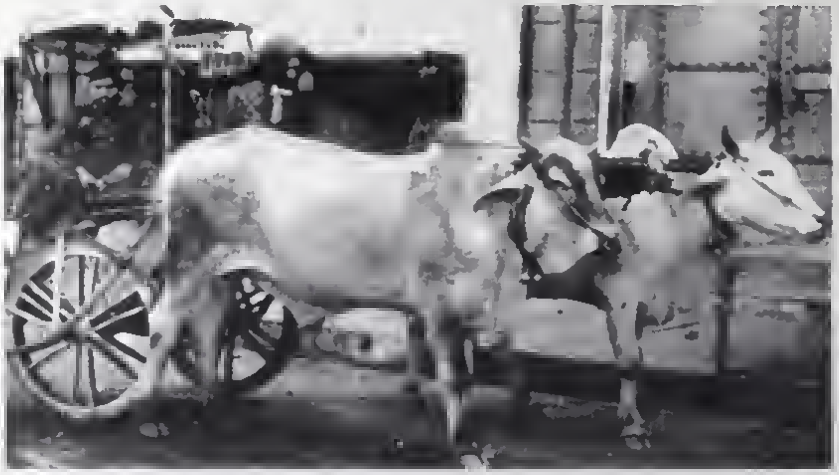
انشاء مومن خاں مؤلف احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر (مطبوعہ ۱۲۷۱ھ) کے

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

ص ۹۶-۱۰۵ پر نامہ لبریز گلہ ناز بیجا بنام مطربہ ماہ جبینی زہرہ نوا کے خط میں ایک جگہ یہ عبارت آتی ہے:

"ای انصاف دشمن ناسپاس' ای سخن ناشنو حق ناشناس' ای درشتی پسند ست پیماں' ای وعدہ ہا وفانکردہ نیز پشیماں' ای ستم آموز سپہر ستم شعار۔ ای گرای اوستاد گردشِ روزگار' ای سفلہ پرور ہوس نواز' ای بے نیاز لطف خداوند بے نیاز۔ ای برق خرمن سوز بے حاصلاں۔ ای شعلۂ جگر گداز بیدلاں' ای زبازپرسِ روزِ جزا بے پروانشستہ' ای برقتلِ مومنِ بیگناہ کمرِ چست بستہ۔ ای خواری پسندِ عزیزاں' ای اسیرِ بندِ بے تمیزاں . . . ای دشمنِ جانم' ای آفتِ ایمانم' ای دلم بتاراج بردہ' ای کارم بہ ہلاک سپردہ' ای بصد ملال در سرم ہوائے تو' ای نیم جانِ ناتوانم فدائے تو! آخر تا کجا بہ آتشِ جدائی سوزم و با دردِ تنہائی سازم۔"





دہلی کی پرانی گاڑیوں کی تصویریں

لاہور ۔ ۱۹۳۷

دورِ زوال اور فنونِ لطیفہ

دورِ زوال میں فنونِ لطیفہ کا ظہور

(ا) ڈراما کا ظہور سولھویں صدی کے انگلستان میں۔
(اسی مثال پر دوسرے فنون کا بھی ظہور)۔

Shakespeare – Raleigh p. 98

ایک طرف مرتّب و منظّم تہذیب سے براہِ راست تعلق، دوسری طرف ایک قوی discontent کیونکہ قوم کے مختلف اداروں میں disruption باعثِ پریشانی و تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ فلسفہ، شاعری اور نئے مذہب کا ظہور ایسی ہی فضا میں ہوتا ہے۔ تینوں کی پیدائش کی وجہ : critical faculty کی تیزی۔

(ا) زبان

طوائفیں

۱۔ انگریز امرا کے سامنے بھی ناچ ہو سکتا تھا۔ مثلاً لارڈ آکلنڈ کے سامنے۔
(Up the Country – Emily Eden pp.)

۲۔ ملکۂ انگلستان نے رنجیت سنگھ کی طوائف کے بیٹے کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی تأمّل نہ کیا۔ دیکھو Knighton's Eastern King & Queen p. 73

لاہور ۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۵۱

منقول از قصّۂ عشق افزا از فراسو
(مخطوطہ مملوکہ ڈاکٹر محمد باقر)
ورق ۱۱ ب تا ورق ۱۵ ب

نوٹ : مخطوطے کا کاتب جاہل سا معلوم ہوتا ہے، اس لیے جگہ جگہ غلطیاں ہیں۔ مثلاً پختہ گلزار، بجائے تختۂ گلزار اور جیسے بجائے جس پہ۔

شہر دہلی یوں ہے ہندوستان میں — جیسے ہو رنگیں چمن بستان میں
اس کا اس رونق پہ ہر بازار ہے — جیوں نمود اک تختۂ گلزار ہے
بیچ میں بازار کے اک نہر ہے — آبِ کوثر کی سی جس میں لہر ہے
یوں کناروں پر شجر ہیں سایہ دار — جن کے اوپر کیجے طوبیٰ کو نثار — چاندنی چوک
مالنیں سب ان درختوں کے تلے — بیٹھی ہیں پھولوں کے ہاروں کو لیے
کوئی کہتی ہے گندھے کیا ہار ہیں — موتیا کے پھول خوشبودار ہیں
کوئی کہتی ہے بتیلی پر دکھا — لو یہ طرۂ موگرے کے پھول کا
کوئی کہتی ہے یہ بدّی خوب ہے — دلرا اور چنبا کلی محبوب ہے
ہنس کے جیوں گل چہل کرتے ہیں سبھی — تا کسی دل کو نہ ہووے بے کلی
جوہری بازار پر کیا نور ہے — ہر دکاں مانندِ کوہِ طور ہے — جوہری بازار
جوہری بیٹھے ہیں دوکاں پر مدام — پرکھیں ہیں انسان کے جوہر تمام
زیبِ تن کرکے مکلّف سب لباس — بیٹھے رہتے ہیں خوشی (سے) پاس پاس
جیغہ ہائے بے بہا سر پر دھرے — لعل اور الماس ہیں جن پر جڑے
چمکے یوں بازو پہ ان کے نورتن — ابر میں جیوں چمکے سورج کی کرن
بیٹھے دوکانوں پہ انساں نوجواں — سب کو دکھلاتے ہیں حسن و ناز واں
ہے کسی کا نام ہیرا لعل واں — کوئی چنی لعل ہے ان میں میاں

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

جابجا بیٹھے ہوئے صرّاف ہیں — وہ بھی اپنے کام میں حرّاف ہیں
ایک جانب اشرفی کا ڈھیر ہے — جس کے دیکھے سے طبیعت سیر ہے
اور روپوں کا اک طرف انبار ہے — جس کا جلوہ گرمیٔ بازار ہے
پیسے کو دے کے نہیں ہرگز کمی — اپنے گھر کنگال بھی واں ہے غنی
اور بزازوں کا کروں میں کیا بیاں — بسکہ دوکانوں پہ ہے جلوہ کناں (ہیں؟)
طاش و کمخواب و تمامی بادلا — لاہے شبنم ململ اور پچتو لیا

یہاں تصویر کے لیے جگہ چھوڑی ہے۔

تصویر در صفت جوہری بازار — و بہ نہر فیض بہ شکل تمامی

اہل فرقہ شہر

سب دوکانوں پر دھرا ہے جابجا — صحنِ دوکاں ہورہا ہے جگ مگا
چاندنی چوک اس کے ہے درمیان میں — خوب ہے اپنی ادا و آن میں — بازاراور
ہووے ہے وقتِ سہ پہری جس گھڑی — آگے ہوتی ہے وہاں خلقت کھڑی — دوکانیں
اس جگہ جو ہے پراچہ کی دوکاں — بیچتے ہیں ٹوپیاں اور دولسیاں
وہ پڑے بٹوے تمامی طاش کے — ہاتھ میں دلبر کے ہوویں کاش کے — (اصل عبارت وہ پری)
اور کوئی بیٹھا کہیں حسبِ صلاح — بیچتا ہے رکھ کے دوکاں پر سلاح — لیکن کی بجائے کے
بیٹھے ہیں ہر جا بساطی بانشاط — کہتے ہیں اپنی یہی ہے کچھ بساط — کتاب میں عام ہے
بیٹھے رہتے ہیں جدھر چتے فروش — چین کے بازار کا رہتا ہے جوش — اور ر بجائے ڑ
ہے کہیں پکتا کباب اور شیرمال — جس سے دل مے نوش کا ہووے بحال
اوڑھ برقع آتیاں مغلانیاں — تا کہیں جاویں نہ وہ پہچانیاں — (او ہر برقہ)
کرتیاں انگیاں کشیدے کی وکھا — لیتی ہیں ہر ایک کے دل کو لگا — (گا؟لبھا؟)

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .



دہلی (؟) کا ایک منظر



ایک اور منظر

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

سقے کہتے ہیں کٹوروں کو بجا	ٹھنڈا پانی ہے ہر دریاؤ کا	
خوانچہ والے پھرے ہیں سو بسو	اپنی اپنی وضع کی کر گفتگو	
کوئی کہتا ہے کہ خاصہ سیب ہیں	حادثے سے غم کے بے آسیب ہیں	پھلوں کے نام
کوئی بیچے فالسہ اور رنترے	ہے کھڑا کوئی کسی کو یی لگی	(کونے لگے؟)
کوئی مٹھی بیچتا ہے راہ راہ	کوئی کم رکھتا ہے ان باتوں کی چاہ	(میٹھے؟)
کیا شریفہ خوب اور انگور ہیں	شربتِ شیریں سے سب معمور ہیں	
ناشپاتی ہے بہی ہے اور انار	عام ہے جامن کے اوپر بھی بہار	
اک طرف کیلے اکیلے ہیں دھرے	ایک سو آڑو چنگیری میں پھرے	
ہے غرض بازار پر یہ آب و رنگ	دیکھ کر جس کو چمن ہو جائے دنگ	

(یہاں جامع مسجد کی تعریف میں چودہ شعر ہیں۔ پانچواں شعر قابلِ غور ہے)

خوشنما ہیں اس قدر مینار چار	کہکشاں جیوں چرخ پر پیدا ہوا	چارمینار
اک طرف مسجد کے ہے پاکیزہ جا	جس میں ہے موئے شریفِ انبیا	زیارتیں
گر گنہ سے پُر ہو کوئی بال بال	صدق سے جاکر کریں واں عرضِ حال	
پھر نہ رہویں ایک مو اس کے گناہ	سرخرو ہوویں وہیں روئے سیاہ	
اس قدر لاکھوں زیارت ہیں وہاں	مجرم اس جا جائے بخشا بیگماں	

(پھر لال قلعے کے ذکر میں یوں آغاز کیا ہے : ہے لبِ دریا اوپر جو لال قلعہ۔ مگر جلد ہی دوسرے مضامین چنانچہ چوتھا شعر الخ)

جو بنا دریا کا رنگیں گھاٹ ہے	روضۂ جنت سے وہ کب گھاٹ ہے	
غسل کو آتی ہیں واں کھترانیاں	کھول کھول انگیا وہ کچھ دکھلاتیاں	ہندو عورتوں
جب نہاتی ہیں وہ پانی میں اُتر	دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہے قمر	کا اشنان
الغرض جو سیر کو جاتا وہاں	واں سے آتا ہے وہ ہو کر نیم جاں	

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

اب کہاں تک شہر کی کیجے ثنا ہے مرقع وہ مگر تصویر کا
جو حویلی اس میں ہے سو خوب ہے طرح اس کی دل کو حد مرغوب ہے
دل کو لگتی ہیں نہایت پیاریاں جالیاں مرمر کی اور گل کاریاں
روز جن گلیوں میں کرتے سیر ہم تھیں وہ گلیاں غیرتِ باغِ ارم
ہر طرف رہتے ہیں ان میں ماہ وش چھب کو جن کی دیکھ دل کھا جائے غش طوائفیں
حسن پر اپنے ہر اک مغرور ہے ہے پری کوئی تو کوئی حور ہے
کوئی کوچے میں کھڑی ہے دردمند جھانک کر کھڑکی کوئی کرتی ہیں بند (ہے)
کوئی کھولے بال کوٹھے پر کھڑی چاکِ در (سے) کوئی جھانکے ہے پڑی
کوئی بالیکے تئیں دکھلائے ہے جس پہ ہالہ مہ کا صدقے جائے ہے (بالی کے تئیں)
کوئی پردے میں اپنے کو چھپا ٹپا گاتے ہیں برملا

کیمبرج ۔ دسمبر ۱۹۵۲

نہرِ علی مردان خاں

لارڈ لیک ۱۲ ستمبر ۱۸۰۳ کو دہلی میں داخل ہوا۔ ۱۸۱۷ میں انگریزوں نے علی مردان خاں کی نہر کی مرمت شروع کرائی۔ ۱۸۲۱ کے موسمِ گرما میں جب اس نہر کا پانی شہر تک پہنچا تو اہلِ شہر کا ہجوم اس کے استقبال کو نکلا۔

ماخوذ از کتاب

The Picture of India, Vol 1, p.186
(Camb. Univ. Lib. – Gg.19.14)

لاہور ۔ ۱۹۳۷(؟)

The Mind and Death of a Genius
(David Abrahamsen)

The relationship between abnormal brilliance of mind and psychosis:
i) Is it cause and effect?
ii) or propinquity of nature?
iii) or parallel existence of unrelated traits? ضمنی پیداوار؟

Otto Weininger's boyhood:

Intellectually far more mature than his companions he naturally found it difficult to adopt himself to his surroundings and his schoolmates.

. . . His awakening ego made it hard for him to adopt himself socially . . . At school he showed a haughty nature and an addiction to fantasy.

There was a definite aim in his behaviour, however unconscious he may have been of it originally. His actions showed clearly that he never intended to subordinate himself to the laws ruling others.

Otto was moved more by the wish to prove that he could go to extremes than by a real desire to go there. (Self-assertion).

His pronounced critical attitude toward every type of authority probably had its roots in his revolt against the environment of his childhood.

(کیا غالب کے غرور کے لیے آگرے میں اس کے ننھیال کی فضا ساز گار تھی؟)

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

Otto Weininger on duality of an individual's mental life:

"It is easier for the complex man to understand another person when he has within himself simultaneously the nature of that other person and its opposite. Duality is the condition for noticing and understanding."
(Quoted by Abrahamsen on p. 25).

اس کتاب کا باب The City by the River اس لحاظ سے قابلِ دید ہے کہ پورے شہر وی آنا کی معاشرتی، تمدنی اور ذہنی زندگی کا تجزیہ خوب کیا گیا ہے۔

فرائڈ کے متعلق Abrahamsen کا ایک قول (ص ۳۴) :

His assertion that repression of the sexual drive is one of the reasons for human unhappiness caused a turmoil.

انیسویں صدی کے ہندوستان میں sex-repressions کم تھیں، اس لیے وہ ذہنی پیچیدگیاں جن کا نتیجہ ناخوشی اور غم ناکی پر ہوتا ہے بڑی حد تک مفقود تھیں . . .

p. 116:

According to Weininger, thinking and feeling are for a woman identical, for a man separate. Since the woman lacks clarity, she is far more removed from Genius than is the man.

Genius means the most limpid clarity and an ability to distinguish. (In order to understand you must be similar to the object of your understanding, must have some of his nature in yourself). The genius is by definition a man who

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

understands more than the average man does. He is, consequently, more composite, and has a richer psychological content.

Genius is the highest and widest consciousness; universality is its distinguishing mark.

Everything, therefore, means something to the Genius, even if unconsciously. Impressions remain obstinately in his memory, inextinguishable, although he may not have taken the smallest trouble to take note of the perceptions or experiences when they occurred.

p.117:

It is because of his vision of the whole that the genius recognises the existence of the parts. The object of genius is universality. A man may be called a genius when he lives in conscious connection with the whole universe. A man of genius must be conscious of his own ego. Therefore, it may be said that genius itself is an inner imperative. It is a predominantly moral phenomenon . . .

p.136:

"Every man needs to make observations; even the genius is nothing without that power, though he can fill his observations with his own personality and has no need of complete induction to be able to recognise the idea of a thing."

– Weininger

لاہور ۔ ۱۹۳۷ (؟)

Otto Weininger on Genius :

(pages referred to here are the pages of
the German edition of "Sex & Character")

"Genius is a higher type of virility". (p. 141). And (pp. 134-35) : "In order to describe a man one must be similar to him. But in order to create similar activities, one must reproduce the psychological conditions in oneself. By this reasoning, only a thief can understand another thief; an honest man can never understand him . . . To understand a man means being the man.

"The man of genius is he who has a greater comprehension of his fellow men than does the average man. It is said that Goethe said of himself that there was no vice or crime of which he could not trace an inclination in himself. The genius is therefore a more complicated more richly endowed, more varied man. If comprehension of a human being only flickered in him like the light from a faulty candle then he would be unable to kindle the flame of life in his heroes and his creations would be without glow and power. The ideal artistic genius is the man who lives the part of his character who loses himself in his subject in order to reveal himself to the multitude. And so the aim of the philosopher is to discover all personalities within himself to fuse them into a unity which is his own unity."

Several of Weininger's friends thought he suffered from epilepsy "because epilepsy and genius are related".

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

p. 193:

To say that his mind was diseased does not detract from the spirit of his work, since science, art, and poetry may be judged only according to their truth and beauty. As has been said earlier, disease may further, valuable thought.

Another gifted man Auguste Comte spent a year in a hospital for the insane two years before the publication of his Positive Philosophy on which he had worked fourteen years. Beethoven's father was a drunkard, and he himself, even before he acquired his ear disease, became seclusive, frequently changed his residence without cause, and had a tendency to a washing mania.

Weininger's mental conflicts were the source of his fame. They were the means of a constant inner revival as psychologist and writer, as philosopher and man.

L. P. Smith's "Words & Idioms" p. 98:

poets found ideas come in moments

i) of excitement
ii) from a source as it were outside of themselves hence inspiration

باغ سر، آزاد کشمیر ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۰

"When Titian worked for a patrician people rich, proud, brave and beautiful he caught their fire and set before them ideals of noble authority and splendour which they from their own nature would have wished to realise. A picture by Titian is a picture, in part by the Venetians of the cinque-cento. When Poussin planned his classic landscapes so stately, so formal, so luminous and restrained, he reflected the ideals of his people who strove ceaselessly to bend their emotions to the rule of reason. There is in all he painted an unflinching method a homage to form and design a reasoned order a comeliness never extravagant nor lyric that epitomises the spirit of his race. A picture by Poussin is a picture in part by the French of the grand siecle.

"The people's share in the making of a picture is generally more evident even than that of the painter himself. It is as easy to recognise the nationality of a Dutch or an Italian picture as it is to distinguish an Arab from Chinaman. After a little study anyone can separate work done in Florence from work done in Venice and work done in Haarlem from work done barely eighteen miles away, in Leyden . . . It follows that the study of a nations's pictures discloses to an acute observer the beliefs, the aspirations, the social faults and virtues of that nation as they flourished or faded throughout its history."

From the "Introduction" to "The Approach to Painting"
by Thomas Bodkin.

یہ کتاب حیات احمد خاں سے پڑھنے کے لیے ملی۔

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

اسی مذکور الصدر Introduction میں آگے کی یہ عبارت بھی پر معنی ہے :

"The profitable contemplation of pictures in national groups and series is only possible to men who have leisure for much study . . . A great picture is a message of almost inexhaustible import. Its meaning is conveyed not only by its matter but also by its form. It tells us much of what the painter wished to tell and in addition, what manner of man he was, what was his nation, what his generation. A picture has a strange revealing power of its own outside, above and uncontrolled by the painter."

لاہور ۔ ۱۹۵۵(؟)

ماحول سے انفرادی جوہرِ قابل کا تعلق

Herbert Read in Coleridge as Critic (Faber & Faber) (برٹش کونسل لاہور کی لائبریری میں نمبر ۲۴۴۱) observes (p. 15) that Coleridge "was involved" in a revolution of thought "such as only occurs once or twice in a millenium" :

> "Such revolutions do not come about as a result of individual efforts : the individuals are swept along in a current which they least of all men can control. Kant's philosophy is inconceivable without th stimulus of Hume ; Fichte is inconceivable without Kant, and Schelling without Fichte."

لاہور ۔ ۱۹۷۳

A genius copies from his own unconscious; he does not copy other authors.

Explosive inner conflict & disharmony

Genius

عرفان معرفت (ایجاد۔ وجدان)

فرہنگ۔ جوہر

خلاقی۔ جوہرخلاق۔ تخلیقی جوہر۔ جوہر قابل

کشف اور کشاف

اجتہاد

وحی۔ الہام

جوہرِ ذاتی

۱) برگے ز نخلستان فرہنگ من است

۲) باایں فروغ گوہر رخشانی نہاد

کرم آباد ۔ ۱۹۳۷

تحقیق طلب امور

۱ ۔ ("عہدِ حاضر کا سوشل ڈراما" مندرجہ "ہمایوں" بابت دسمبر ۱۹۳۷ کے حوالے سے)
اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ غالب اپنے ماحول سے برسرِپیکار ہے یا نہیں؟

(سوشل ڈراما سے ایسے ناٹک مراد ہیں جو کم وبیش ہر سماجی، مذہبی اور سیاسی نظریے کی تقلید کو اس لیے قابلِ ملامت قرار دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے بیشتر انسانی جذبات اور انسانی امیدوں کا خون ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی کی اصلاح یا تنظیم کے بجائے سوسائٹی کی تخریب اور اس کے انتشار کی رہنمائی کرتے ہیں . . . سوشل ڈراما نگار سماجی تعصبات یا نظریات کے مقابلے میں انسانی جذبات کے احترام پر زور دیتا ہے . . . عہدِ حاضر کے سوشل ڈراما میں کسی فرد کو اپنے ماحول سے برسرِپیکار دکھایا جاتا ہے۔ ماحول سے مراد وہ مجلسی قیود ہیں جن کو توڑنے کی وہ سعی کرتا ہے۔ Elizabethian tragedy میں character اور Greek tragedy میں destiny تباہی کا باعث۔ موجودہ سوشل ڈراما میں معاشرتی ماحول)۔

میری اپنی رائے ہے کہ وہ اپنے ماحول کو قبول کرتا ہے۔ خدا سے اس قسم کی شکایت کہ زندگی بری طرح گزر رہی ہے، معاشرتی ماحول کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ مذہب سے وارستگی کے معاملے میں ماحول کے ایک پہلو سے آویزش کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں ایک پرانی شاعرانہ روایت کی روش غالب کے لیے موجود تھی۔

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

۲ ۔ بھوپال کے قلمی نسخے کے متن میں جو اصلاحیں کی گئی ہیں' ان کی تحریر' اور حاشیے میں جن مزید غزلوں کا اندراج کیا گیا ہے' ان کی تحریر کا خط ایک ہی ہے یا مختلف؟ (اگر ایک ہی ہے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترمیم واضافہ کرنے والے شخص کے پیش نظر' خواہ وہ خود غالب ہی تھا یا کوئی اور' دیوان ریختہ کا کوئی ایسا نسخہ تھا جو ۱۸۲۱ سے تو پہلے مرتّب ہو چکا تھا مگر اس ابتدائی نسخے کے یقیناً بعد مرتّب ہوا تھا جس کی نقل کو حافظ معین الدین نے یکم نومبر ۱۸۲۱ کو ختم کیا تھا۔)

۳ ۔ اس سلسلے میں دیکھنا یہ چاہیے کہ ترمیم واضافہ کے سلسلے میں حاشیے کے اندراجات کس کے ہیں؟

۴ ۔ میاں فوجدار محمد خاں کا زمانہ کون سا ہے؟ ۱۲۴۸ھ کی مہر سے شاید یہ ثابت ہو سکے کہ دیوان پہلی مرتبہ ان کے پاس اس سن میں آیا اور اس لحاظ سے ۱۲۳۷ھ میں ان کے لیے نہیں لکھا گیا تھا۔

۵ ۔ غالب کی دورِ اوّل کی تصویر کشی میں حرکت ہے یا نہیں؟ یعنی یہ تصویریں ساکن اور جامد ہیں یا ان میں اس طرح کا تحرّک ہے جس طرح اس کی دورِ اوّل کے بعد کی تصویر کشی یا قاآنی کی اس تصویر میں ہے جو " نرمک نرمک نسیم زیرِگلاں می خیزد" سے شروع ہوتی ہے۔

لاہور ۔ ۱۹۳۷

Memoranda of pictures, maps etc.

1- The road to the palace passes between the modern St. Stephen's College and a hostel attached to it and then runs between some shops and past the Govt. College (once the Residency) to the "Magazine" or Arsenal, now occupied by the telegraph and post offices. In 1857 the telegraph-office was near the Ridge . . . The post-office is in the old armoury . . . (The Seven Cities of Delhi - Hearn pp. 5-6).

The Magazine or Arsenal is said to have been formed on the site of the palace of Dara Shikoh (p. 138 - ibid).

2- اس کتاب کا Chapter I دلی کا نقشہ بنانے کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔ کتاب کے باقی chapters میں سے بعض اَور حد درجہ مفید ہیں۔

3- Delhi - a city seven miles in circumference
(p. 34 The Tale of the Great Mutiny by W. H. Fitchett-John Murray)

4- Cashmere Gate during the Mutiny - pp. 36-37 ibid
(اس میں کشمیری دروازے کی main-guard ' ramp وغیرہ کا بیان کسی قدر تفصیل سے دیا ہے)۔

لاہور ۔ ۱۹۳۷

تصویروں نقشوں وغیرہ کے متعلق یادداشتیں

نواب شمس الدین کی تصویر

نواب شمس الدین والیِ فیروز پور جھرکا کی تصویر Rambles and Recollections (Sleeman) کے پہلے اڈیشن (۱۸۴۴) کی جلد دوم کے frontispiece کے طور پر دی گئی ہے۔ (سند کے لیے دیکھو Rambles کا اڈیشن مولفہ Vincent G. Smith ص ۴۵۹ حاشیہ ۴)۔ نواب شمس الدین کے نوکر کریم خاں کی تصویر بھی یہیں ہے (نواب کو ۳ اکتوبر ۱۸۳۵ کے دن پھانسی ملی۔ ملاحظہ ہو ایضاً ص ۴۲۰)۔

غالب کا پہلا مکان' دلی میں

نواب شمس الدین کا دلی کا مکان دریا گنج میں تھا (Rambles Smith's Edition p. 464)۔ غالب کا ذاتی مکان جس کی فروخت کا ذکر مکاتیب میں ہے (غالب نے کلکتے جانے سے پہلے اسے فروخت کیا تھا۔ دیکھو ص ؟ کلیات نثر) عجب نہیں کہ دریا گنج میں ہو۔ دلی میں آنے پر غالباً اسے سسرال سے مکان ملا ہوگا اور ممکن ہے کہ الٰہی بخش معروف کا مکان بھی شمس الدین کے مکان کے قریب ہو۔

شمس الدین کا مکان

"The road along the east of the Cantonement Gardens leads to a double-storied house, the residence in 1857 of the Nawab of Jhajjar. Close to this is a turning into the grounds of the Native Infantry Mess-house, once the residence of Shamsuddin Nawab of Ferozpur and afterwards of one Ali Baksh Khan, who made garden in the river-bed below. Between the mess-house and the road to the Khairati Gate there is the mosque called Zinat-ul-Masajid built in 1710. . ."
Hearn "Seven Cities of Delhi" p. 163.

لاہور ۔ ۱۹۳۷

تصویروں نقشوں وغیرہ کے متعلق یادداشتیں

(۱) بیدل کا گھر دہلی دروازہ شہر کے باہر تھا:

(الف) مصحفی نے عقدِ ثریا (ص ۱۷) میں کہا ہے کہ بیدل اپنے گھر کے صحن میں دفن ہوا۔

(ب) بیدل کی تربت دہلی دروازہ شہر کے باہر ہے (یہ بیان محمد حسین آزاد کا ہے۔ نگارستان فارس)۔

(۲) بیگم سمرو کے مکان میں آج کل دہلی بنک ہے۔ دیکھو:

Delhi, Past and Present by Fanshawe. p.49

بحوالہ حاشیہ نمبر۱ ص ۵۰۴ Rambles Recollections' Ed : Vincent Smith.

(۳) ہندو راؤ کا مکان دراصل ولیم فریزر نے بنایا تھا اور اسی مکان کو آتے آتے وہ گولی کا شکار ہوا تھا۔ دیکھو ص ۷۰-۷۱ "Seven Cities of Delhi" by Hearn نیز ص ۱۱۹ در "Delhi" by Sharp

(۴) قدم شریف میں نواب شمس الدین والیِ فیروزپور جھرکا کی قبر ہے (فیروز شاہ کے بیٹے فتح خاں کی قبر کے قریب) دیکھو ص ۱۳۲ "Seven Cities of Delhi" by Hearn

(۵) ولیم فریزر کی قبر کرنل سکنر کے گرجا (اندرون کشمیری دروازہ) میں واقع ہے (بڑے سر تھیوفلس مٹکاف کی قبر بھی وہیں ہے) دیکھو "Delhi" by Sharp ص ۱۱۵۔

(۶) راجہ کشن گڑھ کا مکان جہاں فریزر نے قتل کی شام کو کھانا کھایا تھا۔ دیکھو ص ۱۶۴ "Seven Cities of Delhi" : by Hearn

(۷) قلعۂ معلّیٰ کا نقشہ ۱۸۵۷ ع سے پہلے Do . . . p. 160

دہلی ۔ ۱۹۳۸

درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی میں لوہارو والوں کی قبریں

۱۔ مسجد کے جنوبی رخ کی طرف جنوب کو منہ کر کے کھڑے ہوں تو بائیں ہاتھ سے پہلی قبر عارف جان اور دوسری قاسم جان کی ہے۔

۲۔ نواب احمد بخش خاں کی قبر درگاہ کے دروازے کے ساتھ مولانا فخر کی پائنتی کی طرف ہے۔

۳۔ نواب امین الدین، ضیاء الدین، علاء الدین وغیرہ کی قبریں اندر احاطے میں ہیں۔

حسب ذیل تاریخیں مزاراتِ متعلقہ کی لوحوں سے نقل کی گئیں:

۱۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب ۷ شوال ۱۲۳۹ھ بروز یکشنبہ بوقتِ طلوعِ آفتاب رحلت فرمود

۲۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب در ۱۱۷۶ھ بعمر ۶۲ سال رحلت فرمود

۳ ۔ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب (والدِ ماجد حضرت شاہ ولی اللہ) بتاریخ ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ یوم چہارشنبہ بعمر ۷۶ سال وصال یافت

Residents and Agents at Delhi 1803-1857

	Delhi –captured by the British	Sep. 1803
Residents:	i. Colonel (later Sir David) Ochterlony	1803-1806
	ii. Mr. A. Seton (from Bareilly)	1806-1810
	iii. Mr. C. J. Metcalfe (9 years) (transferred to Haiderabad)	1810–Dec. 1818
	iv. Sir D. Ochterlony returned for two years (went to Rajputana)	upto Nov. 1821
	v. Mr. H. Middleton acting charge during the interval.	
Agents to the Governor General:	vi. Mr. A. Ross	May 1822
	vii. Mr. W. Fraser acted as Agent for a few months in 1823 and was succeeded by	
	viii. Mr. C. Elliot then	till Oct. 1825
Resident and Commissioner	ix. Sir C. T. Metcalfe (Sir Charles Metcalfe) with control of Rajputana and the conduct of foreign relations with Kabul and Lahore. In 1827 he was appointed member of the Governor-General's Council.	

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

	x. Sir E. Colebrooke	removed in August 1829
	xi. Mr. William Fraser acted for about six weeks.	
	xii. Mr. F. Hawkins relieved by	till Nov. 1830
	xiii. Mr. B. Martin	till March 1832
Residentship abolished and an Agency again constituted in March 1832 Rajputana made a separate charge	xiv. Mr. W. Fraser when he was murdered at instigation of the Nawab of Ferozpur.	till March 1835
First as Agent to the Governor of Agra: later as Agent to Lieut.Governor of the North-Western Provinces	xv. Mr. T. T. Metcalfe And then	until his death in Nov. 1853
Agent to the Lieut.Governor of the North-Western Provinces and Commissioner at Delhi	xvi. Mr. Simon Fraser	murdered on the 11th May 1857

– from the Preface of the "Punjab Govt. Records" vol I

The Metcalfes of Delhi

– (from "Delhi" by Sharp p. 116)

First baronet (a director
of the Hon. East India Company)

Sir Charles Metcalfe later
Lord Metcalfe
Resident at
Delhi from
1811 to 1819

Sir Thomas Theophilus
(Resident about 1835)

Sir Theophilus John
(Jt. Commissioner at Delhi
at the outbreak of the Mutiny)

لاہور ۔ ۱۹۳۷

British Vandalism

1- The well-known panels of pietra dura including the delineation of Orpheus charming the beasts removed to the South Kensington Museum ; later restored by Lord Curzon. (Delhi by Sharp p.96).

2- Anarkali's tomb & Shah Chiragh's mosque in Lahore.

3- "Taj Mahal for Sale" by Lord Wm. Bentinck.

4- Miss Emily Eden's description of the Jami Masjid says that flights of marble steps went up to the mosque (p.). Where is the marble now when was it removed?

5- Moti Masjid in the Delhi Fort; who removed the domes of copper-guilt referred to by Sharp in his "Delhi" p. 100 (1st 5 lls. of the page)?

See for answer last 6 lls. of p. 14 in Hearn's "Seven Cities of Delhi."

6- The country-house of the Metcalfes at the Kutb consisted of and was built round a tomb. This tomb with relics of the portico of the house still stands.
(See p. 116 "Delhi" by Sharp .)

7- خود مٹکاف ہاؤس محراب مقبرہ علاء الدین میں بنایا گیا تھا ؟
دیکھو

8- اشوک کی ایک لاٹ کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا کسی آئی۔سی۔ایس۔ کے ہاتھ آ گیا۔ اسے وہ سڑکوں کے رولر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ دیکھو فرگسن۔

History of Indian & Eastern Architecture vol. I p.57

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

اسی طرح اسی vol, I کے p. 82 پر ہے:

"Unfortunately many including the largest of these (i. e. mounds or "dibbas" of Buddhistic stupas) containing the most impt. remains have been used as quarries for brick and marble – not by natives only – but by Govt. Public Works engineers the record of whose vandalism in utilising the materials is most deplorable."

اسی قسم کے ایک "ٹبے" کی تخریب کا ذکر ص ۸۳ پر ہے۔ دیکھو پیرا ۱۔

لاہور ۔ ۱۹۳۷

Political Breaches of Faith which led to the Mutiny

1. شاہ عالم سے کیا عہد نامہ ہوا اور اس کے بعد کس طرح بتدریج مغل شہنشاہوں کی طاقت سلب کی گئی تا آنکہ ۱۸۵۶ میں بڑی "عیارانہ سوداگری" سے مرزا جواں بخت کو وراثت سے محروم کر کے بڑے شہزادے سے اقرار لیا گیا کہ وہ بادشاہ کا لقب چھوڑ دے گا اور قطب میں جا کر رہے گا۔ Delhi Residency Records میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

2. Life of an Eastern King (Knighton)

میں سعادت علی خاں (؟) کے ساتھ ایک معاہدے کا ذکر ہے۔



جواں بخت مرزا (عجائب گھر، دہلی)



فخرو مرزا (عجائب گھر، دہلی)

"مجاہدۂ دہلی"

From : Letters written during 1857 to George Carnac Barnes, C.B., Commissioner of the Cis-Sutlej States (in the Delhi, Fort Museum)

Camp Delhi,
29th July

My dear Forsyth,

The whole romance of the Siege of Delhi is comprised in the person of the Old Lady who accompanies this letter.

She had begun to preach a crusade against us in the city, and had excited the minds of all true believers amazingly by her exhortations. At length, digusted with their want of success, she took the field in person, and arrayed in green, mounted on a horse, and wielding a gun and sword, headed a party of horsemen and actually led them against the 75th Foot ! The men declare she was worse than five Sepoys to deal with, and say she shot several of their comrades. At last she was herself wounded and captured. The General wished at first to let her go free, but I begged him not to do so, as she would go into the city triumphant and make much fanatical capital out of her escape from our hands – which she would have represented, of course, as a miraculous interference of Providence ---- and have become a sort of Joan D' Arc !

I obtained permission to send her to you to be kept in safety in your jail or wherever you think best unitl the business here is over.

Will you kindly see to her safe conduct? Strange to say the Old Stag had really obtained great influcnce.

Yours very sincerely,
W.S.R. Hodson

The above is a copy of –
No. 7 – Letter, 29th July, 1857, from Lieut. W.S.R. Hodson to J. Douglas Dorsyth, Deputy Commissioner of Umballa.



(شہزادہ) مرزا سلیم اور کالے صاحب (عجائب گھر، دہلی)



۱۸۵۷ (؟) کی ایک تصویر

مولوی رجب علی

(From the booklet quoted on the previous page)

Camp before Delhi,
August 15. 1857

My dear Barnes,

Maulvi Rujjub Ullee asked me to mention that I was cognizant of the fact of his having written a letter to Hakeem Ahsun Oolah. It was read to me and I considered it could do no harm and might lead the Hakeem to give an insight into the projects of the king and mutineers. The Maulvi says it led to the Hakeem's disgrace having fallen into the hands of the Sepoys who searched his house but that is hardly likely to be true.

pr. 1

It was their (the rebels') intention to send several such detachments out to raise the country but someone said it was a device of the Hakeem's to weaken the force inside Delhi and to betray it into our hands.

— last 4 lls. of pr. 2

From "No. 8 – Letter, 15th August, 1857. from Hervey Greathed, Political Adviser to the Force before Delhi, to George Carnac Barnes, Commissioner, Cis-Sutlej States"

From "The Pb. & Dli. in 1857 by Care-Browne vol. I pp 339-40 (Book in the Dli. Fort Museum)

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

ہاڈسن علاوہ دوسری خدمات کے محکمہ Secret Intelligence کی تنظیم بھی کر رہا تھا۔ مولوی رجب علی اس وقت دہلی کے اندر رہتے تھے۔ کسی زمانے میں ہاڈسن لاہور میں ان سے مل چکا تھا جب وہ سر ہنری لارنس کے کانفیڈنشل میر منشی تھے Hodson at once communicated with him and the old maulvie gave a genial response and with a fidelity and a zeal which it is impossible to over-estimate in that crisis, did this man, . . . daily forward from the very heart of the city – in a quill, a chupattee, a sole of a shoe, the fold of a turban, or the matted hair of a Sikh . . . a slip of paper containing the news of all that was passing in the city which it behoved us to know; and so great was his tact that not a shadow of a suspicion rested upon him. Like the ends of an electric wire were RujJub Ali in the city and Hodson in Camp; through them passed daily the most authentic intelligence of the rebel plans and movements.

Translation of a letter from حکیم احسن اللہ خاں to مولوی رجب علی خاں taken from Appendix A of "The Crisis in the Pb." by Cooper (1858) (Book in the Dli. Fort Museum)

30th July 1857

I give you a piece of advice, do not make any excuses, but hear it. Whatver a kind instructor says to you, receive it. Hakeem Sb., wise as Plato . . . etc. peace be to you. . . . About two months have elapsed that the troops who ate

. . . اگلے صفحے پر جاری . . .

. . . گزشتہ صفحے سے جاری . . .

the salt of the English Govt. . . . came to Delhi, and having raised the dust of tumult and disturbance, got a bad name to his Majesty, the King of Delhi, and having stepped out of their proper sphere, have stood up as competitors of the English Govt. of supreme dignity.

. . . ---- . . .

اس کے بعد مولانا روم کا ایک شعر اس مکھی کے متعلق جو گدھے کے پیشاب میں گھاس کی پتی پر تیر رہی ہے۔ یہی حال باغیوں کا ہے۔ پھر انگریزی گورمنٹ کی طاقت اور . . .

The fact of the Eng. Govt. having assisted the Sultan of Turkey with troops, both in sea and land, and of having protected the Mohdn. empire against Russia . . . are so conspicuous as the light of the meridian sun.

دہلی ۔ ۱۹۳۸

ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری

Hope Grant records that a sentry was found at one of the palace gates dressed and equipped according to regulation, and marching up and down on his beat with his musket on his shoulder. "In a museum at Naples," he adds, "is to be seen the skull and helmet of a man who was found, buried at his post in a sentry-box in the midst of the lava. The inscription states the occupant to have been a 'brave soldier'; but nothing could have been braver or cooler than the conduct of this Sepoy, who must have known that his fate was sealed." Roberts who shared in the rush for the palace gates, adds another curious example of Sepoy courage. They found the recesses in the long passage which led to the palace buildings packed with wounded men, but about thirty yards up the passage stood a Sepoy in the uniform of a grenadier of the 37th Native Infantry. The man stood quietly as the British came along the passage, with his musket on his hip. Then he coolly raised his musket and fired at the advancing party, sending his bullet through the helmet of the leading Englishman. Next, dropping his musket to the level, he charged single-handed down on the entire detachment of the 60th; and was killed! (pp. 332-33)

مرقعِ غالب

لاہور ۔ ۲۷ مئی ۱۹۷۳

مسلمانانِ دہلی کا قتلِ عام
(غدر کے بعد)

مجلس ترقیِ ادب کے کتب خانے میں "شہر آشوب" از ڈاکٹر نعیم احمد (مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۸) کے ص ۲۴ کے حاشیے میں دو حوالے ہیں :

۱۔ انگریز مصنف رابرٹس (؟) کا جس نے لاہوری دروازے سے) یہ کون سی کتاب ہے؟
چاندنی چوک تک گھوڑے پر سوار گزرنے کا خوف ناک منظر دکھایا ہے۔)
یہ ذکر بحوالہ "تاریخِ بغاوتِ ہند" مصنفہ نامعلوم ص ۷۰۷ ہے۔) ۲۷ / ۵ / ۱۹۷۳

(چونکہ انگریز مصنف کی تاریخ کا نام "چہل ویک سالہ" بیان کیا گیا ہے اس لیے ممکن ہے کہ مصنف لارڈ رابرٹس ہو)۔

۲ ۔ اسی مذکورہ بالا کتاب کے ص ۲۵ کے حاشیے میں "قیصر التواریخ" کا ذکر ہے، جس کی جلد دوم ص ۴۵۴ سے یہ اقتباس لیا گیا ہے :

۲۷ ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن تک قتلِ عام رہا۔ اس کا کوئی حساب نہیں۔





۱۸۵۷ کی عظیم جنگ کی تصویریں

لاہور ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۳

۱۸۵۷ کی جنگ

پر جو ایک باب لکھا جائے اس کی بنیاد علاوہ مذکورہ صفحات فوق کتابوں کے حسب ذیل ماخذ پر رکھی جائے :

۱) دستنبو — مرزا اسداللہ خاں غالب

۲) اسبابِ بغاوتِ ہند — سید احمد خاں

۳) داستانِ غدر — ظہیر دہلوی

۴) غدر کے دو روزنامچے — شائع کردہ حسن نظامی

۵) ساورکر[1] کی کتاب جس کا حوالہ مولانا غلام رسول مہر نے کتاب ذیل میں دیا ہے۔

۶) ۱۸۵۷ — مولانا غلام رسول مہر

---

۱ "وناٹک ساورکر"۔ (مہر کی مذکورہ کتاب کے ص ۱۵۳ پر ساورکر کا پورا نام یہ دیا ہے)۔

لاہور ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۳

۱۸۵۷ کے بعد شعرو سخن کی حالت

۱ ۔ حالی نے دیوانِ نواب محمد مصطفیٰ خاں کے لیے ۱۸۶۲ میں جو تقریظ لکھی، اس میں رہ رہ کر اس بات کا ماتم کیا ہے کہ شاعری اب "ناروا" اور "بے اثر" ہے۔ دیکھو ص ۱۳۱، ص ۱۳۲ نصف اول۔ (کتاب کا نمبر P.U.L. میں یہ ہے Api VI 140)

۲ ۔ اسی طرح "مبالغے" اور "جھوٹ" کی تعریف حالی کی زبان سے خصوصیت کے ساتھ معنی خیز ہے۔ دیکھو اسی کتاب کا ص ۱۳۵ (پہلی دو سطریں اور آخری سطر چھوڑ کر)۔ چند ہی سال بعد حالی نئے دور کے ideals سے اس درجہ متاثر ہو چکا تھا کہ پرانی شاعری کے "مبالغے" پر اس نے سب سے زیادہ کاری وار کیا۔
(نوٹ: اس تقریظ کا عنوان یہ ہے "تقریظے کہ خاکسار الطاف حسین حالی در زمان حیات مصنف مغفور بریں دیوان بلاغت عنوان در سال ہزار وہشت صد و دو مسیحی نوشتہ بود"۔ یہ سال ۱۸۵۲ تو ہو نہیں سکتا اس لیے کہ حالی اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ ۱۸۷۲ بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ نواب مصطفیٰ خاں اُس وقت تک انتقال کر چکے تھے ۔ اس لحاظ سے یہ سال یقیناً ۱۸۶۲ ہے۔)

۳ ۔ اسی کتاب میں نواب مصطفیٰ خاں نے اپنی صحیح تر اور بہتر حس تنقید کا ثبوت دیا ہے۔ رقعات سے پہلے جو دیباچہ لکھا ہے اس کے ص ۷ پر اپنے آپ کو اپنے طرز بیان کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں: راست دروغ نما گفتی و صدق کذب مانا ۔ سخن سادہ رنگ آمیز آوردی وبیان واقع شورانگیز۔

۴ ۔ رقعات میں نمبر ۳۷ پر ص ۴۳-۴۴ (بنام غالب) سے دوستوں کے تعلقات کی گرم جوشی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر رقعہ نمبر ۴۰ برص ۴۶-۷ خصوصیت سے قابلِ اقتباس ہے بلکہ تقریباً پورے خط کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ نواب صاحب مارچ ۱۸۳۹ میں دلی سے روانہ ہوئے ۔ جے پور سے بارہ دن بعد (یکم محرم ۱۲۵۵ کو)، اور بڑودے سے غالب کو خط لکھے۔ غالب کا کوئی خط انھیں نہ ملا۔ اگست ۱۸۴۰ میں واپس بمبئی پہنچ کر انھوں نے غالب کو رقعہ نمبر ۴۰ لکھا۔

Books to be consulted :

1- Travels in India–Jean–Baptiste Tavernier
(Translation of the French edition of 1676)
Seen at Rama Krishna's today 10 . 1 . 1938.

2- Mrs. Hasan Ali's book mentioned by Ikram (غالب نامہ p. 42).
According to the Rama Krishna people it is called "Islam in India" and is available in the University & Public Libraries.)

For general discussion

3- The article "Literature and Social Environment" in "The Visva–Bharati Quarterly" (Santiniketan Bengal) for May–July 1938.

(3 books) Mentioned in the notes to Emily Eden's letters

4- Three Days at Delhi – Col. H. A. Newell.
5- The India We Served – Sir Walter Lawrence.
6- Thirty–five Years in the East (1852) John Martin Honigberger برگر.

7- "Delhi" (H. Sharp) A good book for some historical and architectural aspects.

Imp

8- List of books given in the Appendix to "Seven Cities of Delhi" by Hearn

Both books (below) in the Hardinge Library Delhi

9- The Private Life of an Eastern King (William Knighton)
10- ---------- " ---------- Queen (----- Do -----)

11- Observations on the Musulmans of India–Mrs. Meer Hasan Ali.
12- Mughal Administration (Sarkar)
13- Later Mughals (Irvine)
14- History of the Mutiny – Kaye and Malleson
15- History of Our Own Times – Justin McCarthy

اس شخص نے "غدر" کو ہندوستانیوں کی جد و جہدِ آزادی کے طور پر دیکھا ہے۔

لاہور ۔ ۱۹۳۷

غالب کی مختلف غزلیات کی تاریخِ تحریر

۱۔ پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

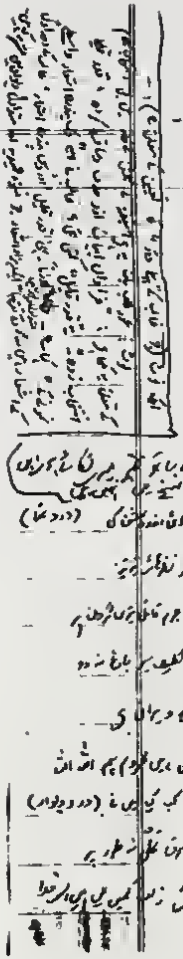
اگست ۱۸۵۳ء ثبوت کے لیے:

See Chapt. XVIII of Pb. Govt. Records Vol. I headed "Illness of H.M. the King of Delhi and arrangements in the event of his demise 1853." A letter from Sir Theophilus Metcalfe to the Secy. to Govt. N.-W. Provinces dated 18th July 1853 says that "the King of Dehlee has for some days past been suffering from a severe attack of dysentry caused by his own imprudence in the matter of diet".

"خاقاں از شبِ عید رنجور است"

Letter dt. 1st Aug. 1853.	"During the last two days the state of H.M.'s health has improved."
" " 8th Aug.	"has rallied considerably."
" " 16th Aug.	"Seems to be steadily though very gradually recovering". "In the opinion of the Hakeems he is altogether out of danger."
" " 23rd Aug.	Although . . . "the Ghosl-e-Sehat- has not yet been performed H.M. may be pronounced as recovered."

۲۔ حسب ذیل غزلیات کا ذکر رقعاتِ نواب مصطفیٰ خاں حسرتی (APi VI 140 P.U.L.) میں ہے۔ اس کتاب کی ترتیب ۱۸۶۶ء۔۷ میں ہوئی . . .



مرقومہ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۳ء
جرگہ بین کا تحریر ہے

۱۱۵

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں گلشنِ بے خار کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے۔
(B36.51.C.80.9) 1846. page 6 کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

در مطبع

دہلی اردو اخبار پریس مکان واقع محلہ باقر گنجار الحتقاد خاں
میں مستعمل پیمہ شریف باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر و پبلشر کے چھاپہ ہوا۔

۱۲۵۹ھ
۱۸۴۳ء

سید قمر

ہر دو نسخہ مطبوعہ نسخے میں غالب کی ان غزلیات کا انتخاب نامل ہے: (مطبوعہ نسخے کی ترتیب کے مطابق)

(۱) کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ (۲) نسخے لبریز موئے سا کوئی نہیں ہے (۳) بکھ جاتی ہے ہر شام تمنا مری آگے (درد منت)
(۴) ہے مشاہد ہستی مطلق پہ گویا غلبۂ ظن (۵) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا (۶) کہا تو دیکھ ہوا ہے
(۷) دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا (۸) نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے (۹) کہا ہے نہ بنے
(۱۰) آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے (۱۱) مرے کام کے دل کسی نہیں ہے کام کا (۱۲) کم مرغان ہیں تکلیف سے باغ نہ دیکھ
(۱۳) داغ حسرت دلِ زنگار ہے (۱۴) امید عشق کی غارت گرانِ جاں دیکھنا (۱۵) کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
(۱۶) دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں (۱۷) رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے (۱۸) ہم اللہ اللہ
(۱۹) کہاں میکدے میں دستگاہ زاہد ریا کار کہاں (۲۰) ہجوم تشنہ کامانِ محبت (۲۱) ہے کہ نہیں ہے (درد و داغ)
(۲۲) ہے کہ نہیں ہے (۲۳) ستم کش مصلحت سے ہوں خوئے بد گمانی (۲۴) ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
(۲۵) مزہ پانی کے سر غالب دشمن ہے (۲۶) ہم سے کھل جا بہ وقت مے پرستی (۲۷) نہ ستائش گر کا شکوہ

جیریس لین، کیمبرج ۔ مرقومہ ۱۶ر نومبر ۱۹۵۲

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں گلشن بے خار کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے ۔ (836.51.C.80.9) ۔ title page کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

در مطبع

دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر گذار اعتقاد خاں

میں متصل پنجہ شریف باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر اور پبلشر کے چھاپہ ہوا۔

۱۲۵۹ ہجری — الراقم

۱۸۴۳ عیسوی — کنور سین

نوٹ (غالب کے "پہلے دور" کی تعیین کے متعلق):

غور طلب بات یہ ہے کہ شیفتہ نے گلشن بے خار میں بھی انتخاب کلام کے متعلق یہ لکھا ہے: "فراواں ابیات ازو حذف و ساقط کردہ، قدر قلیلے انتخاب زدہ۔" یہ "قدرِ قلیل" کتنی تھی؟ غالب نے اسے "دس پندرہ اشعار، واسطے نمونے کے" کہا ہے۔ متداول دیوان میں لازماً یہی قدرِ قلیل، اور دس پندرہ اشعار، غالب کے دورِ اول کے اشعار ہیں نہ کہ وہ تقریباً ایک ہزار اشعار جو نسخۂ حمیدیہ اور متداول دیوان میں مشترک ہیں۔

اس مطبوعہ نسخے میں غالب کی ان غزلیات کا انتخاب شامل ہے:
(مصرعوں کے ساتھ نمبر میرے لگائے ہوے ہیں، اصل نسخے میں نہیں ہیں)۔

۱۔ کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
۲۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
۳۔ جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی (درد تھا) . . .

برٹش میوزیم لندن -- ۳۰ دسمبر ۱۹۵۳ء

"گلشنِ بے خار" کا جو قلمی نسخہ یہاں ہے وہ ۱۲۴۸ھ

کے بجائے سنہ ۱۲۵۰ھ کا لکھا ہوا سمجھنا چاہئے

اس قلمی نسخے کے صفحہ ۱۰ پر یہ بیان ہے:

و ابتدائے ایں کارنامہ در ابتدائے سال از دوصد و چہل و ہشت از ہجرت بودہ و انتہای در انتہای ہزار و دوصد و پنجاہ۔ بسلسلہ منتخب زیب تاریخ آغاز ہست والحمد للہ علی حصول المقاصد والشکر لہ بلوغ اتمام۔ والحمد للہ علی ذلک و امروز اشہب تیز گام عمر رواں بست و ششش مرحلہ طے کردہ از ہر ای فرو منزل مقصود سرگرم تگ و پو ہست۔

میسو دیے کے آخر میں اتمام تاریخ کا دن دی گئی ہے۔

سر شوال سنہ ۱۲۵۲ھ

۶۵ غزلوں کا انتخاب جو ہر چاپی کے [illegible] دو نسخوں پر "گلشنِ بے خار" مطبوعہ سنہ ۱۸۴۳ء سے ماخوذ ہے وہ سب اسی ترتیب سے یہاں بھی ہیں مگر ۶۵ (یعنی کہیں نیکی بھی اس کے بدی میں گرا بارہ ۔۔) کے بعد قلمی انتخاب میں یہ اشعار ہیں:

① ہونے سے اور عشق نے بے باک کر دیا ورنہ ہم بھی گنہ گار تھے ثواب کے

② بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل ③ جب آبلہ پا وادیٔ پر خار میں آیا ④ پھر دل ہوا ہے

۔۔ درکار بہ ہاتھ ہی مرے کوہ کن کو ۔۔ ۵ ذکر میرا مجھ سے ہی بہتر کہ اس محفل میں ۔۔ ⑥ نہ لٹتا ہم

غالباً یہ چھ غزلیں ۱۸۴۳ء والے مطبوعہ نسخے کے بعد کے ہیں۔ غیر نقل قلمی نسخہ

برٹش میوزیم لندن ۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۳ء

"گلشنِ بے خار" کا جو قلمی نسخہ یہاں ہے وہ ۱۲۴۸ھ کے بجائے ۱۲۵۰ھ کا لکھا ہوا سمجھنا چاہیے۔

اس قلمی نسخے کے ص ۹-۱۰ پر یہ بیان لکھا ہے۔

"و ابتدائے ایں کارنامہ در ابتدائے سال از دو صد وچہل و ہشت از ہجرت بودہ و انتہا در انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ۔ سمہ منتخب زیب تاریخ آغاز است والحمدللہ علیٰ الحصول المقاصد والشکرلہ بتاریخ اتمام۔ والحمدللہ علیٰ ذلک وامروز اشب تیز گام عمر رواں بست و شش مرحلہ طے کردہ از برای فوز منزل مقصود سرگرم تگ و پو است"۔

مسودے کے آخر میں اتمامِ تاریخ کتابت دی گئی ہے: ۲ شوال ۱۲۵۲ھ

۶۵ غزلوں کا انتخاب جو اس کاپی کے پچھلے دو صفحوں پر گلشن بے خار مطبوعہ ۱۸۴۳ سے ماخوذ ہے وہ سب اسی ترتیب سے یہاں بھی ہیں۔ مگر نمبر ۶۵ (یعنی کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے . . .) کے بعد قلمی انتخاب میں یہ اشعار ہیں:

۱۔ رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے + کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ

۲۔ بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل

۳۔ پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے

۴۔ پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دَم

اور اس کے بعد مانگے ہے پھر کسی کو... اور جی ڈھونڈتا ہے...

۵۔ گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے یاایں ہمہ

۶۔ زندگی اپنی جب اس رنگ سے...

(غالباً یہ چھ غزلیں ۱۸۴۳ والے مطبوعہ نسخے کے کاتب سے سہواً رہ گئیں۔ زیرِ نظر قلمی نسخے کا کاتب بھی خاصا نالائق ہے) . . .

لاہور ۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۹

دیوان غالب کا وہ مخطوطہ جو "نسخہ شیرانی" کہلاتا ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے، اس کے مندرجات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ (شمار کرنے کے لیے نمبر میں نے لگائے ہیں، دیوان میں نمبر نہیں ہیں) :

۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ...
آتشیں پا ہوں ...
شوخیِ نیرنگ صید وحشت ...
لذت ایجاد ناز افسون ...
کاو کاو سخت جانی ہائے ...
خشت پشت دشت عجز ..
جذبۂ بے اختیارِ شوق ...
آگہی دامِ شنیدن ...
وحشتِ خوابِ عدم شور تماشائے اسد

حاشیے پر کسی شخص نے (شاید دورِ حاضر میں) متداول مقطع لکھا ہے :
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی...
موئے آتش دیدہ ہے ...

۲) جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا

۳) عالم جہاں بعرض بساط وجود تھا

۴) شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
۵) تنگی رفیقِ رہ تھی عدم یا وجود تھا
۶) خود آرا وحشت چشم پری سے شب
وہ بدخو تھا ...
۷) کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
۸) دوست غمخواری میں میری سعی
فرماویں گے کیا ...

ان دو غزلوں کے حاشیے پر "از باندہ "فرستاوند" کے نوٹ کے ساتھ "ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا" کے بارہ شعر درج ہیں۔

(قافیہ آخر تک "کھاویں" وغیرہ)

۹) عشق سی طبیعت نی زیست کا مزا پایا
۱۰) اف نکی گو سوز غم سی بیحابا جل گیا
۱۱) کارخانی سی جنونکی بھی میں عریان نکلا
۱۲) دودیدن کی کمین جون ریشہ زیر زمین پایا
۱۳) شوق ہر رنگ رقیب سر و سامان نکلا
۱۴) دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا
۱۵) دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
۱۶) برہن شرم ہی باوصف شوخی اہتمام اوسکا
۱۷) شب اختر قدح عیش نی محمل باندہا
۱۸) نہوکا یک بیاباں ماندکی سی ذوق کم میرا

۱۹) جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا

۲۰) نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا

۲۱) محرم نہیں ہی تو ہی نواہای راز کا

(اس غزل اور غزلِ ماسبق کے آخری تین شعروں کے حاشیے پر "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" والی غزل کے تیرہ شعر لکھے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے (جو شاید صحیح ہے) کہ یہ حاشیہ پورے کا پورا غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ("سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن" اور "کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ" کے درمیان قطعہ لکھا ہے)

۲۲) شب کہ ذوقِ گفتگو سی تیری دل بیتاب تھا

۲۳) یک کام بیخودی سے لوٹیں بہار صحرا

۲۴) نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا

۲۵) لب خشک در تشنگی مردگاں کا

۲۶) کیا کس شوخ نی ناز ازسر نمکیں شستن کا

۲۷) یاد روزی کہ نفس سلسلۂ یارب تھا

۲۸) کسکا خیال آئینہ انتظار تھا

۲۹) زبس خوں کشتۂ رشک وفا تھا وہم بسمل کا

۳۰) بسکہ دشوار ہی ہر کام کا آسان ہونا

۳۱) رات دل کرم خیال جلوہ جانانہ تھا

۳۲) کری کر حیرت نظارہ طوفان نکتہ کوئی کا

۳۳) بسکہ جوش کریہ سی زیر و زبر ویرانہ تھا

۳۴) شب کہ دل زخمی عرض وو جہاں تیر آیا

۳۵) سیر آنسوی تماشا ہی طلب کارونکا

۳۶) شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا

۳۷) عیادت سی زبس ٹوٹا ہی ول یاران غمگیں کا

۳۸) پی نذر کرم تحفہ ہی شرم نارسائی کا

۳۹) ضعف جنونکو وقت تپش در پہ دور تھا ("ور بھی دور تھا" نہیں)

۴۰) نہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا

۴۱) یک ذرۂ زمین نہیں بیکار باغ کا

۴۲) قطرہ ی بسکہ حیرت سی نفس پرور ہوا

۴۳) وہ میری چین جبین سی غم پنہاں سمجھا

۴۴) پھر بھی دیدہ تر یاد آیا

۴۵) تو دوست کسو کا بھی ستمگر نہوا تھا

۴۶) شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا

۴۷) عرض نیاز عشق کی قابل نہیں رہا

۴۸) طاؤس ور رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا

۴۹) خود پرستی سی رہی باہمہ کر ناآشنا . . .

۱۳۷

تقاسیمی دیوان غالب

نسخۂ سو ھرہ

[۱۹۶۹-۸-۲۲]

نسخۂ شیرانی کے بعد O کتابت کی بڑا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے [نمبر Ms. 6812 VI 9 M]

یہ نسخہ ۱۵۷ اوراق پر مشتمل ہے جس میں دیباچہ و عبارت خاتمہ۔ خاتمۂ کتاب میں ۱۲۵۴ھ کی تاریخ لکھی ہے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مصنف خاتمۂ کتاب ~~کی تاریخ کتابت ہے~~ کی تصنیف کی تاریخ ہے یا کتابت خاتمۂ کتاب کی تاریخ ہے۔ (اس مخطوطہ کا عکس ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے توسط سے مخطوطات (پٹنہ) کے ذخیرہ سے حاصل کیا گیا)

دیباچے کے فوراً بعد اندراجات کی تفصیل "دیوان غالب" کے ~~مطابق~~ طابع ایڈیشن کے مطابق (جو میرے اپنے کتب خانے میں موجود ہے) حسب ذیل ہے:

طابع ایڈیشن ص ۳ تک لفظاً بلفظ نسخۂ سو ھرہ ہے۔

ص ۴ بھی سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش ... یہ شعر نسخۂ سو ھرہ میں نہیں ہے (نسخۂ سو ھرہ کی مندرجہ غزل سات کے بجائے صرف چھ شعروں کی ہے)

اس طرح تمام اختلافات نسخۂ لاہور میں ذیل سے درج کر دیئے گئے ہیں شدہ غزل بھی (نسخۂ لاہور ص ۲۷) میں "ہر ہے لب" والی غزل میں نسخۂ سو ھرہ ایک شعر زیادہ دیتا ہے۔

لاہور ۔ ۲۲ اگست ۱۹۶۹

قلمی دیوانِ غالب
نسخۂ لاہور

نسخۂ شیرانی کے بعد کا کتابت کیا ہوا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے ۔
(نمبر A No. 6812 uiVI9M)

یہ نسخہ ۶۴ اوراق پر مشتمل ہے بشمول دیباچہ و عبارتِ خاتمہ ۔ خاتمۂ کتاب میں ۱۲۵۴ھ کی تاریخ لکھی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ محض خاتمۂ کتاب کی تصنیف کی تاریخ ہے یا کتابت خاتمہ کتاب کی تاریخ بھی ۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل غور ہے کہ مرثیۂ عارف قطعۂ معذرت (سہرے کے سلسلے میں) نسخۂ لاہور کے متن میں موجود ہیں۔

دیباچے کے فوراً بعد اندراجات کی تفصیل طاہر ایڈیشن کے مطابق (جو میرے اپنے کتب خانے میں موجود ہے) حسب ذیل ہے :

طاہر ایڈیشن ص ۳ تک لفظ بہ لفظ نسخہ لاہور ہے۔

ص ۴ سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش ... یہ شعر نسخۂ لاہور میں نہیں ہے (نسخۂ لاہور کی مندرجہ غزل سات کے بجائے صرف چھ شعر کی ہے) اس طرح باقی اختلافات نسخۂ طاہر میں پنسل سے درج کر دیے گئے ۔ مثلاً غزل ۵۶ (نسخۂ طاہر ص ۲۷) میں "میرے بعد" والی غزل میں نسخۂ لاہور ایک شعر زیادہ دیتا ہے ۔

حسب ذیل غزلیات نسخۂ لاہور میں نہیں ہیں :

۱) درخورِ قہر غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا (طاہر ایڈیشن ص ۱۲ پر)
۲) درد منّت کشِ دوا نہ ہوا (" ص ۱۴ پر)
۳) کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز (" ص ۳۴)

۴) نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں (یہ غزل نسخۂ طاہر (ص ۴۰) میں کس طرح آگئی؟)

۵) نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں (" ص ۵۰)

۶) دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں (" ص ۵۵)

۷) کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو (" ص ۵۷)

۸) قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانے میرے شیون کو (" ص ۵۸)

۹) گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو (" ص ۶۱)

۱۰) کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو (" ص ۶۱)

۱۱) توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر (؟) برسا کرے (" ص ۶۳)

۱۲) میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی (" ص ۶۴)

۱۳) بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے (" ص ۶۶)

۱۴) آپ نے مسنی الضر کہا ہے تو سہی (" ص ۶۶)

۱۵) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے (" ص ۸۹)

۱۶) پھر اس انداز سے بہار آئی (" ص ۹۰)

۱۷) نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے (" ص ۹۴)

۱۸) دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے (" ص ۹۸)

۱۹) بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے (" ص ۱۰۱-۱۰۲)

۲۰) کہوں جو حال تو کہتے ہو مدّعا کہیے (" ص ۱۰۲-۱۰۳)

اسی طرح "تکیہ" والی غزل نہیں ہے

۲۱) روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گزار کی (" ص ۱۰۷)

۲۲) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (" ص ۱۰۷)

ص ۱۱۴ کے بعد طاہر ایڈیشن میں جن منظومات پر نمبر نہیں لگایا گیا وہ "نسخۂ لاہور" میں نہیں ہیں بہ استثنا اُن رباعیات کے جن کے پہلے مصرعے اگلے صفحے پر دیے گئے ہیں۔ یہ رباعیات نسخۂ لاہور میں قطعات کے بعد بترتیبِ ذیل درج ہیں اور انھی پر دیوان ختم ہوتا ہے۔

"منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی" والے قطعے کے بعد حسب ذیل بارہ رباعیات پر یہ دیوان ختم ہوتا ہے:

۱) بعد از اتمام بزم عید اطفال
۲) شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا
۳) آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال
۴) دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی
۵) ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے
۶) دل سخت نژند ہوگیا ہے گویا — اس سے گلہ مند ہوگیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں — غالب منہ بند ہوگیا ہے گویا
۷) دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالب
۸) مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
۹) بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے وال

۱۰) ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم
۱۱) حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
۱۲) اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا

اس کے بعد خاتمہ از نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر آتا ہے۔

STAFF ROOM

ISLAMIA COLLEGE, LAHORE

Principal:

During the last summer vacation I made a tour of various places in India, visiting libraries and looking into old manuscripts in the possession of private individuals. The names of some of the places that I visited are given below:

Delhi; Lucknow; Allahabad; Banares; Patna; Calcutta: Hyderabad – Dn and Bhopal.

The object of the tour was to collect material for a book on social life in Delhi before 1857 and to make (with the help of certain dated manuscripts) a chronological arrangement of Ghalib's Urdu and Persian works. I am glad to say that the tour was on the whole quite successful. I have not only arranged Ghalib's Diwan and Kulliyat chronologically but have discovered some hitherto unknown poems of Ghalib, as also some biographical facts about the poet which have cleared a few obscurities in the story of his life. As to my work on the social life of Delhi, I have, besides having collected some material on the subject, procured a number of illustrative photographs.

Hamid Ahmad Khan

8/11/38

P.S. I hope to publish my work by the winter of 1939.

H.A.K.

STAFF ROOM

ISLAMIA COLLEGE, LAHORE.

Principal:

During the last summer vacation I made a tour of various places in India, visiting libraries and looking into old manuscripts in the possession of private individuals. The names of some of the places that I visited are given below:

Delhi; Lucknow; Allahabad; Benares, Patna; Calcutta; Hyderabad and Bhopal.

The object of the tour was to collect material for a book on social life in Delhi before 1857 and to make (with the help of certain dated manuscripts) a chronological arrangement of Ghalib's Urdu and Persian works.

I am glad to say that the tour was on the whole quite successful. I have not only arranged Ghalib's Diwan & Kulliyat chronologically, but have discovered some hitherto unknown poems of Ghalib, as also some biographical facts about him which have cleared a few obscurities in the story of his life. As to my work on the social life of Delhi, I have, besides having collected some material on the subject, procured a number of illustrative photographs.

Hamid Ahmad Khan

8/xi/38.

P.S. I hope to publish my work by the winter of 1939.

HAK

لاہور ۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۹

احمد علی خاں اور ہاجرہ مسرور کے نام خط سے اقتباس

"... جو کتابیں لکھنے کی آرزو اب بھی دل میں ہے ان میں سے ایک کتاب تو غالب پر ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں مسلمانانِ ہند کے خاص تمدن کا تجزیہ شامل ہے (ذہنی طور پر یہ تجزیہ ہو چکا ہے اور بے شمار notes کی شکل میں موجود ہے جو میرے گھر پر پڑے ہیں!) دوسری کتاب (انگریزی میں) ورڈزورتھ پر ہے۔ اس کا دو تہائی حصہ (جس طرح غالب والی کتاب کا ایک تہائی حصہ) لکھا جا چکا ہے..."

ضمیمہ د

فہرستِ کتب

(غالب پر مصنّف کا ذخیرۂ کتب)[1]

۱۔ مفتی محمد انوار الحق (تدوین)، دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ، آگرہ، ۱۹۲۱ ص ص ۱۴۲۔

۲۔ مفتی محمد انوارالحق (مرتّب) مع مقدمہ دیوان، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، دیوانِ غالب جدید نسخۂ حمیدیہ، آگرہ ص ص ۳۴۲۔

۳۔ دیوانِ غالب اردو، خواجہ غلام حسن شاد، تاجر کتب، لاہور، ۱۹۳۱، ص ص ۱۰۴۔

۴۔ دیوانِ غالب اردو، نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۰۳، ص ص ۱۰۴۔

۵۔ آغا محمد طاہر، دیوانِ غالب، آزاد بک ڈپو، کوچہ چیلاں، دہلی، ۱۹۳۶، ص ص ۱۴۷۔

۶۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی، دیوانِ غالب اردو معہ شرح دیوانِ غالب، کانپور، ص ص ۱۶۰۔

۷۔ کلیاتِ غالب، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۵، ص ص ۵۲۴۔

۸۔ کلیاتِ عالب، نول کشور، ص ص ۵۶۴۔

۹۔ مرزا غالب، سبد چین (مرزا غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ)، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۸، ص ص ۸۰۔

۱۰۔ امتیاز علی عرشی، مکاتیبِ غالب، مطبع تحمّد، بمبئی، ۱۹۳۸، ص ص ۱۳۵۔۱۸۳۔

---

۱ الماری "غالب" میں رکھی کتابوں کی ایک جھلک۔

۱۱۔ مولوی عبدالباری آسی، مکمل شرحِ کلامِ غالب، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۳۱، ص ص ۳۲۰۔

۱۲۔ الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور، ۱۹۳۰، ص ص ۳۹۲۔

۱۳۔ غلام رسول مہر، غالب، شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور ۱۹۳۶، ص ص ۳۷۹۔

۱۴۔ مالک رام، ذکرِ غالب، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۳۸، ص ص ۲۸۴۔

۱۵۔ شیخ محمد اکرام، غالب نامہ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۳۶، ص ص ۴۲۴۔

۱۶۔ مختارالدین احمد آرزو (ایڈیٹر)، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۴۸-۴۹، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ص ۲۷۴+۶۸۔

۱۷۔ C.E.Buckland, Dictionary of Indian Biography Swan Sonnenschein, London, 1906 p.494

۱۸۔ C.H. Payne (ed.), Tod's Annals of Rajasthan George Routledge Sons, London. p. 216

۱۹۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، سرگذشتِ غالب، ادارۂ ادبیاتِ اردو، ۱۹۳۹، ص ص ۶۴۔

۲۰۔ مولوی مہدی علی خاں مرحوم، مسلمانوں کی تہذیب، شیخ عبدالعزیز پرنٹر، امرتسر، ص ص ۴۸۔

۲۱۔ مولوی غلام حسین خاں طباطبائی، سیرُالمتأخرین، مطبع انوار احمدی، الہ آباد، ص ص ۱۴۳۔

۲۲۔ محمد تمیزالدین خاں، صید گاہ ماکیان رسالۂ مرغبازی، شاہ جہانی پریس، دہلی ۱۹۲۵، ص ص ۶۹۔

۲۳۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی، عربوں کا فنِ تعمیر، سلسلۂ تالیفات، وکیل ٹریڈنگ کمپنی، امرتسر، ۱۹۱۰، ص ص ۱۱۲۔

۲۴۔ Delhi Fort : A Guide to the Buildings and Gardens Archaeological Survey of India, Calcutta 1932 pp. 56 (incomplete)

۲۵۔ اردو اکادمی جامعۂ ملیہ اسلامیہ، دہلی، دلّی کی دو سو برس کی تاریخ، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۴۱، ص ص ۵۸۔

۲۶۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی، قدیم دہلی، حلقۂ مشائخ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۳۳، ص ص ۲۸۔

۲۷۔ سید رکن الدین نظامی دہلوی، حیاتِ دہلی، ص ص ۶۴۔

۲۸۔ شاہد احمد (ایڈیٹر)، ساقی، دہلی، جنوری ۱۹۳۷، ص ص ۲۷۲۔

۲۹۔ مولوی ابو محمد سید عبدالعزیز، آثارِ دہلی، مطبعِ حقانی، دہلی، ۱۹۱۱، ص ص ۱۱۶۔

۳۰۔ گزشتہ لکھنؤ، ص ص ۳۵۲۔

۳۱۔ نواب عماد نواز جنگ، حیاتِ نور جہاں، مطبوعہ نول کشور پریس، لاہور، ص ص ۲۰۔

۳۲۔ محمدی بیگم (ایڈیٹر)، تہذیبِ نسواں، ۲۷ مارچ ۱۹۳۷، ص ص ۲۷۸+۳۱۲۔

۳۳۔ محمد الدین فوق، (مرتب) حالاتِ نواب دبیر الدولہ، ہندوستان سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۲، ص ص ۵۴۔

۳۴۔ حکیم سید ناصر خلیق فگار، میخانۂ درد، جید برقی پریس، دہلی، ۱۹۱۰، ص ص ۲۴۶۔

۳۵۔ ایس۔ بیگم صاحبہ دہلوی، (مرتب) رسومِ دہلی، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۲۷، ص ص ۴۴۔

۳۶۔ منشی فیاض الدین مرحوم (مرتّب)، بزمِ آخر (یعنی شہرِ دہلی کے دو اخیر بادشاہوں کا طریقِ معاشرت)، رحمانی پریس، دہلی، ۱۹۲۰، ص ص ۱۱۲۔

۳۷۔ A.F.M.Abdul Ali, Prince Jawan Bakht Jahandar Shah Indian Historical Records Commission, 14th Session, Lahore, Printed at the Caxton Press, New Delhi, 1937. pp. 16

۳۸۔ مرزا علی بخت بہادر محمد ظہیر الدین اظفری، مترجمہ عبدالستار (بہ تصحیح و ترمیم محمد حسین محوی صدیقی)، واقعاتِ اظفری، بنگلور، ۱۹۳۷، ص ص ۲۰۲۔

۳۹۔ پروفیسر سید ابن حسن شارق (مرتب)، گلبدن بیگم، قومی کتب خانہ، دہلی، ص ص ۱۰۰۔

۴۰۔ منشی احمد دین (مؤلف)، شیخ ابوالفضل محمد اسلم خاں، تاجر کتب، لاہور ص ص ۴۰۔

۴۱۔ سید الطاف علی بریلوی، نواب دوندے خاں، نظامی، پریس، بدایوں، ص ص ۲۰۔

۴۲۔ مولوی محمد امین زبیری مارہروی (مرتب)، حیاتِ محسن، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۴، ص ص ۲۴۶۔

۴۳۔ نواب ذوالقدر جنگ (مرتب)، کارنامہ، سروری (سوانح خود نوشت نواب آغا مرزا بیگ)، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۳، ص ص ۳۶۰۔

۴۴۔ Abdul Aziz, Throne Tents & their Furniture used by the Indian Mughal, Ripon Printing Press, Lahore. pp. 145

۴۵۔ Captain L.J. Trotter, The Life of Hodson of Hodson's Horse, London 1926,pp. 306

۴۶۔ Hesketh Pearson, The Hero of Delhi,London, 1939, pp. 255

۴۷۔ Emily Eden, Up the Country, London, 1930, pp. 410

۴۸۔ Raza Ali Wahshat,Darbar-i-Akbari Calcutta,1914,pp.117

۴۹۔ سید ابوالحسن علی ندوی، سیرتِ سید احمد شہید، ناری پریس، لکھنؤ، ص ص ۴۶۴۔

ضمیمہ ہ

غالب پر مصنّف کی دوسری متفرّق تحریروں کی فہرست

۱۔ مرزا غالب کا قصیدۂ شمس الامراء

۲۔ مکاتیبِ غالب

۳۔ ہیجان پسندی اور غالب

۴۔ دیباچہ: "مقامِ غالب"

۵۔ غالب کا ایک شعر

۶۔ تنقیدِ غالب کا مستقبل

۷۔ نسخۂ حمیدیہ کا دیباچہ

۸۔ ارمغانِ غالب

۹۔ تعارف: مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالب (پنجاب یونیورسٹی میں غالب صدی)

۱۰۔ "شامِ ہمدرد" میں غالب صدی کا خطاب

۱۱۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی کے بارے میں تأثرات

۱۲۔ "غالب اور مطالعۂ غالب" از عبادت بریلوی پر رائے

۱۳۔ اندراج در نقلِ امروہہ

۱۴۔ امریکہ میں غالب صدی کی تقریبات

۱۵۔ Ghalib: Man and Poet

۱۶۔ Ghalib's Vision of Man and Nature

۱۷۔ Early years; The Young Ghalib (RCD کے لیے کتاب کے دو باب)

اشاریہ

شخصیات

آ

آبادی بیگم : ۳۰۔

آزاد : (رک : محمد حسین آزاد، مولانا)۔

آزاد بلگرامی : ۱۱۳، ۱۳۳۔

آغا باقر : ۲۵۳، ۲۵۴۔

آغا شاعر : ۲۷۷۔

آغا طاہر، نبیرۂ آزاد : ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۷۱۔

آغا محمد طاہر فاروقی : ۲۵۵، ۳۰۵۔

آکٹرلونی : ۳۴۴۔

آل احمد سرور : ۲۷۶۔

آگسٹے کومٹ : ۳۳۴۔

الف

ابوالکلام آزاد، مولانا : ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۹۵، ۲۹۸، ۲۹۹۔

ابو منصور : ۳۱۰۔

اچھن صاحب : ۲۸۲۔

احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں : (رک : حکیم احسن اللہ خاں)۔

احسن مارہروی، مولانا : ۲۷۶، ۲۷۷۔

احمد بخش خاں، نواب (رک : نواب احمد بخش خاں)۔

احمد بیگ : ۳۱۔

احمد علی خاں : ۳۰۹، ۳۷۹۔

ارسطو جاہ مولوی رجب علی : ۲۵۳، ۲۵۹، ۳۵۲، ۳۵۳۔

اسحاق : ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۸۷۔

اسحاق علی (ایڈیٹر 'الناظر') : ۲۸۶، ۲۸۷۔

اسٹرلنگ : ۲۱۱، ۲۱۲۔

اسد : ۷۹، ۲۲۶۔

اسد اللہ (لائبریرین) ۲۹۴، ۲۹۷۔

اسد اللہ بیگ خاں : ۳، ۴، (نیز دیکھیے غالب)

اسیر : ۹۳۔

اشفاق احمد : ۲۴۹۔

اشفاق علی : ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۷۱۔

اشوک : ۳۲۰۔

اعجاز الدین : ۲۴۹۔

اقبال، علامہ : ۱۳۶، ۲۷۳، ۲۷۷، ۲۸۲، ۳۰۳۔

اکبر ثانی : ۲۳۸، ۲۶۵، ۳۱۹۔
اکبر خاں : ۲۷۵۔
اکرم : (رک : محمد اکرم دہلوی)۔
الٰہی بخش خاں معروف، نواب : ۲۱، ۲۷، ۲۸، ۳۴، ۳۵، ۳۹، ۴۰، ۴۸، ۵۲ تا ۵۴، ۲۰۶، ۲۷۰۔
امام بخش صہبائی، مولوی : ۱۰۵، ۲۲۲، ۲۴۴۔
امتیاز علی عرشی : ۲۸۱، ۲۸۲۔
امراؤ بیگم : ۴، ۲۱، ۲۷، ۲۸، ۳۰ تا ۴۴، ۴۸، ۵۳، ۵۹، ۲۳۷۔
امرناتھ ساحر : ۲۷۱۔
امیر احمد علوی : ۲۷۶۔
امین : ۲۹۹ : ۳۰۰۔
امین الدین خاں، نواب : ۴۸، ۵۵، ۱۸۸، ۲۳۸، ۳۴۳۔
اوٹو وسٹگو : ۳۳۰ تا ۳۳۴۔
اورنگ زیب عالمگیر (بادشاہ) : ۸۷، ۹۰، ۹۱، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۹۲، ۲۳۴۔
انیس، میر : ۲۸۹۔
ایچ۔ این۔ بنرجی : ۲۸۹۔
ایچ۔ ٹرلٹن : ۳۴۴۔
اے۔ راس : ۳۴۴۔
اے۔ سٹون : ۳۴۴۔
ایف۔ کے۔ خاں درانی : ۲۹۹۔
ایف۔ ہاکنز : ۳۴۵۔
ای۔ کولبروک : ۳۴۵۔
ایل۔ پی۔ ممتھ : ۳۳۴۔
اصلی ایڈن : ۳۲۴، ۳۴۷۔

ب

بابر (بادشاہ) : ۳۱۷۔
باقر علی خاں : ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۹، ۴۸، ۵۱، ۵۶۔
بادا ہردیال سنگھ : ۲۶۸۔
بجنوری، ڈاکٹر : ۳۴۔
براؤن : ۳۵۱۔
برہان الدین غریب : ۳۱۱۔
بستی (ملا) : ۴۳، ۵۹۔
بشیر الدین : ۲۷۶۔
بگا بیگم (رک : معظم زمانی بیگم)۔
بنٹنگ (رک : ولیم بنٹنگ، لارڈ)۔
بنیادی بیگم : ۲۷، ۴۱، ۴۲، ۴۸، ۴۹، ۲۳۷۔
بہادر شاہ ظفر : ۱۱، ۶۱، ۷۵، ۲۵۱، ۲۷۶، ۲۷۹۔
بہاری لال مشتاق : ۷۷۔
بیتھوون : ۳۲۴۔

بے خود دہلوی : ۲۶۸۔
بیدل ، میرزا : ۱۷ ، ۶۵ ، ۷۴ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۱۰۰ ، ۱۰۲ تا ۱۳۷ ، ۲۵۰ ، ۲۵۲ ، ۲۶۴ ، ۲۶۵ ، ۳۴۲۔
بیگم سمرو : ۲۴۲ ، ۳۴۲۔
بی ۔ مارٹن : ۳۴۵۔

پ

پرگنہ ہتین (شرف الدولہ) : ۴۸۔
پنڈت امرناتھ ساحر : ۲۷۱۔
پنڈت دتاتریہ کیفی : ۲۷۱۔
پنڈت موتی لال : ۳۶۳۔
پوسن : ۳۳۵۔

ت

تھامسن باڈکن : ۳۳۵۔
تھامس تھیوفلس : ۳۴۶۔
تھیوفلس مٹکاف : ۳۶۱۔
ٹی ۔ ٹی ۔ مٹکاف : ۳۴۵۔

ٹ

ٹامسن (چیف سیکرٹری) : ۱۳۴ ، ۲۱۹ ، ۲۲۰۔
ٹائی ٹن : ۳۳۵۔

ج

جارج کارنیک بارنس : ۳۵۰ ، ۳۵۲۔
جان ڈن : ۱۱۴۔
جان مرے : ۳۴۰۔
جرأت : ۱۴۰۔
جلال الدین خلجی : ۳۱۱۔
جمیل صاحب : ۲۷۵۔
جون وی آرک : ۳۵۰۔
جندو بیگم : ۳۱ ، ۲۷۱۔
جہانگیرہ بیگم : ۲۴۱۔
جے ۔ ڈگلس : ۳۵۰۔
جیون بیگ : ۳۱۔
جیون لال : ۲۴۸۔

چ

چارلس مٹکاف : ۳۴۴ ، ۳۴۶۔

ح

حاجی محمد محسن : ۱۹۹۔
حافظ شیرازی : ۹۵ تا ۹۸ ، ۱۰۳ ، ۱۷۴۔
حافظ معین الدین : ۷۰ ، ۳۳۹۔
حالی ، مولانا : ۳۴ ، ۳۶ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۷۴ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۹۳ ، ۹۵ ، ۲۰۰ ، ۲۰۵ ، ۳۵۹۔
حامد علی خاں ، مولانا : ۲۴۳ ، ۲۴۴ ، ۲۶۲ ، ۲۶۳ ، ۲۶۷ ، ۲۷۶ ، ۲۸۲ ، ۲۹۱ ، ۲۹۴۔
حسام الدین حیدر ، نواب : ۷۶۔

حسن نظامی ' مولانا : ۲۴۵ ' ۲۶۷ ' ۲۷۷ ' ۳۵۸۔
حسین علی خاں : ۲۶ ' ۲۷ ' ۲۹ ' ۴۸ ' ۴۹ ' ۵۱ ' ۵۲ ' ۵۶ ' ۵۷ ' ۲۲۱ تا ۲۲۳۔
حفیظ اللہ : ۲۸۲۔
حفیظ ہوشیارپوری : ۲۴۱ ' ۲۴۳ ' ۲۴۴ ' ۲۴۷ ' ۲۵۴ ' ۲۶۰ ' ۲۶۱ ' ۲۶۳ ' ۲۶۶ ' ۲۷۱۔
حکیم احسن اللہ خاں : ۳۱ ' ۲۱۳ ' ۳۵۲ ' ۳۵۳۔
حکیم عمر کامل خاں : ۲۵۸۔
حکیم غلام مرتضیٰ : ۳۱۔
حکیم محمد شریف : ۱۸ ' ۲۵۹۔
حکیم محمد کامل خاں دہلوی : ۲۴ ' ۲۵ ' ۲۶۳ ' ۲۶۷ ' ۲۶۸۔
حکیم محمود خاں : ۳۱۔
حمیدا عرف مدو پانی پتی : ۳۲۱۔
حیات احمد خاں : ۳۳۵۔
حیدر حسن خاں ' مرزا : ۴۸ ' ۴۹۔

خ

خان بہادر شمس العلما مولوی محمد موسیٰ : ۲۰۱۔
خسرو : ۷۶۔
خضر مرزا ' نواب : (رک : نواب خضر مرزا)۔
خواجہ حسن نظامی (رک : حسن نظامی)۔
خواجہ سراج الدین عثمان : ۳۱۱۔
خواجہ عبدالحمید : ۲۶۸ ' ۲۷۰۔
خواجہ عبدالروف عشرت : ۵۰ ' ۲۸۴ ' ۲۸۶۔
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی : ۲۳۸ ' ۲۶۴۔
خواجہ محبوب علی : ۲۶۳ ' ۲۶۷۔
خواجہ محمد امین : ۴۸۔
خواجہ محمد حفیظ : ۲۸۶۔
خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی : ۳۱۱۔
خوب چند ذکا : ۸۰۔

د

داغ ' استاد : ۹۲۔
دانش : ۱۰۱۔
دیوان سنگھ : ۲۴۱ ' ۲۴۳۔

ڈ

ڈاکٹر اقبال : ۲۸۲۔
ڈاکٹر بھٹناگر : ۲۴۸ ' ۲۷۳۔
ڈاکٹر ذاکر حسین : ۲۴۹۔
ڈاکٹر سرن شنکر : ۳۰۵۔
ڈاکٹر سید عبداللطیف : ۶۷ ' ۶۹ ' ۹۰۔

ڈاکٹر سید محمود : ۶۷، ۶۸۔
ڈاکٹر محمد باقر : ۳۲۵۔
ڈاکٹر نعیم احمد : ۳۵۶۔
ڈبلیو ۔ ایچ ۔ فتے : ۳۴۰۔
ڈبلیو ۔ ایس ۔ آر ۔ ہاڈسن : (رک : ہاڈسن) ۔
ڈیوڈ ابراہامسن : ۳۳۰، ۳۳۱۔

ذ

ذکاء اللہ ، مولوی : ۲۰۵۔
ذوق ، شیخ ابراہیم : ۸۹، ۹۲، ۱۴۰، ۲۰۵، ۲۱۳، ۲۴۴، ۲۵۳۔

ر

رابرٹس : ۳۵۴، ۳۵۶۔
راجہ کشن گڑھ : ۲۵۲، ۳۴۲۔
رازق الخیری : ۲۴۹۔
رشید احمد صدیقی : ۲۷۶۔
رضا علی وحشت : ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۱۔
رفیق الدین : ۲۵۵۔
رنجیت سنگھ : ۳۲۴۔
رودکی : ۹۷۔
روشن الدولہ ، نائب السلطنت : ۲۰۹۔
ریاض الحسین خاں : ۴۸۔

ز

زاہدہ : ۲۶۲۔
زین العابدین خاں عارف ، مرزا : ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۴۳، ۴۸، ۴۹، ۵۶، ۵۷، ۲۱۰، ۲۲۱، ۲۳۱، ۲۳۷، ۲۶۸، ۲۶۹۔
زینت النسا بیگم : ۲۳۴، ۲۳۵۔

س

ساورکر : ۳۵۸۔
سر امیر الدین احمد خاں ، نواب : ۲۴۰۔
سر ٹامس مٹکاف : ۲۴۷، ۳۴۲۔
سر ڈاکٹر آکٹرلونی : ۳۴۴۔
سر ڈیوڈ : ۳۴۴۔
سر راس مسعود : ۲۵۴۔
سعادت علی خاں : ۳۴۸۔
سعدی ، شیخ : ۳۳، ۷۵، ۹۵، ۹۶، ۱۹۷، ۱۰۰۔
سعید الدین احمد خاں طالب : ۴۸، ۴۹، ۵۱، ۲۳۷۔
سکنر (رک : کرنیل سکنر ، جون جیمز)۔
سمرگیت : ۳۲۰۔
سندھیا : ۶۵۔
سوزی : ۱۰۱۔
سی ۔ ایلیٹ : ۳۴۴۔
سی ۔ ٹی ۔ مٹکاف : ۳۴۴۔
سی ۔ جے ۔ مٹکاف : ۳۴۴۔
سیٹھ گنڈویا : ۲۳۵۔

سید ابو محمد، خان بہادر : ۲۸۴، ۲۸۸۔
سید احمد خاں، سر : ۲۰۵، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۷۵، ۳۱۵، ۳۵۸۔
سید امتیاز علی تاج : ۳۱۱۔
سید حسین علی خاں، امیر الامرا : ۱۳۳۔
سید ساجد علی : ۳۰۳۔
سید سلیمان ندوی : ۲۳۱۔
سید محمود : ۲۴۵۔
سید مسعود حسن : ۲۸۳، ۳۱۵۔
سیماب اکبر آبادی : ۲۶۸۔
سیمن فریزر : ۳۴۵۔

ش

شاد عارفی : ۲۸۱، ۲۸۲۔
شارپ : ۳۴۲، ۳۴۷۔
شاکر حسین : ۴۸، ۲۶۸۔
شاہ اسماعیل : ۲۰۵، ۲۱۴۔
شاہجہاں، بادشاہ : ۸۷۔
شاہد احمد : ۲۴۳۔
شاہزادہ محمد اعظم : ۱۳۳۔
شاہ عالم ثانی، بادشاہ : ۱۸، ۶۵، ۲۳۸، ۳۴۸۔
شاہ عبد الرحیم، مولانا : ۳۴۳۔
شاہ عبد العزیز، مولانا : ۲۰۵، ۲۵۰، ۳۴۳۔
شاہ وارث علی : ۲۶۴۔
شاہ ولی اللہ، مولانا : ۲۴۹، ۲۵۰، ۳۴۳۔
شائق : ۱۰۱۔
شبلی : ۹۳۔
شجاع الدین خاں، نواب : ۳۱۔
شمس الاسلام : ۲۷۵۔
شمس الدین خاں، نواب : ۴۸، ۵۵، ۵۶، ۲۰۶، ۲۱۱، ۲۳۴، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۵، ۲۵۰ تا ۲۵۲، ۲۵۶، ۳۴۲۔
شمس العلما مولوی محمد موسیٰ، خان بہادر : ۱۰۱۔
شو راج بہادر : ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۶۷۔
شوکت : ۹۳۔
شہاب الدین العمری : ۳۱۷۔
شیخ بو علی قلندر پانی پتی : ۳۱۱۔
شیخ ثروت علی : ۲۸۶، ۲۸۷۔
شیخ خلیل احمد، خان بہادر : ۲۸۰۔
شیخ سردار علی : ۴۶، ۲۳۳ تا ۲۳۶، ۲۴۰، ۲۴۳، ۲۴۷، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۲ تا ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۲ تا ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۱۔
شیخ فضل حسین : ۲۷۵، ۲۷۷۔
شیخ محمد اکرام : ۶۷ تا ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۷۶، ۹۱۔
شیخ محمد امین : ۴۵۔

شیخ نظام الدین، سلطان الاولیا : ۳۱۱۔
شیر علی خاں لودھی : ۱۰۸۔
شیفتہ (رک : مصطفیٰ خاں شیفتہ)۔
شیکسپیئر : ۳۳، ۳۱۴۔
شیلنگ : ۳۳۶۔
شیو نرائن آرام، منشی : ۷۷، ۷۹۔

ص

صادق الخیری : ۲۴۳، ۲۴۴۔
صدیق انصاری : ۲۷۵۔

ض

ضمیر الدین احمد خاں (ضمیر مرزا) : ۲۴۰، ۲۴۱۔
ضیاء الدین خاں نیر رخشاں، نواب : (رک : نواب ضیاء الدین خاں)۔

ظ

ظفر حسن، خان بہادر : ۳۰۵۔
ظفر علی خاں (رک : مولانا ظفر علی خاں)۔
ظہوری : ۱۰۵۔

ع

عارف (رک : زین العابدین خاں عارف)۔
عارف جان : ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۷، ۴۸، ۴۵، ۶۱، ۲۳۸، ۳۴۳۔
عاشق علی فوٹوگرافر : ۲۶۵۔
عاقل خاں، نواب : ۸۸۔
عالمگیر (رک : اورنگ زیب عالمگیر)۔
عبدالجلیل خاں : ۲۸۱۔
عبدالرزاق شاکر : ۷۵۔
عبدالعلی (ریکارڈ کیپر) : ۲۹۴، ۲۹۶ تا ۲۹۸۔
عبداللہ خاں داستان گو : ۱۲۔
عبداللہ (ملازم) : ۴۷۔
عبداللہ نال والے : ۲۳۴۔
عبدالماجد : ۲۵۲۔
عبدالواحد : ۲۳، ۲۳۵، ۲۴۸، ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۹۰۔
عبرتی عظیم آبادی، میر وزیر علی : ۲۰۲۔
عرفی : ۹۵، ۹۶، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۵۔
عزیز النساء خانم : ۲۰۸۔
عظیم الدین : ۳۰۴۔
علاء الدین خاں : ۳۱۸، ۳۴۳۔
علاء الدین خلجی : ۳۱۱۔
علی نقی خان، بہادر : ۳۱۴۔
عمر الدین (پروفیسر) : ۲۷۵۔

غ

غازی الدین خاں : ۲۳۶۔

غالب:

— آزادہ روی: ۱۲۷ تا ۱۲۹، ۲۲۰۔
— استغنا: ۱۳۰ تا ۱۳۴۔
— آغازِ کلام: ۳، ۶۴، ۷۴ تا ۸۱، ۲۲۶۔
— انتخابِ کلام: ۳۶۳۔
— اولاد: ۲۵، ۳۵۔
— بدیعہ نگاری: ۱۱۵، ۱۱۶۔
— تبدیلِ تخلص: ۷۹، ۸۰، ۲۲۷۔
— تخیلی انداز: ۱۰۲ تا ۱۰۵، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۷۴۔
— تصورِ عشق: ۱۷۱، ۱۷۴ تا ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۵۔
— تقلیدِ بیدل: ۹۳ تا ۱۳۷۔
— توطّن: ۲۰، ۲۱، ۷۸، ۲۷۰۔
— جاگیر و پنشن کا مقدمہ: ۱۸۷، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۷، ۲۹۷۔
— چشم و نگاہ: ۱۵۲ تا ۱۵۶۔
— حسب نسب کا غرور: ۳، ۳۳۰۔
— حسن و عشق: ۱۳۸ تا ۱۸۵۔
— خانگی زندگی: ۱۸ تا ۳۲، ۳۴، ۳۹ تا ۴۴۔
— خود مرکزیت: ۱۷۷۔
— خیال بندی: ۱۰۴ تا ۱۰۹۔
— دلی کالج میں تقرری: ۲۱۹، ۲۲۷۔
— دورِ اوّل کا کلام: ۶۴ تا ۸۶۔
— ذوقِ نظارہ: ۱۶۶ تا ۱۶۹۔
— زرپرستی: ۳۲۰۔
— شادی: ۴، ۲۱، ۳۴، ۲۲۷، ۲۷۰۔
— شخصیت: ۱ تا ۱۷۔
— شراب نوشی: ۳۰، ۴۰، ۵۸۔
— ظرافت و شگفتگی: ۱۰، ۱۵، ۱۶، ۴۰۔
— عشق کے بدنی پہلو: ۱۵۹ تا ۱۶۲۔
— عقلیت: ۱۶، ۱۷، ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۰۔
— عہدِ شباب کا کلام: ۶۸۔
— غرابتِ کلام: ۶۵، ۶۶، ۱۱۲۔
— غزل خوانی: ۵۸۔
— فلسفیانہ میلان: ۱۲۴۔
— قدو گیسو: ۱۴۵ تا ۱۵۱۔
— قمار بازی و قید: ۱۰، ۲۲۷، ۲۶۵۔
— قیام گاہ: ۲۵۸۔
— مالی پریشانیاں: ۷، ۸، ۲۲۷۔
— مذہب: ۳۱۔
— مزار: ۲۳۹۔
— مشاہدہ: ۸۴، ۸۵۔
— معاشقہ: ۶، ۷، ۴۰، ۷۴، ۱۸۱، ۲۲۷۔
— معمولات: ۲۳، ۲۴۔
— مکتوب نگاری: ۱۱، ۱۲، ۲۸۰۔

—وفات : ۱۲، ۳۱، ۴۳، ۲۲۸۔
—ولادت : ۷۲، ۷۳، ۲۲۷، ۲۷۹۔
نیز دیکھیے صفحات : ۲۵۴ تا ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۷۶، ۲۸۵، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۰۵، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۷۶۔
غلام حسین خاں مسرور، نواب : ۲۷، ۴۸، ۶۲۔
غلام قادر روہیلا : ۶۴۔
غنی کاشمیری : ۹۹۔
غوث علی قلندر : ۲۳۵۔
غیاث الدین تغلق : ۳۱۸۔

ف

فتح اللہ بیگ خاں : ۵۵، ۵۶۔
فتح خاں : ۳۴۲۔
فخرالدین، مولانا (رک : مولانا فخرالدین شاہجہاں)۔
فخرو مرزا : ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۸۔
فراسو : ۳۲۵۔
فرائڈ : ۳۳۱۔
فردوسی : ۳۱۰، ۳۲۰۔
فرگسن : ۳۲۰، ۳۴۷۔
فریزر، ولیم : ۵۵، ۵۶، ۲۱۱، ۲۳۵، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۵ تا ۲۴۷، ۲۵۰ تا ۲۵۳، ۳۴۲، ۳۴۴، ۳۴۵۔
فتے : ۳۳۶۔
فوجدار محمد خاں : ۳۳۹۔
فوجی : ۱۰۱۔
فیروز شاہ : ۲۴۲۔
فیروز شاہ جمنی : ۳۱۱۔
فیض احمد : ۲۴۸۔
فیض اللہ بیگ خاں، نواب : ۲۷، ۴۷۔

ق

قاآنی : ۳۳۹۔
قاسم جان : ۲۰، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۴۸، ۴۹، ۶۲، ۲۳۸، ۳۴۳۔
قاضی علاء الدین : ۲۸۱۔
قاضی محمد خلیل : ۲۷۸، ۲۸۰۔
قطب الدین بختیار کاکی (رک : خواجہ قطب الدین بختیار کاکی)۔

ک

کانٹ : ۳۳۶۔
کپتان ڈگلس : ۲۵۱۔
کرامت علی : ۱۹۹۔
کرنیل سکنر، جون جیمز : ۲۴۶، ۳۴۲۔
کریم خاں، واروغہ : ۲۴۵۔
کلائیو : ۱۹۸۔

کلو داروغہ : ۲۳، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۴۳، ۵۷، ۵۹، ۲۱۳، ۲۲۲۔
کنور سین : ۳۶۴۔
کول بروک : ۲۱۱۔
کولرج : ۳۳۶۔

گ

گوئٹے : ۳۳۳۔
گیسو دراز، حضرت : ۳۱۱۔

ل

لارڈ آکلینڈ : ۳۲۴۔
لارڈ رابرٹس : ۳۵۶۔
لارڈ کرزن : ۳۴۷۔
لارڈ لیک : ۶۵، ۳۲۹۔
لارڈ ولیم بنٹنگ : (رک : ولیم بنٹنگ لارڈ) ۔

م

مالک رام : ۲۸۲، ۲۹۱۔
ماہ رخ بیگم : ۴۸۔
محفوظ الحق : ۳۰۰۔
محمد اکرم دہلوی : ۴۶، ۲۳۴ تا ۲۳۶، ۲۴۰، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۷۱۔
محمد بن عبدالرحیم : ۳۱۷۔
محمد تغلق : ۳۱۷، ۳۱۸۔
محمد حسین آزاد، مولانا : ۱۳۱، ۲۴۴، ۲۵۳، ۳۴۲۔
محمد شاہ رنگیلا (بادشاہ) : ۸۷، ۸۹، ۹۱۔
محمود غزنوی : ۳۱۰۔
مدار خاں (ملازم) : ۲۹، ۳۰، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۴۔
مدی (طوائف) : ۵۶۔
مرزا تفتہ : ۵۸۔
مرزا جواں بخت : ۳۴۸۔
مرزا حیدر حسن خاں : ۲۳۷۔
مرزا عبداللہ بیگ خاں : ۲۲۶۔
مرزا قتیل : ۲۰۰ ۲۹۸۔
مرزا قمرالدین : ۲۹۰۔
مرزا قوقان بیگ : ۲۲۶۔
مرزا محمد حسین خاں (رک : نواب خضر مرزا) ۔
مرزا محمد عسکری : ۲۸۳۔
مرزا میستا بیگ : ۲۸۶۔
مرزا نصراللہ بیگ خاں : ۵۲، ۲۲۶۔
مرزا نظیرالدین : ۲۹۰۔
مرزا نوشہ : ۶۵، ۲۶۱ (نیز دیکھیے غالب)۔
مرزا یوسف بیگ : ۲۳۷۔
مسز حسن علی : ۲۹۴۔

مسعود : ۲۳۴، ۲۶۲۔
مصحفی : ۳۴۲۔
مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب : ۵۸، ۲۰۵، ۲۱۵ تا ۲۲۰، ۲۲۲، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۳۔
معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم : ۲۴ تا ۲۸، ۳۱ تا ۳۳، ۳۹، ۴۱، ۴۳، ۴۸، ۲۶۸ تا ۲۷۰، ۳۰۵۔
معظم علی خاں، نواب : ۳۱۔
معین الدین (رک : حافظ معین الدین)۔
مفتی انوار الحق : ۶۷، ۶۹، ۳۰۴۔
مفتی صدر الدین آزردہ : ۲۰۵، ۲۱۲، ۲۱۶ تا ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۶۹، ۲۷۰۔
مکالے : ۱۹۶۔
ملا عبدالصمد : ۷۴، ۷۸، ۷۹۔
ملا واحدی : ۲۴۹، ۲۵۰۔
ملکہ امجد علی شاہ : ۳۱۵۔
ملکہ وکٹوریہ : ۸۔
ممتاز حسن : ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۵۵، ۲۶۳، ۲۹۵۔
منا جان لکھنوی : ۳۲۱۔
مہاراجہ الور : ۵۳۔
مہیش پرشاد : ۲۸۰، ۲۹۰، ۲۹۱۔
موتی لال نہرو : ۲۸۹۔
موسیٰ، حضرت : ۲۸، ۳۹۔
موسیٰ خاں، خان بہادر : ۳۰۲۔
مولانا روم : ۳۵۴۔
مولانا ظفر علی خاں : ۲۷۵، ۲۷۷۔
مولانا غلام رسول مہر : ۶۷، ۶۸، ۷۲، ۹۳، ۳۵۸۔
مولانا فخرالدین شاہجہاں : ۵۲، ۵۴، ۶۲، ۳۴۳۔
مولانا فضل حق : ۷۸، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۱۱ تا ۲۱۸، ۲۲۱۔
مولوی حبیب الرحمان شروانی : ۲۷۸۔
مولوی رجب علی (رک : ارسطو جاہ مولوی رجب علی)۔
مولوی سراج الدین احمد : ۱۹، ۲۸۶۔
مولوی ضیاء الدین احمد : ۲۷۶۔
مولوی عبدالباری آسی : ۶۷، ۶۹۔
مولوی عبدالحق : ۳۰۴ : ۳۱۱۔
مولوی عبدالرحمان : ۲۷۰ : ۲۷۲۔
مولوی عبدلرزاق کانپوری : ۳۱۵، ۳۱۶۔
مولوی فضل حق (پرنسپل مدرسہ عالیہ) : ۲۸۱۔
مولوی فضل حق خیرآبادی : ۲۸۱۔
مولوی محمد باقر : ۲۴۴، ۲۵۳، ۲۵۴، ۳۶۳۔

مومن خاں مومن : ۲۰۵ ، ۲۱۵ ، ۲۴۴ ، ۲۴۹ ، ۲۵۰۔
میاں بشیر احمد : ۲۸۴۔
میاں شاہ نواز : ۲۸۴۔
میر اعظم علی : ۷۸۔
میر تقی میر : ۷۴ ، ۷۶ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۲ تا ۹۴ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ، ۱۰۵ ، ۱۱۶ ، ۱۷۴ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ ، ۲۸۹۔
میر جعفر : ۱۹۷۔
میر حسن : ۱۴۰۔
میر درد : ۲۵۰۔
میر ذوالفقار علی : ۲۰۳۔
میر محمد حسین : ۲۷۱۔
میر مہدی مجروح : ۲۶۔
میر میکش : ۲۲۲۔

ن

نادر شاہ : ۳۶۔
ناصر علی ، شیخ : ۱۰۱ ، ۱۲۶۔
ناشز ایسٹرن کنگ اینڈ کوئین : ۳۱۴ ، ۳۲۴ ، ۳۴۹۔
نپولین : ۹۱۔
نذیر احمد ، مولوی : ۲۰۵۔
نصیرالدین سامانی ، امیر : ۹۶۔
نظام الملک : ۱۳۲۔
نظیری : ۹۸ ، ۱۰۰ ، ۱۰۵۔
نواب احمد بخش خاں : ۴ ، ۷ ، ۸ ، ۲۱ ، ۲۷ ، ۴۸ ، ۵۲ تا ۵۶ ، ۶۱ ، ۲۳۸ ، ۲۷۰ ، ۳۴۳۔
نواب اکبر علی طباطبائی : ۱۹۹۔
نواب خضر مرزا : ۲۶ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۵ تا ۶۲ ، ۲۳۱ ، ۲۳۴ تا ۲۴۱ ، ۲۶۳ تا ۲۶۵ ، ۲۶۸ ، ۲۷۱ ، ۲۷۷ ، ۳۰۶۔
نواب سراج الدولہ : ۱۹۸۔
نواب سراج الدین احمد خاں سائل : ۲۵۸ ، ۲۶۳ ، ۲۶۷۔
نواب شکراللہ : ۱۲۶۔
نواب شمس الدین خاں (رک : شمس الدین خاں ، نواب)۔
نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں : ۲۴ ، ۲۷ ، ۳۹ ، ۴۸ ، ۲۳۸ ، ۲۶۸ ، ۳۴۳۔
نواب فیض احمد خاں : ۲۷۱۔
نواب لطف اللہ خاں : ۱۳۱۔
نواب محسن الملک : ۲۷۵۔
نواب محمد حمید اللہ خاں : ۶۷۔
نواب مرزا امان علی خاں : ۲۰۰ ، ۲۰۲۔
نواب مصلح الدین : ۲۴۴ ، ۲۵۴۔
نوشابہ بیگم : ۵۶۔

نیاز علی (ملازم) : ۲۹ : ۳۰۔

و

وارن ہیسٹنگز : ۲۰۰۔
ورڈزورتھ : ۳۷۸۔
ولی الدین خدا بخش : ۲۹۲۔
ولی دکنی : ۸۹ تا ۹۱۔
ولیم بنٹنگ، لارڈ : ۲۱۲، ۲۱۸، ۳۴۷۔
ولیم فریزر (رک : فریزر، ولیم)۔
ونائک ساورکر : ۳۵۸۔
ونسنٹ سمتھ : ۳۴۲۔
ونفرڈ : ۲۴۷۔

ہاجرہ مسرور : ۳۱۰، ۳۷۸۔
ہاڈسن : ۲۵۹، ۳۵۰، ۳۵۳۔
ہاکنز : ۲۱۱۔
ہربرٹ ریڈ : ۳۳۶۔
ہرمزد (رک : ملا عبدالصمد)۔
ہرگوپال تفتہ، مرزا : ۱۲۱، ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۷۳۔
ہندو راؤ : ۳۴۲۔
ہیرن : ۳۴۲۔
ہیوز : ۲۹۷۔

ی

یوسف بیگ خاں، مرزا : ۳۱، ۲۰۹، ۲۲۳۔
یوسف علی خاں، نواب : ۲۲۸۔

مقامات

آ

آگرہ : ۲ تا ۵، ۷، ۲۰، ۳۴، ۷۴، ۷۷، ۷۸، ۱۰۶، ۲۰۰، ۲۱۹، ۲۲۹، ۲۵۵، ۲۵۹، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۴۵۔

آگرہ کالج : ۳۰۵۔

آنند بھون (الہ آباد) : ۲۸۹۔

الف

اٹک : ۲۸۔

اجمیری دروازہ (دہلی) : ۴۶، ۲۳۶، ۲۶۳، ۲۶۵۔

احاطہ خان ماں (لکھنؤ) : ۲۸۶۔

ادارۂ معارف اسلامیہ (دہلی) : ۲۷۲۔

ارون ہسپتال (دہلی) : ۲۵۰، ۲۵۹۔

اسلامیہ کالج : ۴۵۔

اسلامیہ کالج لاہور : ۳۷۶۔

اشوک کی لاٹ : ۳۴۷۔

اکبر آباد : ۸۰۔

الہ آباد : ۱۸۷، ۲۳۰، ۲۸۱، ۲۸۴، ۲۸۵ تا ۲۹۰، ۳۷۵۔

امام باڑہ ہگلی : ۱۹۹۔

امپرس ہوٹل (دہلی) : ۲۳۱، ۲۴۴۔

امپیریل لائبریری (کلکتہ) : ۱۹۲، ۲۹۴، ۲۹۷، ۳۰۰، ۳۰۱۔

انارکلی کا مقبرہ : ۳۴۷۔

انگلستان : ۲۴۶، ۳۱۴، ۳۲۴۔

انیسہ ہوٹل (کلکتہ) : ۲۹۶۔

اودھ : ۱۳۴، ۲۲۲۔

اولیا مسجد (دہلی) : ۲۶۴۔

ایران : ۷۸۔

ایشیاٹک ریسٹوران (کلکتہ) : ۲۹۵۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ : ۳۰۰، ۳۰۲۔

اینگلو عربک کالج (دہلی) : ۲۳۶۔

ب

بارہ محل (بھوپال) : ۳۰۳۔

بازار سیتارام (دہلی) : ۲۷۱۔

باغ سر، آزاد کشمیر : ۳۳۵۔

بالی گنج (کلکتہ) : ۲۹۸۔

بانکی پور : ۲۸۴۔

بتھیون فیمیل سکول (کلکتہ) : ۲۰۰۔
بخارا : ۱۸۔
برٹش کونسل، لاہور : ۳۳۶۔
برٹش میوزیم لندن : ۳۶۶۔
برلن کی مسجد : ۲۹۹۔
بریلی : ۲۳۰، ۲۷۸ تا ۲۸۰۔
بڑا بازار (کلکتہ) : ۱۹۵۔
بڑا دواخانہ (دہلی) : ۲۵۸، ۲۶۷۔
بڑودہ : ۳۶۰۔
بلیماراں، محلہ (دہلی) : ۱۸، ۲۴۰، ۲۵۸، ۲۶۳۔
بمبئی : ۳۶۰۔
بنارس : ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۷، ۲۳۰، ۲۸۴، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۲، ۳۷۵۔
بنگال : ۱۹۸، ۳۱۱۔
بنگال بنک (کلکتہ) : ۱۹۳۔
بہار لائبریری : ۲۰۲۔
بو بازار سٹریٹ (کلکتہ) : ۱۹۵۔
بھوپال : ۳۱، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۷، ۲۳۰، ۳۰۳ تا ۳۰۵، ۳۳۹، ۳۷۵۔
بیسکم پور : ۲۷۸۔
بیٹھک خانہ روڈ سیالدہ : ۲۰۱، ۲۹۸۔
بیرم خاں کا ترابا (دہلی) : ۲۶۴۔

پ

پبلک لائبریری (لکھنؤ) : ۲۸۴۔
پٹنہ : ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۹۱ تا ۲۹۴، ۲۹۹، ۳۷۵۔
پٹنہ میڈیکل کالج : ۲۹۹۔
پرانا قلعہ (دہلی) : ۲۶۴، ۲۶۵۔
پرانی دلی : ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۶۸۔
پرنس ہوٹل (لکھنؤ) : ۲۸۳۔
پریاگ : ۲۸۸، ۲۹۰۔
پریذیڈنسی کالج (کلکتہ) : ۳۰۰۔
پلاسی : ۱۹۸۔
پنجاب : ۱۸، ۲۸۹۔
پنجاب یونیورسٹی لائبریری : ۳۶۶، ۳۷۱۔
پنجہ شریف : ۳۶۳۔
پورٹ کمشنر کا عرشہ (کلکتہ) : ۱۸۹۔
پہلگام : ۲۷۹۔
پیر غیب (دہلی) : ۲۴۶۔

ت

تاج محل (آگرہ) : ۱۹۴، ۲۱۸، ۳۰۵۔
تالاب کرگدن (کلکتہ) : ۱۹۹۔
ترقی اردو بورڈ (لاہور) : ۳۱۱۔
ترکی : ۳۵۴۔
تغلق آباد : ۳۱۸۔

تکیہ شیر علی شاہ (لکھنؤ) : ۲۸۶۔

ٹ

ٹاؤن ہال (کلکتہ) : ۱۹۴۔

ج

جامع مسجد (دہلی) : ۲۱، ۲۱۸، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۴۷، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۷۱، ۲۸۸، ۳۲۸، ۳۴۷۔

جامعہ ملیہ : ۲۶۸۔

جگراؤں : ۲۵۳۔

جمال پور : ۲۷۵۔

جمنا (دریا) : ۹۔

جموں : ۲۷۹۔

جنرل پوسٹ آفس (کلکتہ) : ۱۹۱۔

جوہری بازار (دہلی) : ۳۲۵۔

جے پور : ۳۵۹۔

جیرس لین کیمبرج : ۳۶۳۔

چ

چاندنی چوک (دہلی) : ۱۸، ۲۳۳، ۳۲۵۔

چاندنی چوک سٹریٹ (کلکتہ) : ۱۹۵۔

چت پور روڈ (کلکتہ) : ۱۹۵، ۱۹۹۔

چندر نگر : ۱۹۸۔

چور نگھی (کلکتہ) : ۱۹۵، ۱۹۸۔

چھرہ : ۲۷۸۔

چھوٹا بازار (دہلی) : ۲۵۳۔

چیت بازار (کلکتہ) : ۱۹۹۔

چین : ۳۱۷۔

چینی بازار (کلکتہ) : ۳۰۰۔

ح

حبیب گنج (مکان) : ۲۷۸، ۲۷۹۔

حسن آباد : ۳۱۱۔

حکیم محمد شریف کی مسجد (دہلی) : ۱۸، ۲۳، ۲۵۹۔

حوض قاضی (دہلی) : ۲۴۱، ۲۷۱۔

حویلی مرزا علی سوداگر (کلکتہ) : ۱۹۹، ۲۰۰۔

حیدر آباد دکن : ۲۰۹، ۲۴۳، ۲۷۸، ۲۸۲، ۲۸۴، ۲۹۳، ۳۰۰، ۳۰۲ تا ۳۰۴، ۳۴۴، ۳۷۶۔

خ

خدا بخش لائبریری (پٹنہ) : ۲۹۲۔

د

دال منڈی (بنارس) : ۲۹۰۔

درگاہ حضرت نظام الدین (دہلی) : ۲۱، ۵۳، ۵۵۔

درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (دہلی) : ۳۴۳۔
درگاہ روڈ (کلکتہ) : ۳۰۰۔
دریا گنج (دہلی) : ۲۳۵، ۲۴۳، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۶۴۔
دریائے ہگلی (کلکتہ) : ۱۸۹، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵۔
دکن : ۱۸۷، ۳۱۱۔
دولت آباد : ۳۱۸۔
دھرم تلہ سٹریٹ (کلکتہ) : ۱۹۵۔
دہلی : ۳ تا ۵، ۸، ۱۰، ۲۰، ۳۱، ۳۴، ۳۷، ۴۲، ۴۵ تا ۴۷، ۵۶، ۶۴، ۶۵، ۷۴، ۷۸ تا ۸۰، ۸۷ تا ۹۰، ۱۰۳، ۱۸۶، ۱۸۸، ۱۹۲، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۱۱، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۳ تا ۲۵۶، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۳ تا ۲۷۷، ۲۹۰، ۳۰۵ تا ۳۰۷، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۱، ۳۲۵، ۳۲۹، ۳۴۴ تا ۳۴۷، ۳۷۵۔
دہلی بنک (دہلی) : ۳۴۲۔
دہلی دروازہ : ۲۶۴، ۲۶۵، ۳۴۲۔
دہلی فورٹ میوزیم : (رک : عجائب گھر دہلی) ۔
دہلی کالج : ۲۱۸، ۲۱۹۔

ڈ

ڈلہاؤزی سکوئر (کلکتہ) : ۱۹۱۔

ر

راجپوتانہ : ۳۴۴، ۳۴۵۔
رام پور : ۴۳، ۴۴، ۲۳۰، ۲۶۱، ۲۷۱ تا ۲۷۳، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۹۰۔
رام پور سٹیٹ ہوٹل : ۲۸۱۔
رام گنگا : ۲۸۰۔
رائے سینا ہوٹل (دہلی) : ۲۵۷، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۴، ۳۰۵۔
رائیٹرز بلڈنگز (کلکتہ) : ۲۹۵، ۲۹۶۔
رج روڈ (دہلی) : ۲۴۵، ۲۷۱، ۳۴۰۔
رشیا (روس) : ۳۵۴۔
رکاب گنج (لکھنؤ) : ۲۸۶۔

ز

ذکریا سٹریٹ (کلکتہ) : ۲۹۶، ۳۰۰۔
زینت المساجد (دہلی) : ۲۳۴، ۲۴۱، ۲۵۲۔

س

سٹریچی ہال (علی گڑھ) : ۲۷۵۔
سٹوڈنٹ یونین ہال (علی گڑھ) : ۲۷۵۔

سراج بلڈنگ (کلکتہ) : ۲۹۶۔
سرس کی گلی (دہلی) : ۳۱، ۲۲۳۔
سرکلر روڈ (کلکتہ) : ۱۹۵۔
سری رام کا کتب خانہ (بنارس) : ۲۹۰۔
سکندر آباد : ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۶۱، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۷۔
سکنر ہاؤس (دہلی) : ۲۷۲۔
سمرقند : ۲۲۶۔
سنٹرل ہندو ہوٹل (کلکتہ) : ۲۹۲، ۲۹۴۔
سیالدہ (کلکتہ) : ۲۰۱، ۲۹۸۔
سیکرٹریٹ آفس (کلکتہ) : ۱۹۳۔
سینٹ سٹیفن سکول (دہلی) : ۴۶، ۲۳۳۔
سینٹ سٹیفن کالج (دہلی) : ۳۴۰۔

ش

شاہجہاں آباد : ۲۰۳۔
شاہجہاں محل ہوٹل (کلکتہ) : ۲۹۵۔
شمسی تالاب (دہلی) : ۴۶، ۲۶۴۔
شمسی دواخانہ (دہلی) : ۱۸۔
شملہ بازار (کلکتہ) : ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۹۵۔
شیش محل (بھوپال) : ۳۰۲، ۳۰۴۔

ص

صفدر جنگ کا مقبرہ (دہلی) : ۲۶۵۔
صولت پبلک لائبریری (رام پور) : ۲۸۱۔

ع

عثمانیہ ہوسٹل (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) : ۲۷۵۔
عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن) : ۶۷۔
عجائب گھر (دہلی) : ۲۴۹، ۳۱۹، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۴۔
عظیم آباد : ۲۰۰۔
علی گڑھ : ۲۳۰، ۲۶۱، ۲۷۲ تا ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۷، ۲۹۰۔
عیدگاہ (دہلی) : ۲۵۰۔

ف

فتح پوری (دہلی) : ۵۳، ۵۹، ۶۰، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۴۴، ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۷۱۔
فرنگی محل (لکھنؤ) : ۲۸۶۔
فلورنس : ۳۳۵۔
فورٹ ولیم (کلکتہ) : ۱۹۴، ۳۰۲۔
فیروز پور جھرکہ : ۲۰، ۵۳، ۲۰۶، ۲۳۵، ۲۶۱، ۳۴۲۔
فیروز شاہ کا کوٹلہ (دہلی) : ۲۶۵۔

ق

قدم شریف (دہلی) : ۲۵۰، ۲۵۲، ۳۲۱، ۳۴۲۔

قطب صاحب (دہلی) : ۴۶، ۵۹، ۲۳۶، ۲۶۴، ۲۶۵۔
قلعۂ معلیٰ (رک : لال قلعہ، دہلی)۔
قومی کتب خانہ (علی گڑھ) : ۲۷۷۔
قیصر باغ (لکھنؤ) : ۲۸۳، ۳۱۵، ۳۱۶۔

ک

کابل : ۳۴۴۔
کارنوالس سٹریٹ (کلکتہ) : ۲۰۰۔
کاسی پور : ۱۹۴۔
کالنگا : ۲۰۲۔
کانپور : ۲۸۵، ۲۲۸۔
کچی بارک (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) : ۲۷۵۔
کراچی : ۳۱۱۔
کرم آباد : ۲۴۳، ۲۶۲، ۲۷۳، ۲۸۱، ۳۰۷، ۳۱۴۔
کشمیری دروازہ (دہلی) : ۲۴۶، ۲۵۳، ۳۴۰، ۳۴۲۔
کشن گڑھ : ۲۳۵۔
کلاں محل (دہلی) : ۲۳۴۔
کلائیو سٹریٹ (کلکتہ) : ۱۹۵، ۱۹۷۔
کلکتہ : ۸، ۱۳۴، ۱۴۱، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۸۶ تا ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۸، ۲۹۲ تا ۳۰۲، ۳۱۴، ۳۷۵۔
کوچہ چیلاں (دہلی) : ۲۴۴، ۲۷۱۔
کوئینز روڈ (دہلی) : ۲۵۷، ۲۶۲، ۲۶۷، ۲۷۰، ۳۰۵۔
کھڑکی ابراہیم علی (دہلی) ۲۵۳۔
کھنڈ سار (رام پور) : ۲۸۱۔
کیمبرج : ۳۰۹۔
کیمبرج یونیورسٹی لائبریری : ۳۶۳۔

گ

گرینڈ سٹینڈ، ریس کورس (کلکتہ) : ۱۹۷۔
گرینڈ ہوٹل (کلکتہ) : ۳۰۱۔
گلی چوڑی والاں (دہلی) : ۲۷۱۔
گلی قاسم جان (دہلی) : ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۴، ۲۴۰، ۲۵۸۔
گنگا (دریا) : ۲۸۰، ۲۸۸، ۲۹۰۔
گورمنٹ کالج (دہلی) : ۳۴۰۔
گورمنٹ ہاؤس (کلکتہ) : ۱۹۴۔
گومتی (دریا) : ۲۸۳۔
گینڈے کا تالاب (کلکتہ) : ۲۹۹۔

ل

لال قلعہ (دہلی) : ۱۹۴، ۲۱۳، ۲۱۸، ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۴ تا ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۶۷، ۲۷۲، ۳۲۸۔
لال کنواں (دہلی) ۲۵۸۔
لاہور : ۴۶، ۴۷، ۲۳۱ تا ۲۳۴، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۸۲، ۲۸۷، ۳۰۷ تا ۳۱۱، ۳۲۵، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۳۷، ۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۴ تا ۳۵۰، ۳۵۳۔
لاہوری دروازہ (دہلی) : ۲۵۵۔
لدھیانہ : ۲۵۳۔
لکھنؤ : ۵۰، ۱۳۳، ۲۰۹، ۲۳۰، ۲۷۲ تا ۲۷۴، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۰ تا ۲۸۸، ۲۹۰، ۳۱۵، ۳۷۵۔
لندن : ۳۰۹۔
لوہارو : ۲۰، ۲۱، ۲۴، ۵۲، ۵۳، ۵۵، ۵۹، ۶۲، ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۶۱، ۳۴۳۔
لیڈن : ۳۳۵۔

م

مٹیا محل (دہلی) : ۲۳۶، ۲۶۸۔
مجلس ترقی ادب (لاہور) : ۳۵۶۔
مدرسۂ عالیہ (رام پور) : ۲۸۱۔
مدرسہ کلکتہ : ۲۰۰ تا ۲۰۲، ۳۰۲۔
مرشد آباد : ۱۹۴، ۱۹۸۔
مسجد تہور خاں (دہلی) : ۳۱۔
مسجد حکیم شریف (رک : حکیم شریف کی مسجد)۔
مسجد زکریا (مسجد ناخدا، کلکتہ) : ۲۹۶۔
مسجد شاہ چراغ (لاہور) : ۳۴۷۔
مسجد فتح پوری (دہلی) : ۲۴۷۔
مسجد قوت الاسلام (دہلی) : ۲۶۴، ۲۶۵۔
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ : ۲۷۵، ۲۷۶۔
مشن کالج (دہلی) : ۲۶۸، ۲۷۰۔
مشن گرجا (کلکتہ) : ۱۹۴۔
مقبرہ علاء الدین : ۳۴۷۔
مکتبہ جامعہ (دہلی) : ۳۵۶۔
منٹو سرکل (علی گڑھ) : ۲۷۵۔
موتی مسجد (دہلی) : ۳۴۷۔
موری دروازہ (دہلی) : ۲۴۶، ۲۷۲۔
موہنجوداڑو : ۳۹۸۔
مہولی (دہلی) : ۴۶، ۵۰، ۶، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۸، ۲۴، ۲۴۳، ۲۴۸، ۲۷۱، ۳۰۶۔
مدرسہ کلکتہ : ۲۹۸۔
میرٹھ : ۲۵۱۔
میگزین (دہلی) : ۳۴۰۔

مینا بازار (مہرولی، دہلی) : ۴۶۔

ن

ناگپور : ۳۰۲، ۳۰۴۔
نخاس بازار (لکھنؤ) : ۲۸۸۔
نظام الدین اولیا (دہلی) : ۲۱، ۵۳، ۵۵۔
نول کشور، پریس : ۲۵۷، ۲۸۴۔
نہر مردان علی : ۳۰۸، ۳۲۹۔
نیپلز : ۳۵۴۔

و

وزیر آباد : ۲۳۶۔
ولٹرلی سکوئر (کلکتہ) : ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۹۸۔
وی آنا : ۳۳۱۔
وینس : ۳۳۵۔

ہ

ہارڈنگ لائبریری (کلکتہ) : ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۹، ۲۶۷، ۲۷۲، ۳۲۱۔
ہارلم : ۳۳۵۔
ہندوستان : ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۶، ۲۰۵، ۲۶۴، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۳۱، ۳۷۵۔
ہندوستانی دواخانہ (دہلی) : ۲۴۰، ۲۵۸، ۲۸۷۔
ہندو یونیورسٹی (بنارس) : ۲۹۰۔
ہوگلی / ہگلی (کلکتہ) : ۱۹۸، ۲۹۶۔

ی

یورپ : ۱۹۴، ۲۸۷۔

کتب، رسائل، اخبارات، مضامین

آج کل : ۳۱۵۔

اردو ریڈر : ۲۸۸۔

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ : ۳۱۱۔

اردوئے معلّیٰ : ۱۱۔

اسبابِ بغاوتِ ہند : ۳۵۸۔

اسوۂ حسنہ : ۲۴۹۔

اقبال کے ہاں ایک شام : ۲۷۶۔

الناظر : ۲۸۶، ۲۸۷۔

انشائے بے خزاں : ۲۸۸۔

انشائے مومن : ۳۲۱۔

بادِ مخالف : ۲۰۱، ۲۸۹۔

بحثِ فاٹیغوریاس : ۲۱۴۔

بنگال، پاسٹ اینڈ پریزنٹ : ۲۰۱۔

پنج آہنگ : ۲۴۹، ۲۵۹۔

پنجاب گورمنٹ ریکارڈ : ۳۴۸۔

تاج محل فارسیل : ۳۴۷۔

تاریخِ بغاوتِ ہند : ۳۵۶۔

تحفۃ الالباب : ۳۱۷۔

تذکرۂ غوثیہ : ۲۳۵۔

چراغِ دیر : ۱۴۱۔

چہل و یک سالہ : ۳۵۶۔

خزینۃ الاصفیا : ۵۲۔

داستانِ امیر حمزہ : ۱۲۔

داستانِ غدر : ۳۵۸۔

دستنبو : ۲۵۵، ۳۵۸۔

دہلی (کتاب) : ۳۴۲، ۳۴۷۔

دہلی اردو اخبار : ۳۶۳۔

دہلی ریزیڈنسی ریکارڈ : ۳۴۸۔

دہلی، پاسٹ اینڈ پریزنٹ : ۳۴۲۔

دی اپروچ ٹو پینٹنگ : ۳۳۵۔

دی کلچر آف انڈیا : ۳۲۹۔

دی ٹیل آف دی گریٹ میوٹنی : ۳۴۰۔

دی سیون سٹیز آف دہلی : ۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۷۔

دیوانِ غالب (قلمی) : ۲۷۲، ۲۷۷، ۳۳۹، ۳۷۱۔

دیوانِ غالب (مطبوعہ ۱۸۴۲) : ۲۸۴، ۲۸۹۔

دیوانِ غالب (نسخہ شیرانی) : ۳۰۹، ۳۶۶، ۳۷۱۔

دیوانِ غالب (نسخۂ لاہور) : ۳۰۹، ۳۷۱، ۳۷۳۔
دیوانِ معروف : ۵۲۔
ذکرِ غالب : ۲۸۲۔
ذکرِ میر : ۳۱۵۔
ریاض الافکار : ۲۰۲۔
سفرِ کلکتہ : ۲۸۸۔
سیکس اینڈ کیریکٹر : ۳۳۳۔
شاہ نامہ : ۳۱۰۔
شرحِ کلامِ غالب : ۶۷۔
شعرا العجم : ۳۱۰، ۳۲۰۔
شہر آشوب : ۳۵۶۔
صداقت : ۲۹۶۔
عقدِ ثریا : ۳۴۲۔
عودِ ہندی : ۱۱۔
غالب، از مہر : ۹۳۔
غالب اور بیدل (مضمون) : ۲۷۶۔
غالب نامہ : ۶۷، ۶۸، ۷۰، ۷۲، ۷۷، ۲۴۳۔
غدر (روزنامہ) : ۲۴۸۔
غدر کے دو رونامچے : ۳۵۸۔
فسانۂ آزاد : ۲۸۳۔
فیر اینڈ فیر : ۳۳۶۔
قدیم دہلی : ۲۵۴۔
قصۂ عشق افزا : ۳۲۵۔
قیصر التواریخ : ۳۵۶۔
کلیاتِ غالب (فارسی) : ۳۷، ۳۸، ۷۶، ۲۵۷۔
کلیاتِ نثر فارسی (غالب) : ۷۸۔
گلشنِ بے خار : ۳۰۹، ۳۶۳ تا ۳۶۵۔
گلشنِ عشق : ۵۱۔
لائف آف این ایسٹرن کنگ : ۳۴۸۔
مرأۃ الخیال : ۸۸، ۱۱۰، ۱۲۶۔
مرقعِ غالب : ۲۳۰۔
مسالک الابصار فی ممالک الامصار : ۳۱۷۔
مکاتیبِ غالب (رام پور) : ۱۳۱، ۱۳۴۔
نسخۂ حمیدیہ (دیوان غالب) : ۳۷، ۶۷، ۶۸، ۷۲، ۷۴، ۷۸ تا ۸۱، ۱۱۳، ۱۴۵، ۱۶۰، ۱۶۴، ۱۶۵، ۳۶۳۔
نسخۂ نظامی (دیوانِ غالب) : ۶۷۔
نکات الشعرا : ۱۰۲۔
نگارستانِ فارس : ۱۳۱، ۳۴۲۔
ورڈ اینڈ ایڈیم : ۳۳۴۔
ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرٹ چیشکچر : ۳۲۰، ۳۴۷۔
ہمایوں (رسالہ) : ۲۸۲، ۲۹۱، ۳۳۸۔
یادِ ایام : ۳۱۵۔
یادگارِ غالب : ۲۸، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۲۰۰۔



پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۳-۱۹۷۴) پاکستانی ادب و تنقید اور تعلیم کی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ تمام عمر لاہور میں رہے' (ولادت اور وفات بھی لاہور میں ہوئی) لیکن مختصر عرصوں کے لیے حیدر آباد' دکن (تحریکِ عدم تعاون اور بی۔اے۔عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۲۵)' دہلی (لیکچرار' دہلی پولی ٹیکنیک ۱۹۳۵-۱۹۳۷) اور کیمبرج (ایم۔لٹ۔ ۱۹۵۴) میں بھی رہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے۔انگریزی کرنے کے بعد انھوں نے عمر کا بیشتر حصہ اسلامیہ کالج لاہور میں بطور ایک مقبول اور نامور استاد کے گزارا۔ بعد میں وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل (۱۹۵۸-۱۹۶۳)' پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر (۱۹۶۳-۱۹۶۹) اور مجلسِ ترقیِ ادب کے ناظم (۱۹۷۰-۱۹۷۴) بھی رہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے مرکزی اردو بورڈ اور پنجاب یونیورسٹی میں ادارۂ تالیف و ترجمہ' تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند اور مجلسِ یادگارِ غالب (غالب صدی) کے قیام میں بنیادی کام کیا۔ وہ افریقہ ایشیا اسلامک کانفرنس بنڈونگ/جکارتہ ۱۹۶۴/۱۹۶۵ میں پاکستانی وفد کے قائد تھے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کی خدمت میں ستارۂ امتیاز (۱۹۶۲) اور ستارۂ پاکستان (۱۹۶۷) پیش کیے گئے۔

پروفیسر حمید احمد خاں برِعظیم پاک و ہند کے ایک سربرآوردہ علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد سراج الدین احمد خاں اپنے دور کے معروف ادیب و شاعر اور روزنامہ "زمیندار" کے بانی تھے۔ اس خاندان کے سب سے نامور فرزند' مولانا ظفر علی خاں آپ کے بڑے بھائی تھے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کی کتابوں میں "اسوۂ حسنہ" ' "دیوانِ غالب' نسخۂ حمیدیہ" ' "ارمغانِ حالی" ' "اقبال کی شخصیت و شاعری" ' "تعلیم و تہذیب" اور "Quaid-e-Azam: Early Life Story" شامل ہیں۔ (ان میں آخری تین ان کے انتقال کے بعد چھپیں۔) اب "مرقعِ غالب" کے بعد ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ' متفرق مضامین (ادب' ادیب اور معاشرہ)' خطوط اور متفرق انگریزی تحریریں اشاعت کی منتظر ہیں۔

"... میں نے خاں صاحب کے ہاں یہ عجیب بات دیکھی کہ اپنے موضوع کے سلسلے میں تو وہ زیادہ سے زیادہ معلومات اور حقائق جمع کرنے کے عمل کو ایک ادبی مشن قرار دیتے تھے (غالب پر انھوں نے جو اعلیٰ پائے کا کام کیا ہے وہ اس طریقِ کار کا زندہ ثبوت ہے) مگر ان معلومات اور حقائق اور ان کے بارے میں اپنے مخصوص ... زاویۂ نگاہ کا اظہار کرنے کے دوران میں مترادف الفاظ' آرائشی تراکیب اور فاضل جملوں کو اپنی تحریر سے خارج بھی کرتے تھے۔ کفایتِ لفظی کے اس منفرد رجحان نے ان کے اسلوب میں ایک عجیب سی چاشنی پیدا کر دی تھی..."

---- ڈاکٹر وزیر آغا

"... 'غالب کی شاعری میں حُسن و عشق'... ڈاکٹر بجنوری کے مقالے کے بعد کلامِ غالب پر یہ دوسرا تنقیدی مقالہ تھا جس نے غالب کی طرف پھر ایک بار لوگوں کو متوجہ کیا... مقالے میں اپنی بات کو سمجھانے کے لیے تحلیل و تجزیہ' توجیہہ و تاویل اور استدلال و اظہار کا ایسا خوبصورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور اپنے خیال کی عکس ریزی کے لیے جگہ جگہ اشعار و امثال کے ایسے مرقعے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری کو پروفیسر حمید احمد خاں کی رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے۔ مقالے کا یہی وہ رُخ ہے جس نے اردو ادب کے قارئین کو چونکایا ہے اور پروفیسر حمید احمد خاں کی رائے کو غالب شناسی کے سلسلے میں ہمیشہ کے لیے مشعلِ راہ جانا ہے..."

---- ڈاکٹر فرمان فتحپوری

"... غالب اور اقبال سبھی 'شو قینوں' کے محبوب موضوعات ہیں۔ مگر پروفیسر صاحب کی غالب شناسی اور اقبال پرستی بجائے خود ایک تاج محل کی طرح چمکتی تھی..."

---- جمیل الدین عالی



پروفیسر حمید احمد خاں (۱۹۰۳-۱۹۷۴) پاکستانی ادب و تنقید اور تعلیم کی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ تمام عمر لاہور میں رہے' (ولادت اور وفات بھی لاہور میں ہوئی) لیکن مختصر عرصوں کے لیے حیدر آباد' دکن (تحریکِ عدم تعاون اور بی۔اے۔عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۲۵)' دہلی (لیکچرار' دہلی پولی ٹیکنیک ۱۹۴۵-۱۹۴۷) اور کیمبرج (ایم۔لٹ۔ ۱۹۵۴) میں بھی رہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے۔انگریزی کرنے کے بعد انھوں نے عمر کا بیشتر حصہ اسلامیہ کالج لاہور میں بطور ایک مقبول اور نامور استاد کے گزارا۔ بعد میں وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل (۱۹۵۸-۱۹۶۳)' پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر (۱۹۶۳-۱۹۶۹) اور مجلسِ ترقیِ ادب کے ناظم (۱۹۷۰-۱۹۷۴) بھی رہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے مرکزی اردو بورڈ اور پنجاب یونیورسٹی میں ادارۂ تالیف و ترجمہ' تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند اور مجلسِ یادگارِ غالب (غالب صدی) کے قیام میں بنیادی کام کیا۔ وہ افریقہ ایشیا اسلامک کانفرنس بنڈونگ/جکارتہ ۱۹۶۴/۱۹۶۵ میں پاکستانی وفد کے قائد تھے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کی خدمت میں ستارۂ امتیاز (۱۹۶۲) اور ستارۂ پاکستان (۱۹۶۷) پیش کیے گئے۔

پروفیسر حمید احمد خاں برِعظیم پاک و ہند کے ایک سربرآوردہ علمی و ادبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد سراج الدین احمد خاں اپنے دور کے معروف ادیب و شاعر اور روزنامہ "زمیندار" کے بانی تھے۔ اس خاندان کے سب سے نامور فرزند' مولانا ظفر علی خاں آپ کے بڑے بھائی تھے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کی کتابوں میں "اسوۂ حسنہ" ' "دیوانِ غالب' نسخۂ حمیدیہ" ' "ارمغانِ حالی" ' "اقبال کی شخصیت و شاعری" ' "تعلیم و تہذیب" اور "Quaid-e-Azam: Early Life Story" شامل ہیں۔ (ان میں آخری تین ان کے انتقال کے بعد چھپیں۔) اب "مرقعِ غالب" کے بعد ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ' متفرق مضامین (ادب' ادیب اور معاشرہ)' خطوط اور متفرق انگریزی تحریریں اشاعت کی منتظر ہیں۔